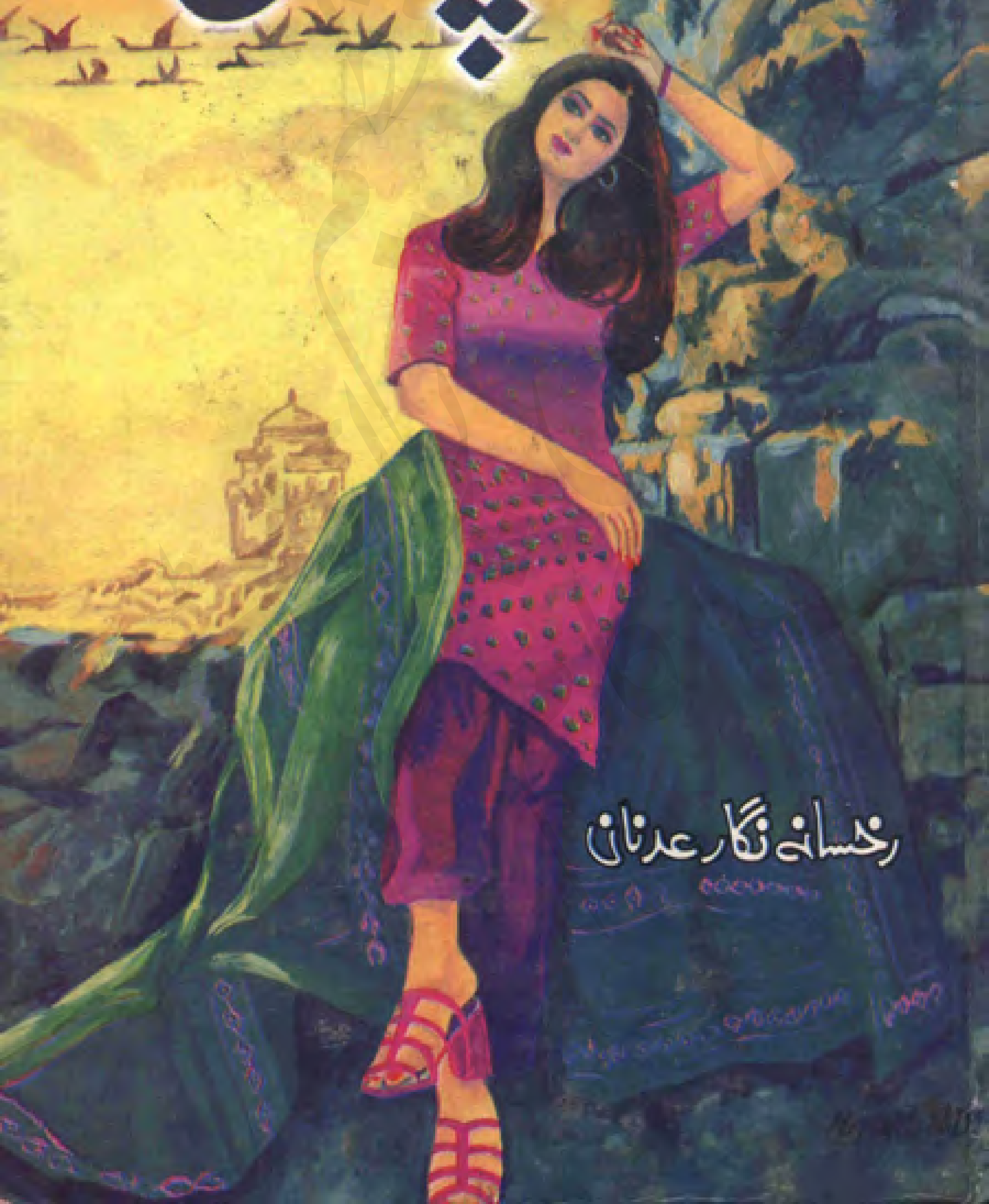
پارس



وہ ہیروس روڈ کورش سے مبرا جان کر پوری رفتار سے مڑی تھی جلد پہنچنے کا بھوت ایسا سر پر سوار تھا کہ دھیان ہارن کی طرف بھی نہیں گیا اور......

اس کا پاؤں، بریک پر پوری قوت سے پڑا تھا کہ ٹائروں کی تیز چرچراہٹ دور تک سنی گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا شاید اس سے بھی زیادہ مگن حالت میں جا رہا تھا جو اچانک اس آواز پر اچھل تو گیا مگر دوبارہ ادھر ہی آرکا جہاں سے اسے ہٹانے کے لیے اس نے اتنے زور سے بریک لگائی تھی۔

نتیجتاً وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹکراتا ہوا نیچے تو نہیں گرا تھا، شاید ہوش و حواس قائم تھے جو چھپکلی کی طرح اس کے ساتھ ہی چپک گیا۔ اس نے چند سیکنڈز کے لیے انتظار کیا کہ وہ نیچے لڑھکے تو وہ گاڑی بیک کر کے وہاں سے بھگا لے جائے۔

اس وقت وہ کوئی بھی لمبا چوڑا یا چھوٹا موٹا جھگڑا مول نہیں لے سکتی تھی۔ پہلے ہی گولڈی کو دیے گئے وقت سے وہ پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکی تھی۔

اگر تو وہ ہوش میں تھا تو بونٹ سے چپکے رہنے کے بجائے اس کو دو چار کھری کھری سنانے کو ترجیح دیتا اور اگر بیہوش ہو چکا ہوتا تو نیچے گر گیا ہوتا ہارن کی آواز پر بھی اس کے پینتالیس درجے کے زاویے پر جھکے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو مجبوراً اسے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا۔

اس کی قسمت اچھی تھی یا مضروب کی بری جو ارد گرد تو کیا کوئی ذی روح بھی موجود نہیں تھا۔ ہاں مین روڈ پر گاڑیاں اور دوسرا ٹریفک اسی روانی سے بہہ رہا تھا۔ ہر روز شام کو اس وقت بہا کرتا تھا۔

''اے مسٹر آر یو آل رائٹ۔'' اس نے اس کے پاس جا کر ہلکا سا کھنکارتے ہوئے اس

کے وائٹ شرٹ والے کندھے کو ہلکی سی تھپکی دے کر پوچھا۔

وہ اسی طرح چپ چاپ چپکا رہا۔

''ایں، کہیں دنیا سے تو رخصت نہیں ہوگیا۔'' اسے تشویش ہوئی وہ ذرا سا جھکی اور اب کے ذرا زور سے اس کے کندھے کو باقاعدہ پکڑ کر ہلایا۔

''آں آئے...... ہائے او مرگیا۔'' شاید اس سے زیادہ ڈرامہ ممکن نہیں تھا جو وہ ہائے وائے کرتا ہوا بے اختیار سیدھا ہوا تھا مگر سیدھا ہوتے ہوتے ہوئے بھی مزید ٹیڑھا ہو کر پھر سے بونٹ سے ٹکرانے کو تھا کہ اس نے بے اختیار اسے سہارا دے کر سیدھا کیا اور ایسا کرتے ہوئے پہلی بار اس کی نظریں نیچے گرے جینٹس والٹ پر پڑی اور والٹ سے تقریباً باہر نکلے پانچ سو کے نوٹ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

بالکل غیر محسوس انداز میں اس نے نوٹ کے اوپر اپنا پنک جاگر رکھ دیا۔

''آر یو آل رائٹ، سوری۔ میں نے ہارن بجایا تھا۔ آپ نے شاید سنا نہیں۔'' خود بخود اس کے لہجے میں نرمی وانکساری پیدا ہوگئی تھی۔

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے، میں اندھے کے ساتھ بہرا بھی ہوں۔'' وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر چیخا تھا۔

''نن نہیں، ہرگز نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟''

وہ اب چہرے پر معصومیت اور تشویش لیے اس سے جس طرح آنکھیں پٹ پٹا کر پوچھ رہی تھی۔ کوئی پتھر دل بھی ہوتا تو وہ بھی پگھل جاتا جبکہ وہ تو اچھا خاصا نرم دل بلکہ مخالف صنف کے لیے کشادہ دل بھی تھا۔

''اگر ٹھیک نہ ہوتا تو یوں اپنے حواسوں میں کھڑا ہوتا۔ بوٹیوں میں نہ convert ہو چکا ہوتا جبکہ آپ نے ہٹ کرتے وقت کمی بھی کوئی نہیں چھوڑی۔'' وہ اپنا بایاں کندھا اور کہنی دباتے ہوئے بولا۔

''سوری، میں اصل میں جلدی میں تھی بہت ...... ورنہ میں کیئرفل ہو کر......'' اس نے مزید روہانسی صورت بناتے ہوئے آواز میں بھی تتلاہٹ پیدا کی تو شہریار کا دل اور بھی پسیج گیا۔

''اٹس اوکے...... مجھے چکر سے آرہے ہیں۔'' اس نے گھومتے ہوئے سر کو بے اختیار تھاما تھا۔

''اوہ سوری...... آیئے میں آپ کو کسی کلینک...... اگر آپ اچھا فیل نہیں کر رہے تو۔''

''نہیں ٹھیک ہوں میں اور بی بی! آئندہ احتیاط سے مہم پر نکلا کریں اور دیکھ بھال کر صرف اسے ہی ہٹ کیا کریں جسے گھائل کرنے کا ارادہ کر کے نکلی ہوں ورنہ آپ لاشوں کے ڈھیر

گراتی جائیں گی پتا نہیں ان گاڑیوں نے اور کتنے گھروں میں صف ماتم بچھانی ہے بالشت بھر کی لڑکیاں اور لڑکے ابھی بالغ بھی نہیں ہوتے کہ نو دولتیے والدین گاڑیوں کی چابیاں نہیں ہم جیسوں کی موت کے پروانے ان کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں۔ ہوتا آپ کی جگہ کوئی لڑکا تو دیکھتیں آپ میں اس کا اس وقت تک کیا حشر کر چکا ہوتا کہ آج کے بعد وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ لیے بغیر ان چار پہیوں پہ سوار ہو کر گھر سے نہ نکلتا۔''

اس کا طبعی غصہ عود کر آیا تھا پھر اس کے منہ میں جو آیا وہ تیز تیز بولتا چلا گیا۔

''سس سوری۔ بولا نا میں نے، اور میں کوئی اناڑی ڈرائیور نہیں گزشتہ پانچ سال سے ڈرائیونگ کر رہی ہوں۔ لائسنس ہر سال ری نیو کرواتی ہوں بلکہ ہمارے ملک میں جہاں ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کرنا یا اس میں appear ہونا شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ میں وہ ہر سال گریٹ ڈس ٹنکشن کے ساتھ کلیئر کرتی ہوں۔'' وہ بھی تیز تیز بولتی چلی گئی۔

''گریٹ ڈس ٹنکشن کے ساتھ ڈرائیونگ ٹیسٹ کلیئر کرنے والوں کا یہ حال ہے ماشاءاللہ کہ موڑ مڑتے ہوئے ان کی انگلیوں کو ہارن بجاتے ہوئے تکلیف یا تکلف محسوس ہوتا ہے تو بے چارے ڈرائیونگ ٹیسٹ میں فیل ہونے والے ان پڑھ ڈرائیور بڑی بڑی کوچوں سے شہر بھر کو بھی کچل ڈالیں تو کچھ غیر مناسب نہیں۔ ان کا حق بنتا ہے۔'' وہ بھی چبا چبا کر بولا۔

''آپ خوامخواہ بات کو بڑھا رہے ہیں جبکہ میں آپ سے سوری بھی کر چکی ہوں اور آپ کو کلینک لے جانے کی آفر بھی۔'' ایک ہی جگہ پر پاؤں جمائے جمائے اس کا پیر تھک رہا تھا، وہ اب اسے قضیے کو جلد سے جلد نمٹانے کے چکر میں تھی۔

''جی، بڑی مہربانی مائی باپ جو آپ نے اس راہ چلتے کچلے جانے والے کیڑے مکوڑوں سے معذرت کی زحمت کی ورنہ۔''

''واٹ مائی باپ کس کو بولا آپ نے؟'' اس کی سوئی شہریار کے جملے کے پہلے حصے پر ہی اٹک گئی تھی۔ پوری طرح گھوم کر بولی مگر اس احتیاط کے ساتھ پاؤں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ سرکے۔

''میری سرکار! عزت مآب یا کچھ اور کہوں۔'' وہ عاجزانہ انداز میں دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکاتے ہوئے بولا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکا کر استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اب مجھے اجازت ہے یا آپ کو میں ڈراپ کر دوں جہاں آپ کہیں۔'' چند لمحے انتظار کرنے کے بعد وہ اس لسوڑے سے جان چھڑانے کے لیے ذرا نرم لہجے میں بولی۔

''تھینکس، جدھر سے آپ مارا ماری کرتی آئی ہیں۔ مجھے بس وہیں تک جانا ہے اور اگر

میں کندھے میں پین فیل نہ کر رہا ہوتا تو یقیناً یہ آفر قبول کر لیتا۔" اس کے کندھے میں واقعی خاصا درد ہو رہا تھا ورنہ شہریار اور اتنی شاندار آفر ٹھکرا دے۔ ناقابلِ یقین سی بات تھی۔

"اوکے جیسے آپ کی مرضی، بائے۔" وہ اب اس کے وہاں سے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

"یہ پلیز ذرا پاؤں ہٹائیں گی۔ والٹ سے اکلوتا نوٹ نکل کر آپ کے قدموں پر نچھاور ہوا جا رہا ہے جبکہ میں بابائے قوم کی ایسی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ جو گزشتہ دس منٹوں سے اس مصیبت کے دفعان ہونے کے انتظار میں ایک ہی ٹانگ پر کھڑی ہلکان ہو رہی تھی، اس اچانک فرمائش پر گڑبڑا کر نیچے دیکھنے لگی۔

وہ اس کا پیر ہٹنے کا منتظر تھا۔

ایک دکھ بھری سرد آہ بھرتے ہوئے اس نے پیر ہٹا لیا۔

شہریار نے شکریہ کہتے ہوئے نوٹ اور والٹ اٹھایا اور ہاتھ ہلاتا چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے اس سڑک کی طرف مڑ گیا جدھر سے وہ آئی تھی۔

"دھت تیرے کی، خبیث گھٹیا آدمی دس منٹ برباد کر دیے میرے اور...... آف!" وہ ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کوفت بھرے انداز میں بڑبڑائی اور گاڑی کے پہیوں کو ٹھوکر مارتی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھی۔

"الو کا پٹھا، سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ میں نے سوچا۔ چلو کام بن گیا مگر اپنی بیڈ لک آڑے آ گئی۔ ربش۔" اس نے زور سے گاڑی کا دروازہ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔

گاڑی ذرا نخروں کے بعد اسٹارٹ ہوئی۔

فیول کی سوئی بالکل اختتامی نشان کو چھو رہی تھی۔

وہ گولڈی کا بچہ میری گردن مروڑ دے گا، جب یہ خالی ٹین ڈبہ اس کے دروازے پر جا کر کھڑی کروں گی۔ او گاڈ! اس کی نظر نہ پڑے پٹرول انڈی کیٹر پر...... اور اس سے بھی زیادہ میں پہنچ جاؤں اس کے گھر تک، اور وہاں سے اپنے گھر...... چلو پیدل مارچ ہی سہی۔ کیب رینٹ بھی نہیں جیب میں، ساری مصیبتیں اکٹھا نازل ہونی تھیں۔" وہ مسلسل بڑبڑاتے ہوئے گاڑی اڑائے لیے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"آ گیا اڑن کھٹولا۔" وہ تھکی ہاری کوفت زدہ سی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ خالہ بی مغرب کی نماز پڑھ کر مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ بولیں۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی ڈائننگ ہال کے کونے میں رکھے فریج کی طرف بڑھی۔

"اسکوائش کی بوتل کہاں ہے؟" فریج میں پانی کی دو بوتلوں کے علاوہ فریج کی ٹھنڈک دھواں اڑاتی پھر رہی تھی۔

"صبح جمعدار لے گیا۔" وہ بے نیازی سے بولیں۔

"واٹ، سوئپر کو آپ نے اسکوائش کی بوتل دے دی۔" وہ فریج کا دروازہ کھلا چھوڑ کر پورا گھوم گئی۔

"جب بوتل میں موجود شربت کا آخری قطرہ بھی پانی سے کھنگال کر پی لیا جائے تو خالی بوتل کو ٹین ڈبے ردی والے کو دینے کا بھی سوچا جا سکتا ہے مگر مصیبت یہ تھی کہ خالی دو بوتلوں اور پلاسٹک کی ٹوٹی چوکی کے وہ صرف تین روپے دے رہا تھا۔ میں نے پانچ مانگے اس نے انکار کر دیا۔"

"افوہ خالہ بی! کیا کہے جا رہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" وہ چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے فریج کا دروازہ اسی طرح کھلا چھوڑ کر لاؤنج کے صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

"کم سے کم یہ نامراد مردوں والے جوتے اور یہ گھسی ہوئی جینز اللہ ماری...... بدبو سے تمہارے پاس کھڑے ہونے کو دل نہیں کرتا۔ پورے تین ہفتوں سے یہی چڑھائے پھر رہی ہو، دن میں بھی رات میں بھی۔ نہ پاکی کا خیال نہ پلیدی کا پتا...... اب یوں مردوں کی طرح نڈھال ہو کر پڑو گی میری جان نکالو گی پانی لا دوں۔" وہ مصلّی سمیٹتی تسبیح سنبھالتی بڑبڑاتی ہوئی اٹھی تھیں۔

"زہر لا دیں کہیں سے مجھے۔ ایک ہی بار خلاصی ہو۔" وہ چت لیٹی آنکھیں بند کیے زور سے بولی۔

"جیسا پہناوا، جیسا کھانا پینا ویسے ہی دل و دماغ میں حرام خیالات نے پیدا ہونا ہے بی بی! مجھے تم سے اسی بات کی توقع تھی۔ تم یہی کہہ سکتی تھیں، ہاں اس کے علاوہ کچھ کہتیں تو شاید میں حیرت سے مر ہی جاتی جب دیکھو، سب ہوتے سوتے دونوں ہاتھ پاؤں دل و دماغ ناک کان آنکھ سلامت اور موت کی تمنا ہر گھڑی زبان کا ورد بنی رہتی ہے۔ ایسی ناشکری نالائق نسل ہے آج کل کی کبھی جو بھولے سے منہ پر شکر کا کلمہ ہی آتا ہو۔ توبہ توبہ!" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی لاؤنج سے جانے لگیں۔

"ہاں تو جس نامراد ناشکرے نالائق نے صبح سے ناشتے میں فقط ایک سلائس جیم اور ایک کپ چائے پی ہوگی۔ شام کے سات بجے تو اس کے منہ سے ایسے ہی شکر کے کلمے نکلیں گے۔" وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے چلائی تھی۔

"تو بی بی! کس نے کہا ہے یوں پاگلوں کی طرح بے وجہ بے مقصد سڑکوں پر ماری ماری

پھرو۔کوئی طریقہ ہے یہ صبح کی نکلی شام کو بلکہ آج تو شاید اس بھوک نے شام کو ہی گھر کا رستہ دکھا دیا ورنہ آدھی رات کو لونڈوں مشٹنڈوں کی طرح شہر بھر میں چکراتے پھرنا...... اچھی باوا اماں نے تربیت کی ہے۔لڑکی ذات نہ ہوئی کسی علاقے کا دادا ہوگئی۔ حد ہے بے شرمی کی۔ یہ پرورش کے انداز ہوتے ہیں بچیوں کے، مجھے تو لگے ہیں میں نے جیتے جی موا کوئی دوسرا جنم لے لیا ہے کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہوں اور......"

"اماں باوا کا نام لینے کی ضرورت نہیں خالہ بی! سن لیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح اسی ایک نکتے پر اٹک کر زور سے چلائی تھی۔

"ماشاء اللہ کیا غیرت کا عالم ہے۔اے بی بی! ایسا ہی برا لگتا ہے اماں باوا پر حرف آنا تو کان لگا کر سنو میری بات۔کوئی انسانوں والی زندگی جیو۔یہ کیا طور طریقے اپنا رکھے ہیں تم نے۔اٹھو پیو۔"

"کیا ہے یہ؟" اس نے ان کی انسانوں والی بات سنی نہیں تھی ورنہ اس ایک جملے پر اگلے تین گھنٹوں کے لیے نیا محاذ کھل سکتا تھا۔

گلاس میں سنہری رنگ کا کوئی مشروب تھا جس میں کچھ تیرتا ہوا بھی نظر آ رہا تھا۔

"ستو کہتے ہیں اسے۔شکر ڈال کر لائی ہوں۔ پیاس بھی بجھائے گا اور دل کو تقویت بھی دے گا اور کچھ بھوک کا علاج بھی ہو جائے گا۔میرے لیے تو اب یہ تسبیح کافی ہے۔"

وہ گلاس اس کے آگے رکھ کر آرام سے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر پھر تسبیح گھمانے لگیں۔وہ اس منہ تک بھرے لبالب گلاس کا بغور جائزہ لینے کے لیے اٹھ بیٹھی تھی اور ذرا قریب ہو کر گلاس میں ہلکورے لیتے مشروب کو گویا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند ثانیے جائزہ لینے کے بعد اس نے گلاس کو ہاتھ لگایا بیرونی سطح کی ٹھنڈک نے پیاس کو کچھ اور بھڑکایا کہ وہ بے ساختہ گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا گئی۔

"آخ تھو تھو...... یہ کیا ملغوبہ ہے۔او مائی گاڈ!" صرف ایک گھونٹ اس کے اندر گیا تھا۔ دوسرا گھونٹ اس نے دوڑ کر لاؤنج کے کونے میں لگے سنک میں اگل دیا تھا۔

خالہ جی نے تسبیح گھماتے ہوئے اسے تاسف سے دیکھا اور سر جھٹک دیا۔

"جب پیٹ میں بھوک ہو اور بدن میں پیاس کا صحرا تو اس جیسی چیز کو من و سلویٰ کہتے ہیں۔ناشکری لڑکی!" وہ لحہ بھر کو تسبیح روک کر اسی متاسف لہجے میں بولیں۔

"تو یہ من و سلویٰ آپ ہی کو مبارک ہو۔ مجھے نہیں کھانا نہ پینا۔" وہ پھر سے صوفے پر چت لیٹ گئی۔

لیٹے لیٹے جاگرز پیروں کی مدد سے اتار کر پرے اچھالے پیروں کے انگوٹھوں سے چھوٹی

چھوٹی جرابیں بھی جاگرز کے پیچھے اتار کر پھینکیں اور گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

"پھر کیا سوچا تم نے؟" اس سے پہلے کہ وہ یہیں لیٹے لیٹے خراٹے لینے لگے، خالہ جی نے حفظ ماتقدم کے طور پر وہ موضوع چھیڑ دیا جس سے اس کی آئی نیند بھی با آسانی اڑنچھو ہو سکتی تھی۔

"پلیز خالہ بی! خالی پیٹ ہو تو دماغ کیا دل بھی خالی ہوتا ہے۔ اگر کھانے کے لیے کچھ ہے تو لے آئیں۔یہ کلثوم کدھر ہے۔کلثوم!" وہ آواز دینے لگی۔

"چلی گئی ہے وہ آج صبح۔آخر بغیر تنخواہ کے وہ کب تک کام کرتی۔ چھ ماہ صبر آزما انتظار کے بہت ہوتے ہیں۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولیں۔

"اور بخشی صاحب بھی گیٹ پر موجود نہیں تھے؟" وہ اب ٹانگ پر ٹانگ رکھے جھلا رہی تھی۔اس کی بلیو فیڈڈ جینز کے فولڈ پائنچوں سے نظر آتی دودھیا سڈول پنڈلیاں خالہ بی کے ارتکاز کو بھٹکانے لگیں۔

"ظاہر ہے اسے کسی پاگل کتے نے تو کاٹا نہیں کہ بغیر تنخواہ کے اپنی مخلصانہ خدمات پیش کرتا رہے۔چلا گیا اور پتا دے گیا کہ دوبارہ ضرورت ہو تو بلا لیں۔ میں نے کہا بھائی بے فکر ہو کر نکلو۔ادھر دوبارہ ضرورت کے کوئی آثار نہیں۔" وہ اسی طنزیہ لہجے میں بولیں جو ایمن کا جی جلاتا تھا۔

وہ بدستور آنکھیں بند کیے ٹانگیں جھلاتی رہی۔

"سارا دن کہاں ماری ماری پھرتی رہیں جہاں کھانے کو بھی کچھ نہ ملا۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر ان کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"کہاں مارا مارا پھرنا ہے۔ ایگزیبیشن تھی بنٹی کے کالج میں اس کے اسکیچز کی۔ وہاں سے نکلی تو ماریہ اور روکی مل گئے، انہیں نیو کیمپس چھوڑا راستے میں برگر لیے تھے انہوں نے۔ میں نے راستے میں سوچا تھوڑی شاپنگ کر لوں گی۔ پتا نہیں کیمپس میں ان کے ساتھ پھرتے کب بیگ میں سے والٹ کہیں گر گیا اور جو گولڈی سے وعدہ کر کے اس کی گاڑی لے کر گئی تھی کہ شام کو کم از کم چھ سات لیٹر فیول ڈلوا دوں گی وہ بھی نہ ہو سکا بمشکل فیول نے اس کے گھر تک ساتھ دیا اور فیول میٹر دیکھتے ہی اس کمینے کا جو میٹر گھوما، پیدل آ رہی ہوں۔ دو جگہ لفٹ لینے کا سوچا......مل بھی رہی تھی۔" اس نے کہتے ہوئے کن اکھیوں سے خالہ جی کے چہرے پر بدلتے خوفناک تاثرات کو دیکھا۔"پھر آپ کا خیال آ گیا جو آپ ہر وقت نصیحتیں کرتی رہتی ہیں یوں بھی آج کل شہر کیا ملک کے حالات اتنے عجیب وغریب ہو گئے ہیں۔سوچا ایسا رسک لینا ہی نہیں چاہیے میں نے اچھا کیا نا خالہ جی!" آخر میں وہ بھر بھولا سا منہ بنا کر ان کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر بولی۔

"بہت اچھا کیا میری بچی! نری جنت کمائی۔ خال خال ہی ایسے کارنامے درج ہوں گے

تمہارے اعمال نامے میں۔ ان ہی گنے چنے روشن ارادوں کی بدولت ہی اللہ نے تمہیں جنت کا ٹکٹ دے دینا ہے۔ شاباشے دھیے۔" وہ غصے رنج اور طنز کی ملی جلی کیفیت میں کہتی چلی گئیں۔

"آپ کی باتیں ذہن میں رکھ کر ان پہ عمل کرتی ہوں تو بھی آپ خوش نہیں ہوتیں۔" وہ آنکھوں میں امڈ آنے والے پانی کو پرے دھکیلتے ہوئے ذرا رنجیدگی سے بولی۔

"میں خوش میرا رب خوش، اب خوش؟ اس خوشی سے پیٹ بھرو اور میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ منہ ہی میں بدبدا کر پھر سے تیز تیز تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

"خالہ جی! کیا پڑھتی رہتی ہیں؟" ان کی مسلسل چپ پر چند لمحوں کی کوفت زدہ خاموشی سے بیزار ہو کر وہ بولی۔

"اللہ ہمیں بھوک سے مرنے والے لوگوں میں شامل ہونے سے محفوظ رکھے یا کب مجھے یہاں سے رہائی کا پروانہ ملے گا، اس کے لیے وظیفہ کرتی رہتی ہوں۔" اسی جلے کٹے لہجے میں جواب آیا جس کی ایمن کو توقع تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔

"ایسی بوجھ ہوں نا میں آپ پر۔" چند ثانیے بعد وہ دل گرفتگی سے بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر نیم دراز ہو گئی۔

"ہاں تو اس میں جھوٹ کیا ہے بی بی! میں لگی لپٹی رکھنے والوں میں سے نہیں، حق بات کہنے سے کسی کے منہ پر نہیں چوکتی اور الحمدللہ غرور کی بات نہیں، پر زندگی بھر ہر لمحہ کوشش کی کہ کبھی کسی کے پیٹھ پیچھے کچھ نہ کہوں جو کہوں اس کے منہ پر کہوں۔" وہ تیکھے لہجے میں تسبیح والا ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولی تھیں۔

"ہاں چاہے آپ کی اس شان دار خوبی کی زد میں آ کر کوئی دن میں دس بار خودکشی کے بارے میں سوچنے لگے۔" وہ بھی اسی جلے کٹے انداز میں بولی۔

"یہ سننے والے کا اپنا دماغ۔ سمجھنے والی بات کو بھی اپنی ڈھیٹ جان کے لیے ضرر سمجھے۔" وہ بغیر لحاظ رکھے جھٹ سے بولیں۔

"اچھا پلیز۔ اب کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں۔" وہ اکتا کر اٹھی اور پھر دھڑام سے صوفے پر گر گئی جسم جیسے بے جان ہوا جا رہا تھا۔

"پرس میں کتے (کتنے) پیسے تھے۔" انہیں جیسے یاد آیا تو فوراً تیکھے چتون سے بولیں۔

"بے فکر رہیں پیسے ہی تھے۔" وہ پھر سے ٹانگیں جھلانے لگی تھی۔

"تو بی بی "پیسے" تھے جن کے بل بوتے پر آپ شاپنگ پر نکلنے کا سوچ رہی تھیں۔" وہ کہاں چوکنے والی تھیں۔ وہ ان سنی کر کے ٹانگیں جھلاتی رہی۔

"وہ تمہارا تیسرا کان کہاں گیا۔" وہ تھوڑی دیر بعد پھر سے اچانک بولیں کہ وہ جو مگن انداز میں لیٹی جھول رہی تھی ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔ دونوں کانوں کو بے اختیار چھوا اور حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تیسرا کان! کیا مطلب؟"

"وہ موا ہاتھ بھر کا بٹا دا (گڈا) جس میں تم جیسوں کی جان اٹکی رہتی ہے۔ جب دیکھو کان سے لپٹا تیسرا کان بنا رہتا ہے۔"

انہوں نے سیل فون کے بارے میں وضاحت سے کہا تو اس کی ایسی کوفت زدہ حالت میں بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"حد ہو گئی خالہ بی! وہ گولڈی کمینے نے چھین لیا۔ کہہ رہا تھا تم نے گاڑی کی ٹنکی خالی کر دی۔ میں تمہارا بیلنس تمام کر دوں گا۔ کل آ کر لے جانا۔ کیا کرتی مجبوراً دینا پڑا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"اور جو کل وہ مکر جائے؟" وہ تشویش سے بولیں۔

"تو مکر جائے۔ اب تو کوئی بھی حادثہ یا دکھ نیا لگتا ہے نہ شاکنگ۔" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے پھر سے لیٹ گئی۔ ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور ٹانگیں جھلاتی ہوئی چینل سرچنگ کرنے لگی۔

"دیکھو، میرے سامنے یہ نوٹنکی نہ کھولا کرو۔ لو ہم چلے جاتے ہیں اٹھ کر۔" ٹی وی آن کرنا انہیں یونہی برافروختہ کر دیا کرتا تھا۔ فوراً تسبیح سنبھالتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اچھا بند کر رہی ہوں۔ پلیز کچھ کھانے کو تو لا دیں۔" اس نے فریاد بھرے انداز میں کہتے ہوئے ٹی وی آف کر دیا۔

وہ ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔

"جیو خالہ جی! جیو۔" وہ چھلانگ لگا کر اٹھی تھی۔

ٹرے میں بھاپ اڑاتے چاولوں کی پلیٹ تھی۔ دوسری پیالی میں تھوڑے سے آلو تھے اور رومال میں موٹی سی باسی روٹی۔ روٹی کی شکل سے نظر آ رہا تھا کہ باسی ہے۔

"آج پھر آپ باسی روٹی کھا رہی ہیں، وہ بھی رات کے ٹائم پھر آپ کے پیٹ میں درد ہو گا۔" پہلا چمچہ لیتے لیتے وہ رک گئی۔

"میرا پیٹ تمہارے جیسا نازک نہیں۔ عادی ہوں میں ایسی روٹی کھانے کی۔ رات بھر کی

بچی روٹی اللہ کی ثنا کرتی ہے۔ اسے کھانا ثواب ہے۔" وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے نوالہ توڑنے لگیں۔

"نرالی منطق ہے آپ کی بھی۔ روٹی ثنا...... یعنی تعریف کرتی ہے چاہے پیٹ میں کھانے سے مروڑ اٹھیں۔ حد ہے۔" وہ منہ میں بڑبڑاتے ہوئے چاول کھانے لگی۔

"خالہ بی دانتوں، داڑھوں سے آدھے خالی منہ میں سخت روٹی کا نوالہ چباتے اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچے جارہی تھیں۔

☆☆☆

"میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو......"

وہ آئینے میں بال بناتے ہوئے مسلسل گنگنائے جارہا تھا وہ بھی صرف ایک لائن۔

"یار اب تو ہم سب کو باجماعت دعا کرنی چاہیے کہ خدا تیرے سپنوں کی رانی کو تجھ سے ملوا ہی دے تو کم سے کم صبح و شام رات کے جس پہر بھی تجھے جاگتے پاؤ تیرے لبوں سے ہونے والی اس گردان سے تو ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ مائی گاڈ تجھے اور کوئی گانا نہیں آتا۔"

رضوان گیلا سر تولیے سے رگڑتے ہوئے باتھ روم سے نکلا تو اسے وہی ایک مصرع دہراتے ہوئے سن کر بے طرح چڑ گیا۔

"میری جان! گانے تم مجھ سے ہزار سن لو، بے شمار سن لو کہ تم کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگ نکلو گے اکیسویں صدی کا تان سین نہ مانا مجھے تو میرا نام بدل دینا۔ اس ایک مصرع کو گانا اور گاتے ہی رہنے کی خاص وجہ ہے۔"

"ویسے تو مجھے معلوم ہے تم جواب میں کون سی گھسی پٹی بات ارشاد فرماؤ گے مگر اس کے باوجود میں کہوں گا، سناؤ کیونکہ تم سنائے بغیر رہو گے نہیں۔"

رضوان نے گیلا تولیہ کھلی کھڑکی کے ہینڈل پر ڈال دیا۔

"دیکھو، وہ کہتے ہیں چوبیس گھنٹوں میں کوئی نہ کوئی گھڑی قبولیت کی ہوتی ہے اور یہ کوئی Myth...... نہیں حقیت ہے۔ ایسا ہوتا ہے اس لیے میں ہر گھڑی سوتے جاگتے ایک ہی راگ الاپتا رہتا ہوں۔ اب بولو تمہیں کوئی اعتراض؟" اس نے برش کی جان چھوڑ کر پرفیوم اٹھا کر اسپرے کرنا شروع کیا۔

"میری کیا مجال میں آپ کی اس لمحہ بہ لمحہ جاری و ساری دعا کی راہ میں حائل ہونے کی جسارت کروں۔ معافی پیرو مرشد! ویسے کیا زندگی صرف سپنوں کی رانی کے مل جانے سے مکمل کامیاب اور مکمل حسین ہو جاتی ہے؟" اب آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کی باری رضوان کی تھی۔

شہریار پرے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔

"جس طرح کی سپنوں کی رانی میں اللہ سے ڈیمانڈ کر رہا ہوں، اس سے تو میری جان! زندگی مکمل کامیاب کیا مکمل حسین و جمیل تابناک ہو جائے گی بس ایک بار اسے آنے تو دو۔" وہ بے حد جذباتی انداز میں بولا۔

"رئیلی! ایسی شاندار سپنوں کی رانی کی کوئی خاص نشانی۔ شاید قسمت ہم پر بھی مہربان ہو جائے جو ایسی حسینہ ہماری زندگی میں بھی آجائے۔"

ویسے تو رضوان اس کی باتوں پر کم ہی دھیان دیا کرتا تھا آج جانے کیسے اتنی دلچسپی کا اظہار کر بیٹھا۔

"راز کی بات ہے۔ یوں سرعام وہ بھی مفت میں افشا کر دوں۔ امپاسبل۔" وہ فوراً کمینگی پر اتر آیا۔

"چلو فیس چاہیے تو تمہاری موجیں کروا دیتے ہیں۔ آجانا آج رات کو عیش نہ کرا دیے تو نام بدل دینا۔" رضوان آئینے میں ہی اسے دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ دبا کر بولا۔

"اے بھائی! مجھے معاف رکھو۔ ایسی عیش و عشرت سے۔" وہ بے اختیار اس کے آگے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے بولا۔

"تمہاری منطق بھی نرالی ہے، یوں تو ہر وقت سپنوں کی رانی کے گیت گاتے رہتے ہو اگر اس سپنے کو تھوڑا رئیل بنانے کے لیے ایڈ دو تو تم گھوڑے کی طرح بدک جاتے ہو۔"

"میں تمہاری ایڈ کو قبول تو کر لوں مگر ڈر لگتا ہے۔" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کس بات سے بھلا؟" رضوان قطعاً نہیں سمجھا۔

"ایڈز سے۔" وہ چبا کر بولا۔ "اور تم بھی یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ کسی اور پر نہیں میرے یار خود پر رحم کھاؤ۔"

"لعنت ہو تم پر، جب بھی بات کرو گے ایسی الٹی اور منحوس...... ہم بھی ننھے چوزے نہیں ہیں دیکھ بھال کر "مال" ہائر کرتے ہیں۔ یوں سستا فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا نہیں اٹھا لاتے۔" رضوان بدمزہ سا ہو کر اسے جتانے والے انداز میں بولا۔

"جانے دو۔ کیا سستا کیا مہنگا۔ اس خرید و فروخت میں کیا پتا چلتا ہے جب آنکھوں اور دماغ پر نشہ چڑھا ہو تو مطلب کا ہر مال کھرا ہی نظر آتا ہے۔ مجھے بخشو بھائی، چو ہالنڈورا ہی بھلا۔" وہ ایک بار پھر اس کے آگے ہاتھ باندھ کر اسی اسٹائل میں بولا اور کلائی پر گھڑی باندھنے لگا۔

''تو آج رات تم نہیں آؤ گے'' رضوان کو مایوسی ہوئی تھی۔

''ظاہر ہے، آج پھر مجھے انیق کی منت کرنی پڑے گی۔ اس کے کمرے میں مچھر اس قدر ہوتے ہیں مگر بے فکری تو ہوتی ہے جراثیموں کی طرف سے ایک وہ بے چارہ ہے یا ایک میں ورنہ تو اس ہاسٹل میں...... اف کیا زمانہ آ گیا ہے۔'' وہ افسوس بھرے انداز میں سر ہلا کر بولا۔

''انیق بے چارہ یونہی بے چارہ نہیں بنا ہوا، تھوڑا قسمت کا مارا بھی ہے۔ پرسوں میں نے اسے یونانی دواخانے کی دکان سے نکلتے دیکھا ہے وہ جو بڑے مشہور حکیم ہیں مردانہ خفیہ امراض کے ماہر۔'' وہ ایک بار پھر اسی طرح آنکھ دبا کر بولا۔

''چلو بے چارہ ہے یا قسمت کا مارا مجھے رات کو کمرے میں جگہ تو دے دیتا ہے۔''

''مجھے تو تم بھی...... چکر لگا لو تم بھی اس یونانی دواخانے کا۔'' رضوان ذومعنی انداز میں بولا۔

''اس کی ضرورت جلد ہی تمہیں پڑنے والی ہے۔ ان کا پتا سنبھال رکھو اور سنو آج رات کمرہ نہیں خالی کرنے والا۔ تین سو روپے شام کو جیب میں رکھنا ورنہ کسی اور کمرے کی بکنگ کو نکلو کوئی بھی پانچ سو سے کم پر نہیں مانے گا۔'' وہ موبائل فون اور والٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''دوست نہیں ہو؟'' رضوان ملتجی لہجے میں بولا۔

''دوست ہوں اسی لیے تین سو پر مان رہا ہوں ورنہ دشمن ہوتا تو ریڈ ڈلوا دیتا۔ ویسے حقیقی دوستی کا تقاضا تو یہی ہے۔'' وہ رک کر شرارت سے بولا۔

''بہت گھٹیا ہو تم......'' رضوان کلس کر بولا

''تم سے کم، بائے شام کو تین سو تیار رکھنا۔'' وہ اسے ہاتھ ہلاتا باہر نکل گیا۔ رضوان تھوڑی دیر اسی پوزیشن میں کھڑا رہا پھر کپڑے نکالنے کے لیے الماری کی طرف بڑھا۔

''میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو چلی آ......'' وہ رات کے تصور کو ذہن میں لاتے ہوئے بے اختیار گنگنانے لگا اور پھر خود ہی چونکتے ہوئے ہنس پڑا۔

''گھنا پھر نہیں بتا کر گیا ساری بات۔ پھر پوچھ لوں گا۔'' اس نے ہینگر میں لٹکا سوٹ باہر نکالا اور الماری بند کر دی۔

☆☆☆

''اب کہاں جا رہی ہو خیر سے صبح سویرے۔'' وہ جیسے ہی تیار ہو کر کمرے سے نکلی خالہ جی سامنے ہی کھڑی تھیں۔

''آ جاؤں گی تھوڑی دیر میں۔'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔

''وہ تو مجھے پتا ہے تمہاری تھوڑی دیر کتنی ہوتی ہے۔ پوچھ رہی ہوں جا کدھر رہی ہو خیر

سے؟'' وہ اپنی بات دہراتے ہوئے زور دے کر بولیں۔

''خالہ جی! آ کر بتا دوں گی۔ ابھی جانے دیں نا۔'' اس نے شولڈر سے پھسلتا بیگ دوبارہ کندھے پر جمایا۔

''پنک کلر کی لپ اسٹک بتا رہی تھی وہ کسی خاص جگہ جا رہی ہے ورنہ تو روز یونہی سر پر برش مار پیروں میں جاگرز اڑسے اور کندھے پر لمبا سا بیگ ڈال کر چل دیتی تھی۔''

''کم سے کم چھوٹا موٹا دوپٹہ ہی لے لیا کرو۔ یوں ماہی منڈوں کی طرح نکلتے شرم نہیں آتی تمہیں۔'' خالہ بی نے ایک بار پھر وہی اعتراض اٹھایا جو وہ ہر روز اس کے باہر نکلتے وقت کیا کرتی تھیں۔

''افوہ خالہ بی! پھر وہی اعتراض، اچھا لے لوں گی اس وقت ملی نہیں۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے ان کے پہلو سے کترا کر نکل گئی۔

''اچھا ناشتہ تو کر جاؤ پھر سارا دن لور لور پھرو گی وہ بھی خالی پیٹ۔ تھوڑا سا کچھ لے لو۔'' وہ آخر میں بالکل ہی منت بھرے انداز میں بولیں تو وہ جاتے جاتے رک ہی گئی۔

''کیا ہے؟'' اسے جانے کی جلدی تھی اور یہ خالہ بی۔

اس کے سامنے ایک بھرپور ناشتہ تھا۔ صرف اورنج جوس کی کمی تھی جس کی وہ بچپن سے عادی تھی۔

آملیٹ کے ساتھ دو سلائیسز تھے اور چائے...... چائے تو اسے پسند بھی نہیں تھی۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں۔ بریڈ نہیں ہے تو یہ......'' وہ لقمہ توڑنے سے پہلے بولی۔

''صبح ساتھ والوں کے ملازم سے منگوائی تھی۔''

''اور پیسے؟''

''اتنے تھے میری پاس۔'' انہوں نے مختصراً کہا تو وہ سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگی۔

''تھوڑی سی چائے لے لو۔ میں نے بالکل ہلکی بنائی ہے۔ پتی نہ ہونے کے برابر۔''

انہیں شاید اس کی صحت کی فکر تھی جو اتنا منت بھرا انداز اپنائے ہوئے تھیں، ورنہ آج کل جتنی ظالم اس کے حق میں خالہ بی ہو رہی تھیں۔ کوئی اور نہ تھا۔ اس نے خاموشی سے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

پہلا گھونٹ ہی کڑوا، کسیلا بے مزہ سا لگا صرف خالہ بی کے مزید اصرار سے بچنے کے لیے اس نے تین چار اوپر نیچے گھونٹ بھر کر کپ واپس رکھ دیا۔

''مالٹوں کا موسم اب کب رہا ورنہ تمہارے لیے جوس کسی نہ کسی طرح منگوا ہی لیتی۔''

وہ اس کے چہرے کے زاویوں سے چائے کے لیے ناپسندیدگی بھانپتے ہوئے دھیمی سی آواز میں بولیں۔

اور یہ بھی تو اسے آج کل ہی پتا چلا تھا کہ اورنج کا سیزن کون سا ہوتا ہے اور سیزن میں یہ فروٹ سستا ہوتا ہے، ورنہ اس کی اٹھارہ انیس سالہ زندگی میں شعور سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے بریک فاسٹ سے اس گلاس کو کبھی غیر حاضر نہیں پایا تھا۔

''اور جو کل چیک ساتھ والوں کا ملازم واپس لے آیا۔ بینک میں پیسے ہی نہیں۔ کیا کہہ رہا تھا مشکل سا لفظ چیک کیا ہو گیا ہے۔''

وہ ناشتہ کر چکی تھی۔ اسی خیال سے مطمئن ہو کر انہوں نے وہ ٹاپک چھیڑ دیا جس سے وہ کل سے بچنا چاہ رہی تھی۔

''باؤنس۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''وہی، اب کیا ہو گا؟'' انہوں نے سوالیہ نظریں اس کم سن مگر سنجیدہ چہرے پر جما دیں، وہ چپ تھی۔

''میں تو کہتی ہوں۔ چلو میرے ساتھ سکھر۔'' چند لمحوں کے انتظار کے بعد وہ بولیں۔ اسے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا۔

''واٹ؟'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہرگز نہیں۔''

''تو پھر کیا میں یہیں جمی بیٹھی رہوں۔ آخر......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی جسے وہ خود بخود سمجھ گئی۔ ''تم اکیلی کیسے رہو گی۔''

''خالہ بی! میرے لیے اکیلا رہنا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ میں نے ساری زندگی اسی اکیلے پن کے ساتھ گزاری ہے۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''جانتی ہوں بس تمہارے اماں باوا......''

''پلیز خالہ بی!'' اس نے یکدم سے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''اچھا کچھ نہیں کہتی میں، پر میری بیٹی تو لڑکی ذات ہے۔ اس مردوں کے معاشرے کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ پھر یوں صبح کی نکلی شام ڈھلے گھر آنا۔ تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آ چکی۔ آگے کیا ہو گا، کیا سوچا ہے؟'' ایک دم سے انہیں جیسی ساری پریشانیاں ساری آفتیں یاد آ گئی تھیں۔

ایمن کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ تو کہتی ہیں خالہ بی! مایوسی گناہ ہے اور اللہ مالک ہے تو کیا اب......'' اس نے

جان کر فقرہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''نہیں بالکل نہیں مایوس ہوئی میں، اور اپنی ذات کی تو مجھے کوئی فکر ہی نہیں۔ جو ذمہ داری تمہارے ماں باپ مجھ ناتواں کے کندھوں پر ڈال گئے ہیں اس سے ہراساں ہوں پھر تم کچھ سنتی نہیں سمجھتی نہیں اور میں سچی بات کہوں......''

وہ اب پھر چل پڑی تھی۔ خالہ بی اس کے پیچھے پیچھے بولتے ہوئے آ رہی تھیں۔

''اب زیادہ دیر ادھر رک نہیں سکتی۔ ہے نا خالہ بی! یہی کہنا چاہ رہی ہیں نا آپ......'' وہ پلٹ کر ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی تو انہوں نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''خالہ بی! آپ آج ایک بات میری سن لیں غور سے۔'' وہ ان ہی قدموں پر کھڑے کھڑے گھومی تھی۔ ''میں شروع سے اکیلی رہی ہوں۔ اکیلی ہوں اور جیسے حالات چل رہے ہیں۔ آئندہ بھی یہی کچھ ہو گا۔ میں نے جو کچھ اپنے لیے کرنا ہو گا۔ یہیں رہ کر کروں گی آپ کے ساتھ تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رہے فنانشل پرابلمز، وہ مستقل ہیں۔ میں آج کل میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی اور مجھے ایسی ہی زندگی پسند ہے۔ یہ لڑکوں جیسی یا لڑکیوں جیسی آئی ڈونٹ کیئر۔ مجھے یہی لائف اسٹائل پسند ہے اور میں ایسے ہی رہوں گی جو آپ چاہتی ہیں کہ میں بدل جاؤں۔

سرتاپا مشرقی لڑکیوں کی طرح چادر کی بکل مار کر گھر کے کونے کھدروں میں روتی سسکتی قسمت کو کوستی آسمان کو تکتی کسی ناخدا کی آمد کے انتظار میں دن گنتی رہوں شادی کے لیے، تو سوری خالہ بی! ابھی میری زندگی میں شادی نام کی مالا جپنے کی مصروفیت دور دور تک نہیں۔ ذرا مالی پرابلمز حل ہو جائیں تو میں اسٹڈیز جوائن کر لوں گی یا باہر چلی جاؤں گی۔ اب آپ کی مرضی۔ آپ یہاں رکیں یا چلی جائیں۔ میں آپ کو رکنے کے لیے نہیں کہوں گی۔ آخر آپ محض میری وجہ سے کیوں ایک ناپسندیدہ جگہ سے جڑی رہیں۔ آپ میری طرف سے فری ہیں، جو آپ کا دل چاہے آپ کریں اور پلیز مجھے یہ آتے جاتے مت ٹوکا کریں۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور کسی کی یہ فضول مداخلت پسند نہیں کرتی۔ چلتی ہوں بائے۔

وہ جو بولنا شروع ہوئی تو رکے بغیر کہتی چلی گئی۔ خالہ بی تو مارے حیرت کے ٹکر ٹکر بس اس کی شکل تکے جا رہی تھیں۔ کب وہ بات ختم کر کے کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی، انہیں پتا بھی نہیں چلا۔

اس کے جانے کے کتنی ہی دیر بعد انہیں ہوش آیا تھا۔

''اللہ میری توبہ توبہ استغفار...... توبہ......'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی پیچھے صوفے پر ڈھے

گئیں، اور اپنی کنپٹیاں دونوں ہاتھوں سے دبانے لگیں۔

''بالکل ماں باپ جیسی خودغرض، بے حس، پتھر دل، انہوں نے کیا کیا ساری زندگی، وہی تو یہ کرے گی۔ ماں باپ کا لہو، ان کی تربیت بول رہی ہے رقیہ بی بی! تمہارے چار دنوں کے سمجھانے سے یہ کیا سمجھے گی اور تم بھی کسی پتھر سے سر پھوڑنے چلی ہو۔ چھوڑ دفع کرو۔ کہہ جو رہی ہے کہ میں اکیلی رہ لوں گی۔ رہتی آئی ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا تو رہ لے گی۔ میں کیوں ادھر بیٹھی اپنا خون جلاتی رہوں، وہ کون سا میری پروا کرتی ہے دن بھر غائب رہتی ہے۔ اللہ جانے کن اپنی جیسی مردصورت لڑکیوں میں آوارہ گھومتی رہتی ہے اور میں جو اس آس میں بیٹھی ہوں کہ میری بات مان کر وہ شادی پر راضی ہو جائے گی اور میں اسے کسی کھونٹے سے باندھ کر اطمینان سے گھر جا کر اللہ کے حضور جانے کی تیاری کروں گی تو یہ میری بھول ہے۔ نہ یہ ماننے والی ہے نہ پگھلنے والی تو فضول اپنا بھیجا گلانے سے فائدہ۔ چل رقیہ بی بی! اپنا بوریا بستر باندھ اور کل نکل ادھر سے۔ بہت ہو گیا یوں بے جان چیز کی طرح پڑے پڑے۔ وہ تو تمہیں جوتی برابر نہیں سمجھتی تو کیا فائدہ......''

وہ جلتی کڑھتی خود کو سمجھاتی، بجھاتی اپنا سامان باندھنے چل دیں۔

☆☆☆

اسے حلیم صاحب نے یہ فائل دے کر ملٹی ڈائمنشن کی طرف بھیجا تھا۔

وہ مطلوبہ شخص سے مل کر فائل پر اس کے کمنٹس لے کر اب واپس جا رہا تھا، جب ایک واقف کار اسے مل گیا۔ تھوڑی دیر اس کے ساتھ گپ شپ لڑائی اور پھر واپسی کے لیے لفٹ کی طرف بڑھا۔

لفٹ نیچے سے اوپر آئی تھی۔

بند دروازہ کھلتے ہی جو چہرہ اس کے سامنے آیا۔ اس نے اسے کشمکش میں ڈال دیا۔

''اسے کہاں دیکھا ہے کہاں بھلا؟'' وہ وہیں ایک طرف ہو کر اسے جاتا دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

''کمال ہے، بالکل یاد نہیں آ رہا کون ہے؟ کہاں دیکھا ہے اور......''

اسے عجیب سی الجھن نے گھیر لیا تھا، وہ واپس جانا بھی بھول گیا۔ صورت دیکھی بھالی تھی مگر فوری طور پر یاد نہیں آ رہی تھی۔

''اوہ یہ تو وہی ہے، کل شام والی۔ مس شعلے یا مس ہانگ کانگ کی بھتیجی یا بھانجی۔ یہ ادھر کدھر......''

اسے سب یاد آ گیا تھا اور نہ جانے کیوں چند لمحوں بعد اس نے ذرا سوچ کر فی الحال واپسی کا

ارادہ ترک کر دیا۔

''ذرا پتا کرتے ہیں، یہ تتلی ہے کون؟ اور ادھر اس کا کیا کام ہے؟'' وہ جان بوجھ کر ایک طرف ہو کر ویٹنگ روم کی دیوار سے ٹیک لگائے بظاہر سامنے چلتے ٹی وی کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

''ہائے انکل!'' وہ پیون کے ''سر بزی ہیں'' کی گردان کی پروا کیے بغیر گلاس ڈور دھکیلتی اندر داخل ہوئی تھی۔

''ہائے پنکی ڈیئر ویلکم۔'' راشد انکل اسے دیکھتے ہی حسب معمول کھل اٹھے تھے۔ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ آپ کا پیون نیا ہے کیا؟ مجھے اندر نہیں آنے دے رہا تھا۔'' اس نے کھڑے کھڑے ذرا روکھے لہجے میں پیون کی شکایت کی۔

''اوہ سوری، اس نے تمہیں روکا۔ اس کی طرف سے میں معذرت کرتا ہوں۔ آج اصل میں، میں سارا دن ہی بزی ہوں۔ ابھی بھی میری میٹنگ شروع ہونے والی ہے کانفرنس روم کی طرف ہی جا رہا تھا میں۔ وہ شاید سمجھا ہوگا میں جا چکا ہوں۔ خیر تم آؤ۔ بیٹھو کہو آج کیسے ہماری یاد آ گئی؟'' وہ خوشگوار مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''ظاہر ہے آج کل بغیر کسی وجہ کے کسی کی بھی یاد آنا ذرا محال ہے۔ یو نو ہوا جو چلی ہے میٹریلزم کی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اور ہاتھ میں پکڑے گلاسز گھمانے لگی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ اسی طرح لبوں پر مسکراہٹ سجائے بولے۔

''میں بھی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ نہیں سمجھ میں آیا تو اسی لیے آپ کے پاس آنے کی زحمت کی ہے۔'' وہ مبہم سے لہجے میں بولی۔

''او کے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا اس پر ابھی بات کرتے ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کیا چلے گا چائے کافی تو تم پیتی نہیں ہو۔ تمہارا فیورٹ اورنج جوس منگوالوں؟''

''شیور!'' وہ فوراً کندھے اچکا کر بولی۔ اور کرسی پر رکھی ٹانگ جھلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ''اچھا مین ٹین کر لیا ہے آپ نے آفس۔'' وہ ستائشی نظروں سے آفس کے نئے آؤٹ لک اور نئی کلر اسکیم کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' وہ ٹیبل ٹاپ پر پڑی موٹی سی سیاہ فائل کو کھول کر اس میں لگے اوراق درست کرتے ہوئے یونہی بولے۔

"فاقے۔" وہ ذرا زور سے بولی۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا تو وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بائی داوے۔ آپ کے ارادے کیا ہیں؟" وہ کانچ کی طرح کھنکھناتی ہنسی کے درمیان ذرا سا رک کر بولی۔ وہ پھر سے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"انکل! آپ کا ارادہ کنڈر گارٹن میں ایڈمیشن لینے کا تو نہیں۔ ہر بات کا مطلب پوچھے جا رہے ہیں۔ بھئی فاقے کا مطلب فاقے ہی ہوتا ہے۔ یعنی نتھنگ ایمپٹی پاکٹ۔ ایمپٹی بیلی (خالی پیٹ) اور ایمپٹی برین۔" اس نے دماغ کی طرف انگلی گول گول گھماتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیوں؟" وہ پھر بولے۔

"یہی تو میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں۔" وہ ٹیبل پر پڑے ٹشو باکس کو اپنی طرف کھسکا کر اس میں سے ٹشو نکال کر اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کل خالہ بی نے دس ہزار کا چیک اونلی ٹین تھاؤزنڈ انکل! اور وہ چیک باؤنس ہو کر آ گیا۔ میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں کیوں؟" وہ آخر میں درشتی سے بولی تھی۔

راشد صاحب چپ سے ہو گئے۔

اسی وقت پیون اس کے لیے اورنج جوس اور راشد صاحب کے لیے کولڈ کافی لے کر آ گیا۔

"اور میری گاڑی ورکشاپ میں کھڑی ہے شاید آپ کے نالج میں نہیں۔ میں کیب سے آئی ہوں۔" وہ پھر بولی تھی۔ انہوں نے اسے جوس پینے کا اشارہ کیا اور خود بھی کافی پینے لگے۔

اس کا جوس ختم ہونے تک دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی صرف ایک بار ان کے انٹر کام کی بیل ہوئی اور انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہہ دیا کہ اگلے دس منٹ تک انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

"یس!" اس نے ٹشو سے اپنے ہونٹوں کو ہلکا سا دبایا اور پہلے والی پوزیشن میں بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"شمشاد صاحب نہیں آئے تمہاری طرف؟"

اتنی دیر بعد وہ یہ بولے۔

وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"بہر حال میں انہیں فون کرتا ہوں وہ شام یا رات میں تمہاری طرف چکر لگائیں گے۔"

وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے فائل پر جھک گئے۔

"واٹ!" وہ دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر زور سے بولی تھی۔

"یہ کیا جواب ہوا میری تمام باتوں کا۔"

"یہی جواب ہے اور شمشاد صاحب ہی سب کچھ بتائیں گے تمہیں پھر میں کل آؤں گا رات تمہاری طرف اکٹھے ڈنر کریں گے، تمہاری خالہ بی کے ساتھ۔"

"فاقوں کا ڈنر۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اوہ سوری۔ یہ لو۔" انہیں جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو دراز کا لاک کھول کر انہوں نے ہزار ہزار کے نوٹوں کی پوری گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"پچیس تیس ہیں فی الحال کام چلاؤ۔" وہ سرسری لہجے میں بولے۔

"میں امداد لینے نہیں آئی آپ سے۔" اس نے نخوت سے نوٹ پرے دھکیل دیے۔

"سویٹ! تمہیں کسی نے امداد دے کر مرنا ہے۔ بلیومی، کہو تو کان پکڑ کر قسم کھا لوں۔" وہ ہنستے ہوئے اسے یقین دلانے لگے۔

"اس کے باوجود میں یہ نہیں لوں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں صرف بینک اکاؤنٹ کے اسٹیٹس کی بابت معلوم کرنے آئی ہوں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"اس کی وجہ تمہیں شمشاد صاحب سمجھائیں گے۔ اب پلیز یہ رکھ لو۔ مجھے میٹنگ سے دیر ہو رہی ہے، پھر بات کریں گے۔ کہا نا کل شام کو ڈنر اکٹھا کریں گے۔ باہر کہیں کرنا ہے تو بتا دو آج ہی ٹیبل ریزور کرا دیتا ہوں۔"

"سوری۔ اس کی ضرورت نہیں۔" وہ پرسوچ نظریں ان کے چہرے پر جما کر آہستگی سے بولی۔

"میں اپنی اسٹڈیز کنٹی نیو رکھنا چاہتی ہوں۔"

"ویری گڈ۔ چلو اس پر بھی کل بات کریں گے۔ اف یو ڈونٹ مائنڈ۔ آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔ پلیز۔" وہ اٹھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولے تو اس کے پاس اٹھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

راشد صاحب نے نوٹ اٹھا کر اسے تھمائے تو اس نے بے دلی سے پکڑتے ہوئے بیگ میں رکھ لیے اور کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل آئی۔

"انکل راشد کا رویہ ان کے انداز اور روپے دینے والی بات کچھ سمجھ نہیں آئی اور شمشاد انکل کیا بات کریں گے۔ میں کوئی ننھی بچی ہوں جو وہ مجھے کچھ سمجھانے آ رہے ہیں۔ یہ باتیں کوئی میتھس کے نیومیریکل ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں گے ان کی ہیلپ کے بغیر، راشد انکل نے جو بھی بات ہے خود سے کیوں نہیں کہہ دی بھلا، یہ کیا بات ہوئی!" وہ خود سے الجھتی گرد و پیش سے بے

خبرست قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکلی تھی۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کوئی اسے پوری طرح سے آبزرو کر رہا ہے اس کے لفٹ میں داخل ہوتے ہی وہ آفس میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ گولڈی کی طرف جانا چاہ رہی تھی مگر پھر بیگ میں موجود ان نوٹوں کا خیال آ گیا۔

اس کے بیگ میں پہلے بھی اتنے نہیں تو اس سے تھوڑے کم نوٹ اکثر ہی ہوا کرتے تھے اور وہ ہر جگہ بے دھڑک آیا جایا کرتی تھی۔ سال بھر سے پاپا نے اسے کریڈٹ کارڈ ایشو کروا دیے تھے، جو چند دن میں ہی خالی ہو جایا کرتے تھے۔ دوستوں پر لٹانے کے معاملے میں وہ بہت دریا دل واقع ہوئی تھی گولڈی اور بنٹی میں تو اس کی جان تھی۔ ایک شام تو اس نے دونوں کے ہمراہ محض ہلا گلا کے نام پر ساٹھ ہزار اڑا دیے تھے۔

اسے یاد تھا پہلی بار شاید پاپا نے اسے سخت الفاظ میں ٹوکا تھا۔

"ایما! ہمیشہ کڑے دِنوں کے لیے کچھ بچا رکھنے کی کوشش کرو۔"

اور اسے پاپا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ اس کے پاپا تو دریا دلی میں اس سے بھی دس نہیں کم از کم ساٹھ ہاتھ آگے تھے۔ ماما کی ذرا ذرا سی خوشی پر آج تک جس طرح وہ لاکھوں لٹاتے آئے تھے، اس کے گواہ اس کے بچپن سے لے کر شعور تک کے سارے محفوظ لمحات تھے۔ وہ پاپا جو کہتے تھے۔ "کھڑے پانیوں میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے کائی جم جاتی ہے اور ان پر مچھر اور گندے حشرات منڈلانے لگتے ہیں اسی طرح پیسے کو جمع رکھو تو وہ انسان کے ذہن ہی نہیں اس کی فطرت میں بھی سڑاند پیدا کرنے لگتا ہے، اور انسان خود تو تنگ دل ہوتا ہی ہے اس کے ارد گرد رہنے والے بھی اس کی بدبودار فطرت اور تعفن زدہ خیالات کا شکار ہو کر اس سے بھاگنے لگتے ہیں۔ ایسے جمع شدہ پیسے کا کیا فائدہ جو آپ کے حال کو غیر مطمئن پریشان، تنگ دل رکھے۔ محض مستقبل میں ان دیکھے مالی فائدے کے لیے آج کی ذرا ذرا سی خوشی کا گلا گھونٹ ڈالے۔"

پاپا، ماما کے یہی زریں اصول تھے جن پر انہوں نے ساری زندگی عمل کیا "آج" سے "لمحہ موجود" سے "حال" کے ایک ایک پل سے خوشی کشید کرنے کے لیے انہوں نے پیسوں کو ہاتھوں کے میل سے بھی کم اہمیت دی تھی۔ آخری دم تک دونوں کے لیے یہ پیسہ کاغذ کے بے جان ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ نہ انہوں نے کبھی اس کی پروا کی نہ اسے محسوس ہونے دیا کبھی کہ پیسہ زندگی کے لیے میل کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ بدن میں دوڑتے لہو کی مانند ہے اور جب زندگی کے بدن سے پیسے کے لہو کا آخری قطرہ بھی بہہ جاتا ہے تو پھر لاکھ اسے امیدوں، خواہشوں، آسوں کی

ڈرپ لگاؤ اس میں ایک قطرۂ جاں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

یہ اس کے موجود خیالات تھے جو آج کل رہ رہ کر اس کے ذہن کے نہ جانے کون سے پوشیدہ خانوں سے نکل نکل کر آ رہے تھے اور اسے حیران ہی نہیں پریشان کرتے جا رہے تھے۔

اور یہ ان ہی خیالات کا نتیجہ تھا جو وہ ان پیسوں کو احتیاط سے گھر میں محفوظ رکھنے کے لیے خیال سے فوراً گھر چلی آئی تھی۔

خالہ بی اپنا بیگ اور اٹیچی باندھ کر سارا سامان پیک کر چکی تھیں اور اس مصروفیت کے دوران بھی محض اس خیال سے کہ شاید وہ گھر آ جائے۔ انہوں نے اس کے لیے کچن کے کونوں کھدروں سے دال برآمد کر کے پکالی تھی۔

"خالہ بی! یہ کیا؟" وہ صبح جاتے ہوئے جو تلخ ترین الفاظ ان سے کہہ کر گئی تھی۔ اب قطعاً بھول چکی تھی۔ اب انہیں یوں سامان باندھے جانے کے لیے تیار بیٹھا دیکھ کر بھونچکی سی رہ گئی۔

"جا رہی ہوں میں دوپہر کی گاڑی سے، تم نے خود تو کہا ہے تمہیں نہ میری ضرورت ہے نہ پروا۔ تم اکیلے رہنے کی عادی ہو سو میرے بغیر بھی بخوبی رہ لوگی۔"

انہوں نے خفا سے لہجے میں تیز تیز کہا اور اٹھ کر وضو کرنے چل دیں۔

وہ جواب میں فوری طور پر انہیں کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

"کیا میں واقعی اب اکیلی رہ سکتی ہوں۔ اس اتنے بڑے محل نما گھر میں۔ جس میں اب کوئی ملازم بھی نہیں۔" اس نے خالہ کے جاتے ہی خود سے سوال کیا اور جواب...... جواب میں اس کے اندر کیسا ڈر بھرا سناٹا اس ویران محل نما گھر کے کونے کھدروں سے نکل کر اس کے دل میں بھر گیا تھا کہ وہ لحہ بھر کو سہم سی گئی۔

"کمال ہے۔ میں تو کبھی کسی چیز سے نہیں ڈری۔ عام لڑکیوں کی طرح کاکروچ، چھپکلی دوسرے بڑے بڑے ہاتھ بھر جتنے کیڑے مکوڑے، سانپ کسی سے بھی نہیں ڈری۔"

اسے یاد آیا جب گھوڑا گلی میں واقع اس نے بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں ہاتھ سے بھی لمبا سانپ نکل آیا تھا تو وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی اور بے حد آہستگی سے سرہانے پڑا انسائیکلوپیڈیا کا بھاری بھرکم والیوم اٹھا کر اس نے کارپٹ پر رینگتے اس سیاہ رنگ کے خوف ناک سانپ کے سر پر دے مارا تھا اور پھر لپک کر کمرے کے کونے میں لگے بڑے سے پتیل کے گملے کو اٹھا کر اس کے باقی تڑپتے دھڑ پر دے مارا تھا، بے چارے کا قیمہ ہی بن گیا تھا۔

مسز روبنسن کتنی خفا ہوئی تھیں اس پر کہ اگر اس کے اس ایڈونچر کے نتیجے میں سانپ بچ جاتا یا اس پر حملہ کر دیتا تو اس کے پیرنٹس کے سامنے کیا ایکسکیوز پیش کرتیں اور وارڈن بوائے جان

مسیح نے اس سانپ کا قیمہ اٹھاتے ہوئے بتایا تھا۔ یہ اس علاقے کا سب سے زہریلا سانپ تھا اور یہ سن کر بھی اسے ذرا ڈر نہ لگا تھا۔

"پھر اب میں کیوں ڈر گئی ہوں، کیوں ڈر رہی ہوں اکیلے رہنے کے خوف سے۔" اس نے الجھ کر خود سے سوال کیا تھا مگر اس ڈھیٹ ڈر وخوف نے مسکراتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر وہ کچھ کر رہی تھی، جس کا وہ زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

خالہ بی وضو کر کے باہر نکلیں تو وضو کے پانی سے نچڑتے بازو چہرہ پونچھے بغیر وہ جائے نماز لینے کے لیے ابھی ایک ہی قدم آگے بڑھی تھیں کہ یک بیک اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

"یہ کیا...... یہ کیا کیا تم نے؟"

وہ حیرت زدہ سی کمرے کے وسط میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔

ایمن نے ان کا آخری سوٹ الماری میں رکھتے ہوئے خالی بیگ اور اٹیچی کیس اٹھا کر الماری کے نچلے خانے میں رکھتے ہوئے الماری بند کر دی۔

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"مگر میں اب یہاں رکنا نہیں چاہتی۔ کیوں رکوں اور کس کے لیے۔" وہ اسی طرح روٹھے لہجے میں بولیں۔

"میرے لیے اور صرف میرے لیے۔" وہ آگے بڑھ کر ان کے کندھوں کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے پہلی بار ان سے محبت کا، لگاوٹ کا ایسا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تھی کہ پل بھر کو وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔

"اب کیسے میری ضرورت محسوس ہو گئی۔ بھلا میری حقیقت کیا ہے۔" وہ اس کے یوں گلے لگنے سے پگھل تو گئی تھیں مگر موڈ بہرحال ابھی بھی خوشگوار نہیں ہوا تھا۔

"خالہ بی! مجھے خود نہیں پتا مگر ابھی آپ کو میرے پاس رہنا ہوگا۔" وہ اسی طرح ان سے چمٹی بولی۔

"مگر چندا! تمہیں پتا ہے میں اور زیادہ دن نہیں رک سکتی۔ ایک عمر کے بعد تو میرے رب نے میری سنی ہے اور اس سال مجھے حج کرنے ضرور جانا ہے۔ اس مبارک دن کو گنتے گنتے میں نے کئی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ اللہ کا شکر اس نے مالی طور پر میرے بچے کو اتنا مستحکم کیا کہ وہ مجھے یہ سعادت نصیب کروانے کے لائق ہو سکا یہی نہیں بلکہ میرے ساتھ جانے پر بھی آمادہ ہے تو میں رک نہیں سکتی۔" وہ کہتے کہتے جیسے تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئیں تو وہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"خالہ بی! حج اب کون سا مہینوں سالوں میں ہوتا ہے مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی تو لگتا ہے آپ کر آئیں اتنے دن تو میں رہ ہی سکوں گی۔"

"اکیلی؟" بس یہی ایک لفظ تھا جو ہر بار رقیہ بیگم کے قدم پکڑ لیتا تھا۔

"خالہ بی! میں شروع سے اکیلی رہتی آئی ہوں پہلے بورڈنگ میں اور چھٹیوں میں ماما پاپا جب باہر جاتے تو مجھے ساتھ تو لے جاتے تھے اپنے تفریحی ٹور پر مگر اکثر ہوٹل چھوڑ جاتے۔ جہاں اپارٹمنٹ ہائر کیا ہوتا وہاں اپارٹمنٹ میں اور میں خود ہی اکثر باہر نکل جایا کرتی تھی پھر اس تنہائی نے مجھے دوسراہٹ کا لطیف احساس بخش تھا۔ میں اپنی تنہائی کے ساتھ خوش رہنے لگی۔ خود سے ساری باتیں کرتی، انجوائے کرتی۔ اکثر ماما پاپا میرے پاس بھی بیٹھے ہوتے تو میں ان کے پاس ہوتے ہوئے بھی کہیں اور ہی ہوتی۔ اس لیے مجھے آج بہن بھائی کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی مگر اب...... اب پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ......"

پتا نہیں کیسے اس کے حلق میں نمک سا گھل گیا۔

اسے یاد تھا وہ بہت کم روئی تھی اپنی زندگی میں، بلکہ اسے رونے سے نفرت تو نہیں کہہ سکتے، ہاں اسے رونا پسند نہیں تھا۔ اسے روئی روئی، اداس شکلوں سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ خود کسی بات پر اداس بھی ہوتی تو فوراً اس اداسی کو جھٹک کر تیز میوزک لگا لیتی۔ ڈانس کرتی۔ کوئی پسندیدہ مووی لگا لیتی۔ نہیں تو لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی اور بالآخر اس اداسی سے چھٹکارا پا لیتی اس نے شاید سب سے زیادہ آنسو ماما پاپا کے بچھڑنے پر بہائے تھے اور اب تو وہ کیفیت بھی اس کی طبیعت سے کچے رنگ کی طرح انہیں آنسوؤں کے ساتھ کہیں ڈھل چکی تھی۔

اسے وہ دونوں اب بہت کم یاد آتے تھے۔

اس اٹھارہ سالہ زندگی میں وہ ان کے پاس رہی ہی کتنا تھی۔ وہ خود ہی اپنی اس بھولنے کی وجہ گھڑتی۔

"خوف نے گھیر لیا ہے تجھے میری بچی! تو لاکھ خود کو لاپروا ظاہر کرے بظاہر خوش و مطمئن رہے، مگر اندر...... اندر خوف کا سانپ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے۔" خالہ بی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب خالہ بی! کیسا خوف؟" وہ قطعاً نہیں سمجھی اور ابھی چند منٹ پہلے تو وہ اپنے اس خوف کا تجزیہ کر رہی تھی۔

"تحفظ کا خوف غیر محفوظ ہو جانے کا خوف۔" وہ اسی طرح اس کا سر تھپکتے ہوئے بولیں۔

"ماں باپ سے بڑا کوئی تحفظ نہیں ہوتا پھر بیٹیوں کے لیے...... وہ دنیا کے جس کونے

میں بھی ہوتے تھے۔تم ان سے دور کہیں بھی ہوتی تھیں۔ان کی موجودگی تمہارے لیے سب سے بڑی ڈھارس تھی۔اب وہ ڈھارس چھین گئی ہے۔تمہیں پتا تھا۔کوئی انہونی ہو جائے تو تمہارے پیچھے بھاگنے والے پروا کرنے والے ماں باپ فوراً تمہاری فکر میں بھاگے چلے آئیں گے۔تمہیں کوئی دکھ کوئی پریشانی ہوگی تو تم فوراً ان سے کہہ کر اس مشکل اس پریشانی سے چھٹکارا پالو گی، وہ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے وہ تم سے دور ہوتے ہوئے بھی پاس تھے اور اب وہ تم سے اتنی دور چلے گئے ہیں کہ تمہیں تمہارے اندر کو اس کا احساس ہے کہ تم لاکھو چیخو چلاؤ گلا پھاڑو انہیں پکارو وہ آ نہیں سکتے۔اس لیے تمہارا اندر اپنے اس اکیلے پن سے خوف زدہ ہے۔''

وہ اس کا سر تھپک رہی تھی اور وہ آج پھر اتنے دنوں بعد چپکے چپکے رو رہی تھی۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کچھ حل سوچو۔اس تنہائی کا اکیلے پن کا، پڑھنا چاہتی ہو تو کہیں داخلہ لے کر ہوسٹل میں چلی جاؤ نہیں تو بہترین حل اس کا صرف ایک ہے۔'' وہ رکیں اس نے اس وقفے کو لحہ غنیمت جانا اور چپکے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔وہ نہیں چاہتی تھی خالہ بی اس کے آنسو دیکھیں۔

اور اسے پتا نہیں تھا خالہ بی کو بن دیکھے پتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

''شادی کر لو کسی اچھے دیکھے بھالے لڑکے سے۔اگر تمہاری نظر میں کوئی ہو تو...... وہ کیا نام لیتی ہو تم اس کا عجیب سادہ جو پپی بنا اکثر ادھر بھی آتا رہتا ہے اپنی بہن کے ساتھ۔'' وہ اب ان سے الگ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

''گولڈی کی بات کر رہی ہیں۔'' وہ اب جھک کر اپنے پیروں سے سینڈل اتارنے لگی۔

''ہاں وہی، دیکھو تو بھلا کیا نام ہوا نہ لڑکیوں جیسا نہ لڑکوں جیسا۔خیر کیا کرتا ہے وہ۔'' وہ سر ہلا کر بولیں۔

''کیا کرتا ہے وہی جو میں کرتی ہوں۔میرا مطلب ہے جو اس کی کلاس کے لڑکے کرتے ہیں۔'' وہ جوتے اتار کر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

''ایں! ابھی تک کم بخت اسکول میں پڑھتا ہے۔'' وہ چونکیں۔

''ارے!'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔''ارے بھولی خالہ بی! کلاس کا مطلب طبقہ جس طبقے سے وہ تعلق رکھتا ہے، اسے کچھ بھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔تعلیم ادھوری چھوڑ دی میری طرح اب فقط عیش مزے کرتا ہے۔''

''تو کم بخت یہ طبقہ کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟''

''خالہ بی! بہت بڑا بزنس ہے اس کے پاپا کا امپورٹ ایکسپورٹ کا اسے وہی تو

سنبھالتا ہے۔تھوڑے مہینوں تک ابھی اس کے پاپا نے اسے عیش کرنے کی چھٹی دے رکھی ہے۔''

''عیش کرنے کی چھٹی؟ نرالی باتیں سن رہی ہوں میں تو ادھر آکر زمانے سے مگر......'' وہ بڑبڑائیں۔''خیر چلو پھر تو اچھا ہے جو کاروبار ہے ان کا۔'' وہ جیسے مطمئن ہو گئیں۔

''خالہ بی! آپ نے نماز نہیں پڑھی؟'' اس نے انہیں یاد دلایا۔

''ہوں! پڑھتی ہوں۔تو وہ کیسا لڑکا ہے تمہارے خیال میں؟'' وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''میرا تو دوست ہے۔مجھے تو اچھا ہی لگتا ہے۔'' وہ تکیہ کھینچ کر نیم دراز ہو گئی۔

''دوست...... کمال ہے، لڑکوں سے دوستی۔'' وہ پھر اچنبھے میں پڑ گئیں۔''خیر دفع کرو ادھر کی تو ایسی عجیب باتیں ہیں، میں کیا اپنا دماغ پلپلا کروں۔تم سے شادی کرے گا وہ۔'' وہ ذرا جھجکتے ہوئے راز داری سے بولیں۔

''ایں!'' وہ اچھل ہی پڑی۔

''ایسا کیا انوکھا بول دیا میں نے؟'' وہ اس کی حیرت پر برا مان کر بولیں۔

''خالہ بی! آپ نے میری بات نہیں سنی۔دوست ہے وہ میرا اور بس۔'' پھر لیٹ کر ٹانگیں جھلانے لگی۔

''ارے دوست ہے تو کیا مردود نے کبھی شادی کرنی ہوئی تو کسی لڑکی سے ہی کرے گا نا تو تم کیوں نہیں۔'' خالہ بی تو اس کا نام کیا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔الرجی سے تھی انہیں گولڈی سے۔''ویسے تو اس سے کوئی لڑکی کیا ہی شادی کرے گی خود بنی بنائی لڑکی ہے، کانوں میں بالیاں، ٹاپس بالوں کی پونی کلائی میں چوڑی جب دیکھو پاؤڈر میں لتھڑا ہوا پتا نہیں کم بخت لڑکا ہے بھی یا نہیں۔'' وہ ان کی تشویش ناک بڑبڑاہٹ سے بیگانہ سیٹی پر کسی انگلش گانے کی دھن بجائے جا رہی تھی۔انہیں اور غصہ آ گیا۔

''کچھ بک رہی ہوں میں ایمن بی بی!'' انہوں نے اس کے جھولتے گھٹنوں کو زور سے ٹھوکا دیا۔

''پلیز خالہ بی! یہ مجھے بی بی وی بی نہ کہا کریں۔لگتا ہے، میں کوئی ستر سالہ بڑھیا ہوں۔ وہ بھی سن پچاس کی اور آپ یونہی سوچ سوچ کر ہلکان نہ ہوں گولڈی اگر کرنا بھی چاہے گا نا مجھ سے شادی تو میں اس سے ہرگز نہیں کروں گی کیونکہ ہی از اونلی مائی فرینڈ اور بس۔'' اس نے شولڈر بیگ گھسیٹا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ببل نکالنے لگی۔

''اب گھنٹہ بھر کے لیے اس کی جگالی کرتی رہنا اور فوراً پکڑ کر روک لیا مجھے۔اچھی بھلی

نکل جاتی میں آج ہی۔'' وہ پھر سے بڑبڑاتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اور خالہ بی! یہ لیں۔'' اسے بیگ پکڑتے یاد آیا کہ وہ گھر کیوں آئی تھی۔

''کیا ہے؟'' وہ بادل نخواستہ مڑی تھیں۔

اس نے نوٹ ان کی طرف بڑھائے۔

''کہاں سے آئے؟'' وہ نوٹ پکڑے بغیر تشویش سے بولیں۔

''ڈیئر خالہ بی! ان کے پاؤں نہیں ہیں کہ چل کر کہیں سے آجائیں۔ لے کر آئی ہوں۔''

''کہاں سے؟ وہی تو پوچھ رہی ہوں۔'' انہوں نے نوٹ پکڑتے ہوئے کچھ جھلا کر کہا۔

''راشد انکل سے۔''

''نہ وہ یہ خیرات، زکوٰۃ پر کیوں رکھے ہوئے ہے، ہمیں صاف حساب کتاب کیوں نہیں کرتا۔ کتنے ہیں؟'' وہ نوٹ گننے کے اشتیاق میں ایک بار پھر بیٹھ گئیں۔

''میں ...... میں نے ان سے کہا تھا۔ گن لیں۔ میں نے کاؤنٹ نہیں کیے تھے۔'' خالہ بی اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے انگوٹھے اور انگلی کو تھوک لگا لگا کر بڑے محتاط انداز میں نوٹ گننے لگیں۔

''شام کو شمشاد انکل آئیں گے۔'' اس نے انہیں مطلع کیا۔ انہوں نے سنا ہی نہیں۔ ان کا سارا دھیان نوٹوں کی گنتی کی طرف تھا۔

''اکتیس ہزار ہیں۔ تم ذرا ایک بار اور گن لو۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے نوٹ گن کر اس کی طرف بڑھائے۔

''اتنے ہی ہوں گے، رکھ دیں۔'' اس نے نوٹوں کی طرف دیکھے بغیر لاپروائی سے کہا۔

''پیسہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے، اس سے اس قدر لاپروائی اچھی نہیں۔ اب سب کچھ تو سر پر آپڑا ہے، طبیعت میں تھوڑی سوجھ بوجھ اور ذمہ داری پیدا کرو۔'' خالہ بی نے اسے دیکھتے ہوئے حسب عادت نصیحت کرنا ضروری سمجھا جسے وہ ان سنی کر کے اسی طرح چٹکیاں بجاتی رہی۔

''اور ہاں کیا کہہ رہی تھیں۔ کون آرہا ہے شام کو؟'' انہیں دروازے کے قریب پہنچ کر پھر یاد آگیا۔

''شمشاد انکل!''

''وہ کون ہے بھلا۔ یاد نہیں آرہا موا ایک بھی رشتہ حقیقی نہیں زمانے بھر کے انکل اور آنٹیاں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ مجھے اللہ جانے کیسے خالہ بی بلا لیتی ہو کون ہے یہ۔''

''پاپا کے بزنس ایڈوائزر ...... میرا مطلب ہے ان کے وکیل۔''

اس نے خالہ بی کے چہرے پر آئی الجھن کو پڑھتے ہوئے فوراً آسان لفظوں میں کہا۔

''کس لیے بھلا؟''

''پتا نہیں، راشد انکل کہہ رہے تھے کچھ سمجھائیں گے۔ معلوم نہیں کیا؟''

وہ دانت بھینچ کر کچھ کہتے کہتے رہ گئیں۔ ان کے ماتھے پر البتہ شکن سی ابھر آئی تھی۔

کچھ دیر یونہی کھڑی رہیں پھر باہر نکل گئیں۔

''ابھی گولڈی کی طرف بھی چلنا ہے، اس کمینے سے اپنا موبائل تو لے کر آؤں۔ گھٹیا حرکتوں پر اتر آیا ہے۔ کل ذرا فیول کیا ختم ہوگیا میرے بیلنس پر رال ٹپکا بیٹھا اور جو میں کھڑے کھڑے ہزاروں کا فیول ڈلوا دیتی تھی۔ پارٹیاں ٹریٹ اور نہ جانے کیا کیا...... اور اپنی باری کیسے بے دید ہوا آج پوچھوں گی ذرا جا کر......''

اسے ایک دم سے گولڈی کا کل والا بے لحاظ رویہ اور اکھڑے سے انداز یاد آئے جب اس نے گاڑی کا پیٹرول ختم دیکھا تھا۔

''خالہ بی ٹھیک کہتی ہیں شاید۔ پیسہ اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کیا دوستی سے بھی بڑھ کر؟'' اس کا ہلنا جلنا موقوف ہو چکا تھا۔

اس کا ذہن کوئی نئی بات سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

جس وقت وہ گولڈی اور بنٹی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ان کی کاک ٹیل پارٹی اپنے جوبن پر تھی۔

''ہائے ایما! اتنی دیر سے ...... اوہ میں بھول گئی یہ بھی تو فیشن ہے آج کل کا۔ یوں پارٹی میں دیر سے آکر سب کی توجہ کا مرکز بننا۔'' بنٹی کی کزن روما نے اسے گلے لگا کر دونوں گالوں پر ہلکے سے کِس کرتے ہوئے بڑی ادا سے کہا تھا کہ اردگرد ناچتے پھڑکتے تینوں چاروں جوڑے سن لیں۔

گولڈی کسی اجنبی لڑکی کے ساتھ بڑے ہلکے قدموں کے ساتھ تھرک رہا تھا۔

''ڈانس پروگرام وہ بھی دن میں۔ یہ کیا نیا فیشن ہے۔'' اسے ڈانس تو بڑا اچھا آتا تھا مگر اس وقت قطعاً موڈ نہیں تھا اسے لیے پیچھے پڑے صوفے پر گرتے ہوئے بولی۔

''او ڈل لڑکی، اٹھو پلیز جوائن اس۔'' گولڈی نے دور سے ہاتھ ہلایا۔

اس کی سلیقے سے بندھی پونی اور کانوں میں پڑی بالیاں اس کے قدموں کی ہر جنبش کے ساتھ ہل رہی تھیں۔ ایمن کو ایک دم سے خالہ بی کے کمنٹس یاد آگئے تو لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کیا چلے گا۔ بڑی لائٹ "چیز" ہے، بالکل نشہ نہیں ہوتا ٹیسٹ کر کے دیکھو۔ گولڈی کے بیسٹ فرینڈ رامیش نے بھجوائی ہے دبئی سے۔"

بنٹی نے کرسٹل کے چھوٹے سے جام میں مشروب انڈیل کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اوں سوری! مجھے تو اس کی سمیل سے ہی وومیٹ ہونے لگتی ہے، ابھی یوں بھی پیاس نہیں۔" وہ کبھی کبھار دوستوں کے بیچ ان کے بے حد اصرار پر پی لیا کرتی تھی مگر آج تو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سو اس نے صاف منع کر دیا۔

"اے بدذوق لڑکی! ایک تو مقررہ ٹائم سے پورے دو گھنٹے لیٹ آئی ہو۔ اوپر سے ایسے نخرے۔ چلو چڑھاؤ اسے اور ذرا میرا ساتھ دو۔"

انگلش میوزک کی دھمک اور شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ گولڈی دو تین لوگوں کو پھلانگتا اس تک آیا تھا اور زبردستی مشروب کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

واقعی اس مشروب کا ٹیسٹ بے حد مختلف تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چار بڑے بڑے گھونٹ بھر گئی۔

"کم آن!" گولڈی اسی طرح زبردستی کیا کرتا تھا۔ اسے کھینچتا ہوا سب کے درمیان لے آیا۔

"اس سے ملو مائی بیسٹ فرینڈ۔ ایما اور ایما یہ عینی ہے۔ عنم کل ہی دبئی سے آئی ہیں۔ میری آنٹی کی اکلوتی بیٹی ہم جب بھی دبئی جائیں تو یہ ہمارے مزے کراتی ہے، اور اب ہم نے اس کے سارے قرض اتارنے ہیں بمعہ سود کے اور تم ہمارا پورا پورا ساتھ دو گی۔ پرامس؟"

اس نے ایما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے زور سے جھٹکا دیا تھا۔ عینی نے مسکرا کر پیچھے کھڑے فواد کی طرف دیکھا جو کافی دیر سے اس کا منتظر تھا۔

بنٹی نے ٹریک بدل دیا۔ راک اینڈ رول کے تیز شور میں کس طرح اس کے قدم گولڈی کے ساتھ اٹھتے چلے گئے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اس کا پھول سا ہلکا بدن ایک ایک اسٹیپ پر کیسے خم کھاتا لچکتا کہ وہ کئی بار گولڈی کے سینے سے جا لگی اور اسے احساس تک نہیں ہوا۔ یہ شاید اسی مشروب کا اثر تھا جس کا اثر ایسا ہلکا ایسا لطیف سا تھا کہ ہلکی ہلکی سی غنودگی اسے اپنے دل و دماغ پر کسی نشے کی طرح طاری ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ٹریک ختم ہونے سے ہی پہلے نڈھال ہو کر صوفے پر گر گئی۔

گولڈی بھی اس کے ساتھ ہی آ گرا تھا۔

اس نے اپنا سر ایمن کے شانے پر رکھ دیا تھا اور دونوں آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

"آج کیا ہوا۔ آج اتنی جلدی کیسے تھک گئیں؟" گہری سانسوں کے درمیان گولڈی پوچھ رہا تھا۔ اس کا سر لڑھکتا ہوا اس کے شانے سے نیچے ڈھلک گیا تھا۔

ایمن ذہنی طور پر نیم غنودہ سی تھی مگر اس نے فوراً اس "لڑھکن" کو نوٹ کیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

"ایں کیا ہوا۔" گولڈی نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے یوں سیدھے ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"تم دونوں اتنی جلدی تھک گئے۔" ٹی صوفے کی ہتھی پر آ کر ٹک گئی۔

"عینی! ادھر آؤ۔" بیٹھتے ہی اس نے عینی کو آواز لگائی تھی جو فواد کے ساتھ باتوں میں مگن تھی۔

عینی گولڈی کے پاس آ کر بیٹھ گئی، وہ ذرا سا سیدھا ہوا مگر ٹانگیں اسی طرح سامنے کو پھیلی ہوئی تھیں اور بازو چپوؤں کی طرح اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے۔

"فواد کے پاپا انکم ٹیکس آفیسر ہیں، دبئی آتے جاتے رہتے ہیں۔" بنٹی نے عینی کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

"میں جانتی ہوں اور یہ تین سال ادھر رہے بھی ہیں۔ میری اور فواد کی کلاسز تو الگ تھیں مگر اسکول ایک ہی تھا بیچ میں کچھ عرصہ ہمارے درمیان کانٹیکٹ نہیں رہا مگر آج کل خوب چیٹنگ چل رہی ہے۔"

عینی نے تفصیل سے فواد کے متعلق معلومات سے آگاہ کیا تھا۔ بنٹی پل بھر کو چپ سی ہو کر گولڈی کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھئی۔ آج شام کا کیا پروگرام ہے؟" گولڈی نے مزید ٹانگیں اور بازو پھیلاتے ہوئے عینی کو ان کے گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔

"اوں ادھر تو کوئی خاص پوائنٹ ہی نہیں ہے۔ سی ویو بھی نہیں۔ میں تو دو دن میں بور ہو گئی ہوں۔" عینی ناک چڑھا کر بولی۔

"کیا کریں اور پھر ہماری حالت زار کو دیکھو جو اس چھوٹے سے کنوئیں میں ٹراتے بھی ہیں اور انجوائے بھی کرتے ہیں۔" گولڈی نے بگلے کی طرح گردن زور سے جھٹکتے ہوئے رخ عینی کی طرف کیا تھا۔

"آؤ ایما! تمہیں اپنی آنٹ سے ملواؤں۔ ان دونوں کی تو اب خوب چونچ لڑے گی۔ بہت گریس فل ہیں میری آنٹ فردوس فری آنٹی کہتے ہیں ہم انہیں۔ ملو گی تو فریش ہو جاؤ گی۔ ایسی خوشگوار کمپنی ہوتی ہے ان کی۔" بنٹی اسے گھسیٹتی ہوئی اپنی آنٹ کی خوبیاں بیان کرتی سٹنگ روم میں لے آئی۔

''ادر پتا ہے ایک اور چکر بھی ہے، وہ میں تمہیں آنٹ سے ملوانے کے بعد بتاؤں گی۔''

اس نے سٹنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

اس کی آنٹ یقیناً بہت خوش مذاق، اچھی طبیعت کی ہوں گی مگر اس وقت وہ قطعی فریش نہیں لگ رہی تھیں تھوڑے خراب موڈ کے ساتھ انہوں نے بڑے تیکھے چتون لیے ایمن کا تعارف حاصل کیا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر ادھر ہی بیٹھی رہیں۔ بنٹی اِدھر اُدھر کی فضول گوسپ ہانکتی رہی نہ اس کی آنٹ متوجہ تھیں نہ ایمن۔

اس کی فری آنٹی ابھی تک نائٹ گاؤن میں تھیں بلیک سلور ریشمی گاؤن سے چھلکتا ان کا چاندی سا بدن یقیناً بہت اسمارٹ بہت سلم تھا۔ وہ خود بھی بیلف کرومنگ کا بہترین شاہکار دکھائی دے رہی تھیں۔ گاؤن کے ساتھ بھی ان کا میک اپ بالکل فریش تھا۔

''تم لوگوں کا شام کا کوئی پروگرام تو نہیں؟'' وہ دونوں بور ہو کر اٹھ رہی تھیں جب انہوں نے اپنے نیل فائل کرتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا تھا۔

''ابھی تو کوئی خاص نہیں، تھوڑی دیر تک شاید بن جائے۔'' بنٹی نے ہی جواب دیا تھا۔

''بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج رات کو فیملی پروگرام ہے تمہارے انکل بھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔ کچھ فیملی گیسٹ بھی اس لیے آج تم تینوں کوئی اور پروگرام نہ رکھنا اپنے فرینڈز کو شام تک چلتا کرنا۔ او کے۔''

بنٹی کی ماما اندر آئی تھیں۔ سرخ باریک شیفون کے سادہ سوٹ میں ان کا حسن فری آنٹی کی جوانی کو بھی مات کر رہا تھا۔ لائٹ میک اپ کے ساتھ سرخ رنگے ہوئے ریشمی بال ہلکے سے جوڑے میں قید تیز خوشبو کے ساتھ وہ کتنی اٹریکٹو کتنی فریش لگ رہی تھیں۔ ایمن کی نگاہوں میں چھم سی اپنی ماما آ گئیں۔

اس نے بچپن سے بلکہ شعور کی آنکھ کھلنے سے بھی پہلے کبھی اپنی ماما کو رف حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح کھلی کھلی تر و تازہ اور خوشبودار ہوتی تھیں کہ جس جگہ سے گزرتیں، ایک خوشبو بھرا جھونکا اس جگہ پر ٹھہرا کتنی دیر تک سانس لیتا رہتا تھا۔ ان کی کمپنی میں چند منٹ گزارنے والا بھی ان کی خوشبودار مہکی مہکی رفاقت کو مدتوں یاد رکھتا تھا اسی لیے تو پاپا...... بقول خالہ بی کے ساری عمر پاگل ہوئے رہے ان کی محبت میں۔ محبت کیا تھی، دیوانگی تھی اور اسی دیوانگی میں عمر تمام ہوئی کہ آخری سانسوں تک دونوں ساتھ ساتھ۔

''چلو نا!'' بنٹی نے اس کا ہاتھ کھینچا تھا۔ اس کی فری آنٹی اور ماما اب کارڈلیس ہاتھ میں

لیے نہ جانے کون سی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔

اور وہ کھوئی کھوئی سی کھڑی ان دونوں کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ ان کو نہیں کسی اور کو مجسم دیکھ رہی تھی۔

''یار! تم کچھ عجیب سی نہیں ہوتی جا رہیں۔ کھوئی کھوئی الجھی پریشان صورت آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟'' بنٹی اسے رستہ بھر بھی بولتی آ رہی تھی۔

''نہیں یار! تمہارا وہم ہے بس یونہی......''

''یونہی کیا؟'' اور وہ جواب میں کہہ ہی نہ سکی۔ اسے ماما یاد آئی تھیں۔

اس نے ماما، پاپا کی دل میں چھپی ڈھیر ساری محبت کو دل کے ایسے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا کہ ان کو ان کی زندگی میں پتا چل سکا اور نہ ان کی موت کے بعد اس نے اس خفیہ محبت کو کسی پر ظاہر ہونے دیا تھا۔

''اچھا اب تم شام بلکہ رات تک ادھر ہی رکو گی۔ ماما نے باہر جانے پر تو بین لگا دیا ہے۔ ڈنر کر کے جانا۔'' بنٹی نے پرخلوص لہجے میں گویا اسے انوائٹ کیا تھا اور وہ شاید پہلے کی طرح فوراً مان بھی جاتی جو اس نے بنٹی کی ماما کے منہ سے بصد اصرار فیملی ڈنر اور فیملی گیسٹ کی تکرار نہ سنی ہوتی۔

''آج نہیں یار! آج مجھے...... اصل میں پاپا کے دوست شمشاد انکل ڈنر پر آ رہے ہیں اور خالہ بی نے مجھے سختی سے کہا تھا کہ رات سے پہلے گھر پہنچ جاؤں، کل سہی۔'' اس نے بڑی سہولت سے منع کر دیا۔

''ایک تو تمہاری خالہ بھی ایمان سے کسی عجائب گھر کا تحفہ ہی لگتی ہے اینٹک آکشن میں رکھو تو دیکھنا کیا ان کی بولی لگتی ہے۔''

بنٹی ہنستے ہوئے بولی تو اسے پہلی بار بنٹی کی ایسی بے تکلف ہنسی زہر لگی، اور خالہ بی کے بارے میں ایسے کمنٹس...... شاید کل شام تک اس کے بھی یہی خیالات تھے آج صبح تک بھی...... اگر وہ سامان باندھ کر جانے کو تیار نہ ہوتیں۔

''انہیں میرا اتنا خیال تو ہے اور یہ بنٹی گولڈی ان کے ماما پاپا جن سے ہمارے فیملی ٹرمز تھے۔ کبھی انہوں نے ماما پاپا کے جانے کے بعد میرے حالات جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کیسے رہ رہی ہوں۔ کل شام کو معمولی سی بات پر ایک فیول ختم ہونے پر گولڈی کا روکھا رویہ اور سرد اجنبی نگاہیں...... کیا اس وقت اس نے ایک پل کو بھی سوچنے کی زحمت کی ہوگی کہ فیول ختم ہونے کے باوجود میں نے ڈلوایا کیوں نہیں۔ یقیناً میرے پاس پیسے نہیں ہوں گے ورنہ ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت تو پہلے میں نے کبھی نہیں دیا مگر اس نے تو ایک لمحے کے لیے بھی غور نہیں کیا تو یہ کیسی دوستی ہے؟''

ڈرائنگ روم میں وہی ہڑبونگ مچی تھی۔

اب میوزک سننے کے ساتھ کھانے پینے بلکہ پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔ ڈرائنگ روم سے کیسی گندی بو آنا شروع ہوگئی تھی۔ گولڈی اور مانی سگریٹ پی رہے تھے جبکہ فواد سگار پی رہا تھا۔ اسے یہ سگار کی لت بھی چند دن ہوئے لگی تھی شاید اس دن سے جب اس کے پاپا نے Cuba کے ان سگاروں کا بریف کیس اپنی کسٹڈی میں لیا تھا۔

یہ سارے جتنے بھی اس ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں ان کے پیرنٹس حرام حلال سب کما کر بے دردی سے ان پر لٹا رہے ہیں بلکہ بے دردی سے لٹانے میں یہ اپنے پیرنٹس سے بھی کئی ہاتھ آگے ہیں اور اس لمحے انہیں ایک پل کو بھی یہ احساس ہو جائے کہ ان کی یہ سب عیاشیاں ائیر کریش میں فنا ہونے والی ہیں تو کیا یہ اس طرح عیش و مستی میں ڈوبے رہیں گے جیسے کل تک میں بھی ان کے ساتھ......''

''آج رات میری تو گیسٹ روم میں بکنگ ہے۔ بھوربن میں، سویارا! میں تو نکل رہا ہوں میری ایک گھنٹے بعد فلائٹ ہے۔ دو دن بعد ملیں گے۔ شیلا بھی میرے ساتھ ہی آئے گی۔ او کے ٹیک کیئر بائے۔'' مانی ہاتھ ہلاتا ڈولتا باہر نکل گیا تھا۔

''او کے بنٹی! میں بھی چلتی ہوں پانچ تو بجنے کو ہیں۔'' پہلی بار یہاں آنے کے بعد اس نے ٹائم دیکھا تھا ورنہ اس گھر میں بنٹی اور گولڈی کی کمپنی میں آنے کے بعد اسے کبھی ٹائم دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

گولڈی، عینی کے ساتھ سر جوڑے نہ جانے کون سی باتوں میں گم تھا دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ آپس میں جکڑ رکھے تھے۔

''ہوں ابھی کچھ دیر تو رکو۔'' بنٹی نے شاید سرسری لہجے میں رسماً ہی کہا تھا'' اور کچھ کھا تو لو۔ ابھی انہوں نے پزاہٹ سے پزا منگوایا ہے۔ ڈلیوری آئی ہوگی۔''

''نو تھینکس مجھے دیر ہو جائے گی۔ یوں بھی مجھے کیب سے جانا ہے۔''

''کیوں تمہاری گاڑی کہاں گئی۔ اوہ ہاں کل بھی تم گولڈی کی گاڑی سے گئی تھیں۔'' پتا نہیں اس نے طنز کیا تھا یا یونہی شوخی سے کہا تھا مگر ایمن کے دل میں کچھ تڑخا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں گاڑی خراب ہے۔ اس لیے گیراج میں بھجوا رکھی ہے۔''

''بھئی تو ٹھیک کراؤ نا اب اس طرح روز روز کیب سے آنا کیا اچھا لگتا ہے۔ اچھا رکو میں گولڈی سے کہتی ہوں، تمہیں ڈراپ کر آئے۔''

نہ جانے کیسے اسے خیال آ گیا تھا۔ وہ گولڈی سے پوچھنے چل دی اور وہ تو خود گولڈی کو

بلوانے والی تھی جس کام کے لیے وہ آئی تھی۔ ابھی تک اس نے ایمن کا سیل فون واپس نہیں کیا تھا۔

''او کم آن سیلی پرنس! یار رکو ابھی۔ رات کو چلی جانا۔ ابھی تو محفل رنگ پر آنی ہے۔ سمیر اور فضہ آنے والے ہیں تم بھی رکو۔'' گولڈی آتے ہی اسے کندھوں سے پکڑ کر اندر کھینچنے لگا۔

''نہیں گولڈی! مجھے آج جلدی جانا ہے۔ کام ہے۔'' اس کے لبوں سے یہی نکل سکا پتا نہیں آج کیوں اس محفل میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا۔ یہاں سے بھاگ جائے کہیں دور۔

''مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' اپنی فیلنگز سے اسے خود بھی الجھن ہو رہی تھی۔

''کام...... ہاہاہا......'' وہ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ ''فرینڈز آج کی بریکنگ نیوز ایما کو کام ہے۔ ہاؤ فنی ایما! یو آر جوکنگ'' وہ پاگلوں کی طرح کبھی ایما کے اور کبھی پاس کھڑی بنٹی کے کندھوں پر ہاتھ مارتا ہنستا چلا گیا۔ اس کے منہ سے بو کے بھبکے آ رہے تھے۔

''اچھا بس بھی کرو اب اور ذرا ایمان کو ڈراپ کر آؤ۔''

بنٹی اس کی بے تکی نان اسٹاپ ہنسی سے جی بھر کر بیزار ہوئی تھی اپنی سیلولیس شرٹ کو کمر کے پہلوؤں پر نیچے کھینچتے ہوئے بے نیازی سے اندر چلی گئی۔

''اب تم چلو گے مجھے ڈراپ کرنے یا نہیں؟'' ایما نے اسے دیکھ کر کچھ اکتاہٹ سے پوچھا۔ وہ اب اپنی آنکھوں میں آئے پانی کو ٹشو سے پونچھ رہا تھا۔

''او کے چلو۔'' اس نے ایمن پر احسان عظیم کیا۔

یہ دیکھے بغیر کہ عینی اسے کس طیش کے عالم میں گھور رہی تھی کہ اس کی ناگواری کو پاس آ کر بیٹھتی بنٹی نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔

اس نے عینی کی شعلہ بار نگاہوں کا تعاقب کیا اور اسے سب سمجھ میں آ گیا۔

وہ دونوں جا چکے تھے۔

''گولڈی! ایک تو میرا سیل واپس کرو، دوسرے راستے میں جاتے ہوئے ذرا گیراج سے ہوتے چلو پتا تو کروں گاڑی کا کیا بنا۔'' گھر سے نکلنے سے پہلے ہی اس نے کہا تھا۔

''بڑی کمینی ہو، میں نے تو سوچا۔ تم نے وہ سیل مجھے گفٹ کر دیا۔''

''بڑے کمینے تو تم ہو۔ جو فیول کے بدلے بیلنس لے لیا...... اور یہ میں تمہیں گفٹ کس خوشی میں دوں گی بھلا؟''

''ایز اے ٹوکن آف لو اینڈ فرینڈ شپ۔''

''اچھی فرینڈ شپ ہے کہ ذرا سا پٹرول کیا خرچ ہو گیا۔ تم نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں

اور میرا......"

"ارے یار! تم مائنڈ کر گئیں۔ ایمان سے واقعی مجھے بیلنس کی ضرورت تھی۔ سمجھا کرو نا، للی کی مسڈ کالز نے ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ فیول تم اڑا آئیں اور کوئی گاڑی تھی نہیں کسی سرونٹ سے کارڈ منگواتا تو دو گھنٹے لگ جانے تھے اور میں...... اف تمہیں نہیں پتا للی کیا ہے۔ ایک پل چین نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس سے کانٹیکٹ کروں اور تم برا مان گئیں۔"

وہ بھونڈی صفائی دیتے ہوئے بولا اور نہ ایمن کو یاد تھا جس لہجے اور انداز میں اس نے کل بات کی تھی اس میں فیول برباد ہونے کا شاک زیادہ تھا۔ للی سے بات کرنے کی بے تابی کم، بلکہ اسے پکا یقین تھا گولڈی نے اس کا سیل محض انتقاماً لیا تھا۔

"لو پکڑو کتنی گھٹیا ہوگئی ہو تم۔" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سیل ایمن کی گود میں پٹخا۔

ایمن نے مزید کچھ نہیں کہا۔

"گاڑی تو ٹھیک ہوگئی ہے لے جانا چاہیں تو ابھی لے جائیں۔" گیراج والے انکل اسے دیکھتے ہی لپک کر آئے تھے۔

"یہ بل بنا ہے۔" انہوں نے بل اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"پینتیس ہزار روپے۔" بل پر نظر پڑتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ گولڈی لاپروائی سے اپنے چہرے پر آتی بالوں کی لٹوں سے کھیلتا گاڑی میں چلتے میوزک کی دھن پر سیٹی بجاتا ٹانگیں ہلاتا بالکل اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"بل تو آپ نے بہت زیادہ بنا دیا۔" اس نے دبے لہجے میں کہا۔

"او جی جو کنڈیشن تھی گاڑی کی بل پچاس ہزار کا بھی بن سکتا تھا۔ انجن تو خلاص ہوا پڑا تھا اور بیٹری وہ اپن......" پروفیشنل لہجے میں تیز تیز بتانے لگا۔

"او کے میں کل آ کر گاڑی لے جاؤں گی۔ تھینک یو۔" اس نے اکتا کر اس کی پوری بات سنے بغیر بل لپیٹا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"اتنا بل...... اور خالہ جی بتا رہی تھیں اکتیس ہزار ہیں تو اس میں کیا بنے گا...... اب تو شمشاد انکل سے میٹنگ ناگزیر ہوگئی ہے۔"

پہلی بار وہ فکر مند ہوئی تھی اور پہلی بار اسے احساس ہوا تھا خالہ جی کی بات کتنی سچی ہے۔

"منی Survival کے لیے کتنی ضروری ہے اس گولڈی کو پتا چل جائے ابھی کہ میں خدانخواستہ قلاش ہو چکی ہوں تو کیا وہ اسی فرینڈلی رویے کے ساتھ مجھ سے بات کر سکے گا۔"

"اے کدھر گم ہوگئیں۔ انکل نے کیا لو لیٹر دے دیا تھا جو افلاطون کی طرح سوچوں کے

سمندر میں غوطے کھانے لگیں۔"

گولڈی نے چٹکی بجا کر اسے متوجہ کیا تو وہ زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگی

☆☆☆

انکل شمشاد کی آمد کے خیال سے خالہ بی نے ساتھ والے انکل فیروز کے بٹلر کو بلوا کر دو اسپیشل ڈشز بنوالی تھیں اور میٹھے میں ٹرائفل۔

"ایسے کوئی کب تک کسی کے کام کرتا ہے۔ چلو گھر کے بجائے کام تو میں خود جیسے تیسے ہائے وائے کرتے کر ہی لیتی ہوں مگر اتنے بڑے گھر کی صفائی تو مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ کرنے کو تو کر لیتی مگر ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں جب سے وہ کلثوم اور اس کے ساتھ والی مائی دفعان ہوئی ہیں گھر کی ڈھنگ سے صفائی نہیں ہو سکی۔ اب بھی یہ موا باورچی سو نخرے کر کے آیا پھر بھی کام پڑ سکتا ہے یہی سوچ کر اب جاتے ہوئے تھوڑی مٹھی گرم کر دی، پر منحوس کے منہ پر رونق نہیں آئی۔ سڑی بوتھی بنا کر گیا جیسے ہم پہ کوئی احسان کر کے گیا ہو۔ ایمن بیٹی! سچی کہوں اس طرح زندگی نہیں بنے گی یا تو تم کچھ کام دھام سیکھو۔ کوئی کھانا ہانڈی چولہا صفائی ستھرائی یا پھر کوئی ملازم رکھو۔ بھئی میں صاف کہے دے رہی ہوں۔ تم نے روک تو لیا ہے پر میں مہینے سے زیادہ نہیں رکوں گی۔ ایک نہیں کئی مجبوریاں ہیں میری بھی یا تم میرے ساتھ چلی چلو۔ خوشی خوشی لے چلوں گی۔" ان کی تان انہیں باتوں پر اور اس آخری دل جلے مشورے پر آ کر ٹوٹتی تھی جسے سن کر وہ اکثر ہی آگ بگولہ ہو جایا کرتی تھی۔

مگر آج تو سارے کام ہی الٹے ہو رہے تھے۔ اسے ذرا سا بھی طیش نہیں آیا۔

یونہی ریموٹ ہاتھ میں لیے چینل پر چینل بدلتی گئی۔

"اٹھ کر نہا دھو کر کوئی انسانوں والا لباس ہی پہن لو یہ موئی تنگ موہری کا پاجامہ اور بنیان ہر وقت چڑھائے پھرتی ہو گھر میں بھی باہر بھی...... اب یہ تو تمہارے ابا کے جاننے والے ہیں۔ کیا اچھا لگے گا ان کے سامنے ایسے منگتوں والے حلیے میں آنا۔ کیا سمجھیں گے وہ بھلا؟" وہ دو گھڑی چپ نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ یہ ان کی مجبوری تھی اور وہ تو شاید ان کے دس بار کہنے پر بھی کبھی چینج کرنے نہ اٹھتی کہ خالہ بی کے منگتوں والے حلیے نے اسے جیسے کسی زہریلے کیڑے کی طرح ڈنک مارا تھا۔

وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی سوچتی رہی پھر ریموٹ پھینک کر چلی گئی۔

"یا وحشت اب بھلا کیا ہوا اسے، اور گم صم ایسی ہے کہ دل ڈرنے لگا ہے میرا۔ ایسی چپ گڑوپ تو ماں باپ کے مرنے پر نہیں ہوئی تھی نہ جانے کیا سوچے جا رہی ہے۔ کچھ بتاتی بھی نہیں۔ بھئی صاف بات ہم ٹھہرے مڈل کلاس غریب غربا۔ ان بڑے لوگوں کی زندگیوں کے ڈھنگ ہی الگ ہیں سوچنے کے رنگ بھی نرالے ہوتے ہیں۔ اسے ہے۔ کیا ہاتھ بھر کی بڑی بچی اور ایسی قیامت

سی افتاد کہ اسے خود بھی اس کی سنگینی کا احساس نہیں۔ میرے اللہ تو ہی رحم کر۔'' انہوں نے مٹھی میں پکڑی تسبیح کھولی اور سر بٹھا کر اللہ کا رحم مانگتی تسبیح کے دانے گھمانے لگیں۔

دوسرا لمحہ ان کے لیے اچھا خاصا حیران کن تھا۔

وہ ڈارک براؤن اور بلیک کلر کے بڑے اسٹائلش شلوار سوٹ میں گیلے بالوں کو برش کرتی چلی آرہی تھی۔

لمحہ بھر کو تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے تسبیح کرنے لگیں۔

''ہاہ! یہ زندگی کے سانحے۔ بڑا ہو بچہ ہو بادشاہ ہو یا ملنگ ہر کسی کے کس بل نکال دیتی ہے، ایمن بی بی کیا چیز ہے۔''

''یہ شمشاد موا آئے گا بھی یا یونہی اس راشد انکل نے لارا لگایا۔ ذرا فون کر کے پوچھو۔''

''میرے پاس ان کا نمبر نہیں۔'' وہ خود بھی اکتائی ہوئی تھی اس فضول انتظار سے۔

''اے اس راشد انکل کا تو ہوگا۔ اس سے پتا کرو۔'' ان کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''وہ کہہ رہے ہیں شمشاد انکل دس بجے کے قریب آئیں گے۔ ہم لوگ ڈنر پر ان کا انتظار نہ کریں۔ چلیں خالہ بی کھانا کھا لیتے ہیں۔ اٹھیں۔''

وہ بیزار سی اندر آ کر بتا رہی تھی یوں بھی اسے خاصی بھوک لگ رہی تھی، شام کو بھی بس تھوڑی سی چاٹ لی تھی۔

''لو حد ہوگئی۔ لوگوں کی غیر ذمہ داری کی۔ اللہ کے بندے کھانے پر نہیں آنا تو کہلوا بھیج۔ اگلوں کا رزق کیا فالتو آیا ہے کہ تیرے لیے پکوان پکا کر برباد کرتے پھریں اور اس منحوس باورچی کی بارہ بجاتی شکل بھی بھگتنی پڑی جیب الگ گرم کرنی پڑی ہم نے خود ہی کھانا تھا تو سادہ کچھ بھی پکا لیتی میں اب چار پیسے آئے ہیں اس طرح تو نہیں اڑاتے، پھر اللہ جانے کب روپوں کی شکل نظر آئے۔''

وہ کھانا کھانے کے دوران بھی مسلسل بڑبڑاتی رہیں۔ ایمن چپ چاپ کھانا کھاتی رہی۔

اتنی اداس ایسی اکیلی سی شام اس نے کب گزاری تھی جیسے ہی دوپہر کی دھوپ نرم شام میں ڈھلنے لگتی اس کے قدم خود بخود باہر کی طرف بڑھ جایا کرتے تھے۔

دوسرے گاڑی کی لاچاری، وہ تو پندرہ سال کی عمر سے ڈرائیو کر رہی تھی کبھی گاڑی کے بغیر رہی نہیں تھی، اور اب ایک سرپھری سنکی بڑھیا کے ساتھ اسے شامیں بتانی پڑ رہی تھیں۔

اپنے ہی اوپر بے تحاشا ترس بھی آرہا تھا اور غصہ بھی۔

آخر وہ گھر میں کیوں بیٹھی ہے۔ پچیس چھبیس ہزار دے کر گاڑی لے آتی اور کسی بھی

فاسٹ فوڈ کارنر پر جا کر کسی بھی اپنے جیسے منچلے زندہ دل دوست کے ساتھ مزے کیوں نہیں کرتی؟

آخر کون سی زنجیر نے اسے باندھ لیا تھا؟

انکل شمشاد کی آمد سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر؟

''کچھ پتا نہیں اس گھر کے کاغذات کدھر ہیں۔'' خالہ بھی مسلسل بول رہی تھیں اب تو اس کے کان کچھ سن بھی نہیں رہے تھے۔ اس جملے سے چونک گئی۔

''کون سے کاغذ؟'' وہ ناگواری سے بولی۔

''اے بچی! اس کوٹھی کی ملکیت کے کاغذات اور کون سے کاغذ؟''

''مجھے کیا پتا۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''شاباش ہے بچے! جیسے لاابالی عمر اماں باوا گزار گئے ویسی تم گزارنا۔ بے ہوش و بے خود ...... اب کل کلاں کو کوئی دعویدار بن کر چلا آئے کہ تمہارے باوا یہ گھر اس کے ہاتھ بیچ چکے ہیں تو سوچو ہم سڑک پر نہیں پڑیں ہوں گے بھلا!''

وہ جوتر ائفل پیالی میں نکالے یونہی اس میں چمچہ چلا رہی تھی حق دق انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''اب آنکھیں کھولو۔ انہیں گئے بھی تین ماہ ہونے کو آئے۔ چلو۔ یہ حضرت آتے ہیں تو دیکھتے ہیں۔ کیسا انکشاف فرماتے ہیں مجھے تو لگتا ہے۔''

وہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئیں اس کے اڑے اڑے سے چہرے پر نظر پڑی۔ ''چلو چھوڑو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے تم کھاؤ اور......''

''نہیں کھالیا۔'' وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کھڑی ہوگئی تو خالہ بی نے ایک کوفت بھری نظر سامنے ٹیبل پر پھیلے ہوئے کھانے کے برتنوں پر ڈالی جو سب انہیں ہی دھونا پڑنے تھے۔

''اچھے ماں باپ نے لاڈوں میں رکھا۔ ننھی بے بی کو چمچہ دھونا آتا ہے نہ انڈا ابالنا۔ پتا نہیں زندگی میں کیا کرے گی۔ میں کیا اس کی دم بھی ساتھ لٹکی رہوں بس بھئی بہت ہوگیا اب اور ہمدردی نہیں ہوگی ان بوڑھی ہڈیوں سے۔ ابھی وہ وکیل آئے تو پتا چل جائے گا سب کچھ، کتنے پانی میں ہے نہ کچھ ہوا تو بھئی ایسی ہمدردی کو سات سلام۔ اگر اماں باوا کچھ چھوڑ گئے ہوئے جس کی امید کم ہی ہے تو دو چار نوکر رکھوا لے تو چلو دل پر پتھر رکھ کر کچھ اور مہینے ادھر کاٹ لوں گی۔ پر اس حالت میں سارا گھر میرے سر پر ہونا ممکن۔'' وہ برتن پٹخ پٹخ کر دھوتے ہوئے بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

پہلے ان کا اس گھر میں آ کر کیسا دل لگا کرتا تھا جب بھی آنا ہوتا واپس جانے کو جی ہی نہیں کرتا تھا پھر شائلہ تھی اتنی محبت کرنے والی اور طاہر اس سے بڑھ کر ہمدرد طبیعت والا پھر ان دونوں نے جو عمر بھر ان کے ساتھ نیکیاں کی تھیں۔ وہ خالی بیٹھ کر انگلیوں پر گننے کی کوشش کرنے لگتیں تو گن

بھی نہ پاتیں۔

"ہاہ ہاہ! اچھے لوگوں کو رب بھی کتنی جلدی بلا لیتا ہے۔" انہوں نے گندے سندے برتن کھنگال کر یونہی سلیب پر ڈال دیے۔ کچھ ہاتھوں میں دم نہیں تھا۔ کچھ بصارت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی اور سب سے بڑھ کر ان کا دل ہی نہیں چاہتا تھا اور جس کام کو دل نہ چاہے اسے اعضا کیسے خوش دلی سے انجام دے سکتے ہیں۔

"اے تو گھنٹی بجے جا رہی ہے اور یہ ایمن کہاں ہے۔" ٹونٹی بند کرتے ہی ان کے کانوں میں ڈور بیل کی آواز پڑی تھی۔

دور ایمن کے کمرے سے آتی وی سی ڈی کی دھمک انہیں کاریڈور میں جاتے ہوئے سنائی دی تو خون اور کھول گیا۔

"بے حس پتھر دل لڑکی! ماں باوا اکٹھے گزر گئے اور یہ دنیا میں تنہا رہ گئی۔ نہ کوئی آسرا نہ سہارا اور جی دن رات یہ اچھل کود ناچ گانے میں دل کو بہلایا جا رہا ہے کیا زمانہ آ گیا ہے اللہ کی پناہ۔" وہ گیٹ تک جاتے بڑبڑاتی گئیں۔

شمشاد صاحب نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کھول کر فائلیں نکالنا شروع کر دیں۔ وہ خالہ جی کے ساتھ اندر تو آ گئے تھے مگر ان کی طرف قطعاً متوجہ نہیں تھے۔

"ایمن بیٹی کو بلوائیے ذرا!" وہ تمام فائلیں سینٹرل ٹیبل پر سجا چکے تو سنہرے چشمے کے شیشوں سے جھانکتے ہوئے بولے۔

"کیسی ہو ایمن بیٹی؟" وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پروفیشنل سی مسکراہٹ لیے بولے۔

"فائن انکل!" وہ سامنے پڑے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گئی۔

"اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"

"میں نے یہ سمسٹر ڈراپ کر دیا ہے۔" وہ چیونگم چباتے ہوئے اطمینان سے بولی تو انہوں نے سر ہلا دیا جیسے انہیں اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔

"اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟" ان کے تمہید باندھتے ان لایعنی سوالوں سے اس کے چہرے پر ہی نہیں پرے بیٹھی خالہ بی کے چہرے پر بھی کوفت بھرے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"کیا آپ کے علم میں ہے کہ آپ کے پاپا طاہر حفیظ صاحب آپ کے لیے کیا کچھ چھوڑ گئے ہیں؟" انہوں نے بالآخر بات شروع کی۔

"جی نہیں۔" وہ ٹانگ ہلاتے ہوئے ببل بنا رہی تھی۔ خالہ بی جی بھر کر اس کی اس "ہل

جل" سے بے مزہ ہوئیں۔

"یہ فائل ان کے شیئرز کی ساری تفصیل کے بارے میں ہے جو مختلف کمپنیز میں تھے اور گزشتہ دس سالوں سے جس طرح وہ اپنے شیئرز ان کمپنیوں سے نکلواتے رہے آخری سال ان کے پچیس پچیس پرسینٹ شیئرز راشد غفار اینڈ کو میں اور دوسرے شفیع گروپ میں رہ گئے تھے جو انہوں نے اسی سال ...... اپنے آخری سفر پر جاتے ہوئے نکلوا لیے تھے یعنی اب ان کا کسی بھی کمپنی میں کوئی شیئر نہیں ہے۔ مجھے بے حد افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے۔"

وہ کیا بول رہے تھے۔ خالہ بی کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔

مگر ایمن کی ہلتی ٹانگیں اور ببل چیونگم دانتوں اور داڑھوں کے بیچ کہیں مردہ حالت میں چپکی ہوئی تھی۔

"تو اس کا مطلب؟" پورے پانچ منٹ تک ڈرائنگ روم میں جامد سناٹا رہا تھا۔ اس سناٹے کو ایمن کے اٹک اٹک کر بولے گئے بے ربط سے جملے نے توڑا تھا۔

"اس کا مطلب اگر آپ ان فائلوں کو پڑھنا چاہیں تو بالکل کلیئر آپ کو سمجھ میں آ جائے گا۔ میں ان تمام کی فوٹو کاپیز بھی کروا لایا ہوں۔ آپ کسی اور سے مشورہ بھی لے سکتی ہیں۔ یہ پیپرز دکھا کر۔"

انہوں نے میز پر پڑی سبز رنگ کی فائل اس کی طرف بڑھائی جسے ایمن نے پکڑنے کی کوشش بھی نہیں کی صرف بے جان نظروں سے دیکھے گئی۔

"میں اس سب سے کیا سمجھوں۔" اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنا مدعا کیسے بیان کرے۔

"مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے پاپا طاہر حفیظ صاحب نے بزنس میں تو آپ پہ یہ سمجھیں ایک دھیلا بھی آپ کے لیے نہیں چھوڑا۔ آپ کہیں بھی کلیم نہیں کر سکتیں۔ رہ گیا یہ گھر......"

انہوں نے ناک پر پھسلتی عینک کو انگلی سے اوپر دھکیلتے ہوئے سر اٹھا کر چھت پر لگے بیش قیمت فانوس کو دیکھا۔

"یہ گھر؟" اس نے دھک دھک کرتے دل سے پوچھا۔

"یہ گھر اپنے آخری سفر سے پہلے وہ راشد غفار صاحب کے ہاتھ سیل کر گئے تھے۔ بیگم صاحبہ کا آپریشن تھا جس کے لیے انہیں ٹھیک ٹھاک رقم کی ضرورت تھی اور رقم کا کوئی اور ذریعہ تھا نہیں...... ویسے وہ جاتے ہوئے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ دعا کریں، بیگم صاحبہ ٹھیک ہو جائیں تو وہ واپس آ کر جم کر کسی بھی کاروبار میں تھوڑا بہت سرمایہ لگا کر پیر جمانے کی کوشش کریں گے۔ انہیں اس

بار خود اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ آپ کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑ کر جا رہے پھر بھی وہ پُر امید تھے کہ واپس آتے ہی وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر لیں گے مگر موت نے مہلت ہی نہ دی کہ......"

"تو یہ گھر بھی بک چکا کیا؟" خالہ بی جو کتنی دیر سے منہ کھولے انگلی ٹھوڑی پر رکھے حیران وششدر سی سن رہی تھیں ایک دم سے بولیں۔ شمشاد صاحب نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

"یہ راشد غفار صاحب کی ملکیت کے پیپرز ہیں جن میں واضح طور پر لکھا ہے کہ طاہر حفیظ صاحب نے یہ گھر انہیں بیچ دیا تھا اور جب تک وہ واپس نہیں آجاتے آپ دونوں اس گھر میں رہیں گی اور اب تو...... ان کی الم ناک موت کو بھی تین ماہ ہونے کو آئے۔ ظاہر ہے راشد صاحب کب تک انتظار کریں گے۔"

ایمن کچھ بھی نہیں سُن رہی تھی۔

"تو آپ یہ مجھے خیرات دے رہے ہیں۔" کتنے استحقاق کے ساتھ وہ صبح آفس گئی تھی اور کیا شاہانہ ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی بڑی حقارت سے ان نوٹوں کو دیکھ رہی تھی جو یقیناً انہوں نے اپنی زکوٰۃ یا خیرات میں سے نکال کر اسے دیے تھے۔

"آپ آسان لفظوں میں بتائیں۔ اب ایمن کے نام کیا ہے۔" خالہ جی کو شاید یقین نہیں آیا تھا یا شمشاد صاحب کے الفاظ سے تسلی نہیں ہوئی تھی بے چین سی ہو کر پھر پوچھنے لگیں۔

"صاف لفظوں میں...... کچھ بھی نہیں۔" انہوں نے سر جھکا کر شکست خوردہ سے انداز میں کہہ کر ان دو فائلوں کے سوا باقی فائلیں دوبارہ بریف کیس میں رکھنا شروع کر دیں۔

"ایں، ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنا کھاتا پیتا اور اتنا کاروبار کرنے والا شخص مرے تو پیچھے پھوٹی کوڑی نہ چھوڑ کر گیا ہو۔ میں بھی صاف لفظوں میں کہوں مجھے یہ سب دھوکا لگتا ہے، فراڈ۔" خالہ جی ایک دم طیش میں آ کر بولیں۔

"آپ کو حق ہے۔ آپ کوئی بھی دوسرا وکیل کر کے کسی بھی کورٹ میں جا سکتی ہیں مگر جانے سے پہلے اتنا کہوں گا کہ اس کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ میں اپنے اللہ کو حاضر ناظر جان کر بالکل سچ آپ سے کہہ رہا ہوں پھر بھی آپ اپنی تسلی کروا سکتی ہیں اور یہ کہ......" انہوں نے بریف کیس اٹھایا اور کھڑے ہو گئے۔

"ان کا طرز زندگی اور بیگم صاحب کی بیماری سب آپ کے سامنے ہے اس کے باوجود اگر آپ کیس کرنا چاہیں تو آپ کو حق حاصل ہے اللہ حافظ بیٹا! کوئی بھی مزید مسئلہ ہو یا کچھ اور...... اپنا کارڈ میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے۔" وہ ایمن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لمحہ بھر کو رکے اور باہر نکل گئے۔

خالہ بی ان کے باہر نکلتے ہی دوپٹے کا پلو منہ کے آگے رکھ کر پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

وہ خالی خالی نظروں سے انہیں روتا دیکھتی رہی۔

"ہائے ایسے بھی خود غرض ماں باپ ہوتے ہیں۔ دنیا میں اپنی پھول سی معصوم بچی کے لیے کوئی پیسے دھیلے کا آسرا بھی نہ چھوڑ کر گئے۔ نہ گھر نہ در۔ کدھر جائے گی وہ دھکے کھانے۔ ایک چھت تھی۔ اس کا آسرا تو رہنے دیا ہوتا اس کے سر پر، وہ بھی بیچ باچ...... قرب قیامت ہے، قرب قیامت۔" خالہ جی اب رونے کے ساتھ اپنے محبوب مشغلے میں مصروف ہو چکی تھیں۔

وہ کسی معمول کی طرح اٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔

"اگر یہ گھر نہیں ہوگا۔ بینک میں بیلنس نہیں ہوگا۔ بیگ میں روپے اور سیل فون نہیں گاڑی میں فیول بلکہ گاڑی ہی نہیں ہوگی تو تو...... کیسی ہوگی یہ زندگی...... نہیں یہ زندگی...... یہ زندگی تو نہیں ہو سکتی...... اگر یہ زندگی نہیں ہوگی تو پھر کیا ہوگی...... ایسی چیز کو ہم کیا نام دیں گے بھلا جس میں آپ کی پسند کے انٹریئر کے ساتھ ڈیکوریٹڈ روم نہیں ہوگا۔ کمفرٹیبل ایزی ڈریسز، شوز، فاسٹ فوڈ فاسٹ میوزک، ہیری پوٹر کلاسیک کلیکشن ڈی وی ڈی، کمپیوٹر اور جو چاہا میں نے اس بار فرمائش کی تھی آتے وقت لیپ ٹاپ...... نیا اے سی یونٹ سال ڈیڑھ سال بعد کسی اچھی سی جگہ کا وزٹ اٹلی، پیرس، لیڈز، میڈرڈ، سڈنی...... ہاہ سڈنی تو رہ گیا پاپا نے ان ووکیشنز میں پرامس کیا تھا آسٹریلیا لے جانے کا۔ ایک واحد اس جگہ کے ٹور کا مجھے شوق تھا...... واحد اس جگہ کا اور یہ گھر......" اس نے ننگے پاؤں بے جان قدموں کے ساتھ سارے گھر میں پھرنا شروع کر دیا۔

اسے یہ گھر کتنا اجنبی سا لگ رہا تھا۔ اس کے در و دیوار میں کبھی اسے اپنے لیے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی تو آج...... آج بچھڑنے کا خوف کیوں ڈرانے لگا، بھلا وہ اس اجنبی گھر سے زیادہ بورڈنگ میں خوش رہا کرتی تھی۔ بورڈنگ کے اکیلے اکیلے کمرے اسے زیادہ بھاتے تھے، وہ جب بھی اس گھر میں آتی تو الٹی گنتی شروع کر دیتی کہ بورڈنگ جانے میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔

وہ کاریڈور میں کسی سائے کی طرح چلتی ہوئی لیونگ روم کے نیم تاریک کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر قیمتی پینٹنگز سے سجی دیواروں، صوفوں، کارپٹ، پردوں، قیمتی فانوس اور آرائش کی دوسری اشیاء کو یوں سرسری نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے آج پہلی بار اس کے علم میں گھر کا یہ کمرہ آیا ہو۔

وہ چند لمحے کھڑی گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر وہ دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی جیسے اس کمرے میں کوئی سویا ہو اور ذرا سی آہٹ سے جاگ جائے گا۔

ٹی وی لاؤنج، گیسٹ روم اور پینٹری کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آئی۔ چھوٹے سے لان

کے وسط میں دائرے کی شکل کا حوض تھا جس کے بیچوں بیچ سنگی مور کے پروں سے پھوٹتا پانی لان کی خواب ناک روشنیوں میں موتی ٹپکاتا نظر آتا تھا مگر کبھی اس خوب صورت منظر نے بھی اس کے قدم نہیں جکڑے تھے اس نے کبھی دلچسپی سے بیٹھ کر اس حوض یا اس کے مخالف بنی گھر کی عمارت کا خوب صورت فرنٹ نہیں دیکھا تھا۔

شاید کبھی دل میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں ابھرا تھا کہ کبھی یہ گھر اس سے چھن جائے گا یا چھین لیا جائے گا۔

آج جب چھن جانے کا احساس پیدا ہوا تو اس کے شعور نے جیسے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد سب چیزوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا تھا۔

''اور اب یوں غور سے دیکھنے کا کیا فائدہ؟'' وہ تھک کر اسی حوض کی منڈیر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

لان کی لائٹیں بند تھیں اور حوض کا شاور بھی۔

وہ سر اٹھا کر اوپر پھیلے وسیع وعریض آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''یہ کیا حماقت ہے ایمن! ہم کیا کریں گے بھلا ان حرام خوروں نے کم کھایا ہوگا، ہے ہے دہائی کہ بیٹھے بٹھائے دو کوڑی کے بھی نہیں رہے میں نہیں مانتی شمائلہ اور طاہر ایسے کم عقل اور نادان ہوں گے کہ اپنا سب ہی کچھ...... نہیں نہیں، تمہارا دل مانتا ہے؟'' وہ دراز پہ ہاتھ جمائے کہتے ہوئے پھر سے رونے کی تیاری پکڑنے لگیں۔

''ہاں میرا دل مانتا ہے۔ وہ ایسے ہی تھے۔ صرف خود سے محبت کرنے والے۔ ان دونوں کی زندگی میں میری اہمیت صفر سے بھی کم تھی۔ انہوں نے بیٹی تو کیا مجھے کسی کھلونے کے برابر بھی نہیں جانا۔ اگر جانا ہوتا تو۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اس نے خالہ بی کے ہاتھ جھٹکے سے پرے ہٹا کر دراز کھولی اور اس میں پڑے نوٹ اٹھا کر کندھے سے لٹکے بیگ میں ڈالے اور خالہ بی کی، سنور کو نظر انداز کرتی تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''راشد انکل ہیں؟'' ان کا پیون ایک بار پھر اس کی راہ میں مزاحم ہوا تھا اب کے اس نے کروفر سے آگے بڑھ کر دروازہ دھکیلنے سے اجتناب کیا۔

''ابھی نکل کر گئے ہیں۔ آپ دیکھ سکتی ہیں۔'' شاید اپنی پچھلی خاطر، پیون کو یاد تھی جو مودب انداز میں اٹھتے ہوئے اس نے کمر ذرا سی خمیدہ کر کے گلاس ڈور دھکیل دیا۔

کمرہ واقعی خالی تھا۔

وہ ان کے پی اے کے پاس چلی آئی۔

''یہ کچھ رقم ہے جو راشد صاحب کو دینی ہے اور انہیں کہیے گا اپنی خیرات آئندہ مستحق افراد میں تقسیم کیا کیجیے۔'' اس نے نوٹ نکال کر اس کی ٹیبل پر رکھے اور اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

''ہائے۔'' وہ باہر نکل رہی تھی اور وہ اندر جا رہا تھا۔ ٹکر تو نہیں ہوئی مگر رستہ دیتے ہوئے جیسے ہی اس کی نگاہ ایمن پر پڑی، وہ بری طرح سے چونکا تھا اور اب دوسرا گولڈن چانس مس نہیں کرنا چاہتا تھا سو فوراً اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

ایمن نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور سپاٹ چہرہ لیے مڑنے لگی۔

''سنیے، آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔'' وہ ایک بار پھر لپک کر سامنے آیا۔ بلیو شرٹ کے ساتھ بلیو پینٹ کوٹ پر میرون ٹائی لگائے ایمن کو وہ ایک اجنبی ہی لگا تھا یوں بھی اس لمحے اس کا دماغ بالکل حاضر نہیں تھا۔

''جی فرمائیے۔'' وہ تنک کر کمر پر ہاتھ جما کر بولی۔

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید۔ اس روز شام کو میں آپ کی گاڑی...... نہیں بلکہ آپ نے مجھ پر گاڑی...... چڑھا دی تھی۔''

وہ وجہ ملاقات بتاتے ہوئے اچھا خاصا بیوقوف لگ رہا تھا۔

''تو آپ دوبارہ زندہ کیسے ہو گئے۔ اگر میں نے آپ پر گاڑی چڑھا دی تھی تو؟'' وہ اسی طرح سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

''نہیں، مجھے کوئی سیریس انجری آئی مین صرف مائنر سی چوٹ کندھے، بازو......''

''ویسے آپ شکل سے تو اچھے خاصے سمجھ دار، پڑھے لکھے اور کسی حد تک مہذب انسان بھی لگتے ہیں۔ تین دن بعد کسی ہونے والی معمولی انجری کا پنلٹی مانگنا...... اس کو کیا کہیں گے بھلا۔'' وہ چبا چبا کر بولی تو شہریار کا ذہن پل بھر کے لیے ماؤف ہو گیا۔

'' بھلا یہ سب یاد دلانے کی کیا تک تھی کوئی اور بھی بہانہ کیا جا سکتا تھا تعارف حاصل کرنے کے لیے۔''

اس کے اندر بیٹھے سمجھ دار شہریار نے اسے جھڑکا۔

''اور یوں بھی یہ تعارف حاصل کرنے کا طریقہ خاصا پرانا اور احمقانہ سا ہے ویسے مجھے ایمن کہتے ہیں اور آپ اس روز بھی ادھر ہی موجود تھے۔ میں نے راشد انکل کے کمرے سے نکلتے ہوئے آپ کو دیکھا تھا جاب کرتے ہیں ادھر؟''

"اف کس قدر کائیاں لڑکی تھی یعنی اس روز بھی مجھے "تاڑ" چکی تھی جبکہ میں سمجھا صرف میں ہی اسے آبزرو کر رہا ہوں۔"

"لگتا ہے، آپ کام اور عقل دونوں سے فارغ ہیں۔ سوری، مجھے ذرا جلدی ہے۔" وہ اسے یونہی کھڑا چھوڑ کر لفٹ کی طرف بڑھی۔

"سوری...... میں......" وہ اس کے پیچھے جا پہنچا۔

"سوری...... فارواٹ؟" وہ تیکھی نگاہ لیے پلٹی۔

"میں واقعی آپ کا تعارف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس شام حادثاتی طور پر آپ سے ٹکرانے کے بعد......"

"آپ رات بھر اداس سے اگلے دو دن خاصے ڈسٹرب رہے، ہے نا؟" وہ فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی تو اس نے مجرمانہ انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کلیشے۔" وہ بڑبڑائی۔ "یہ آپ لوگ رٹے رٹائے ڈائیلاگ استعمال کرتے تھکتے نہیں۔ اب تو لڑکیاں اتنی فارغ نہیں ہوتیں کہ یہ فضول محبت وحبت کے ڈائیلاگ سن سن کر چھوئی موئی ہنستی رہیں۔ آپ تو پھر معقول آدمی لگتے ہیں۔" اس کے اندر کھولن سی تھی جسے وہ کہیں نہ کہیں نکالنا چاہ رہی تھی۔

"تو آپ کے خیال میں بے چارے معقول آدمی کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔" وہ اس کے ساتھ ہی لفٹ میں آگیا۔

"دل!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "کیا واقعی ان گھسے پٹے ڈائیلاگز میں کہیں دل بھی انوالو ہوتا ہے۔ سچ کہیے گا؟"

"اتنی کم عمر سی لڑکی اور ایسی پتے کی باتیں۔ لگتا ہے شہریار میاں دال نہیں گلے گی۔" اس نے سوچا۔

"کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے۔" اس نے نیم دلی سے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

"اور یہ کبھی کبھی۔" سال میں مہینے میں یا دن بھر میں کتنی بار وقوع پذیر ہوتا ہے۔"

"زندگی میں ایک بار۔"

"واؤ! پتے کی بات...... تو باقی جو اتنی بار افیئرز چلتے ہیں انہیں کیا کہیں گے؟"

"ریہرسل!" وہ فوراً بولا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھل کر مسکرادی۔

"آپ میں عاشقوں کی پہلی صفت تو کنفرم ہوگئی۔" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ اسی وقت لفٹ نے فرسٹ فلور پر قدم جمائے تو دونوں دروازے کھلتے ہی باہر نکل آئے۔

"کون سی صفت؟" وہ اس کے ساتھ آنے پر چڑی نہیں تھی یہی کافی تھا۔

"ڈھٹائی۔" دونوں ریسپشن سے گزرتے ہوئے باہر آگئے۔

"تھینکس۔ آپ نے مانا تو۔" وہ خوش ہوگیا۔

"کیا؟" وہ غائب دماغی سے سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

"عاشق۔" وہ ترنگ میں آکر بولا تو اس نے گردن گھما کر باقاعدہ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اس کے یوں دیکھنے سے کچھ گڑبڑا گیا جبکہ وہ چند لمحوں بعد خودبخود مسکرادی۔

"آپ ہنسیں کیوں؟" اس کی مسکراہٹ سے وہ شہ پا کر بولا۔

"ایک کنفرمڈ عاشق سے مل کر خوشی ہوئی اس لیے۔"

"مگر آپ ہنسی تو اس طرح تھیں جیسے کسی "پاگل" سے ملاقات ہوگئی ہو۔"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ گلاسز لگاتے ہوئے کندھے اچکا کر بولی۔ "ویسے بائی دا وے۔ آپ کہیں جا رہے ہیں یا آ رہے ہیں؟" وہ ایک اسٹیپ نیچے اترتے ہوئے بولی۔ "مطلب کسی کام سے؟"

"کام سے تو لگا ہوا ہوں۔" وہ اپنی طرف سے معنی خیز انداز میں بولا جس کا اس نے نوٹس نہ لیا اور آگے بڑھ گئی۔

"میں آپ کو ڈراپ کردوں؟" اسے پارکنگ ایریا کے پاس سے یونہی گزرتے دیکھ کر اسے خیال آیا تو تیزی سے اس کے پاس پہنچ کر بولا۔

"گاڑی ہے آپ کے پاس؟" وہ مڑ کر بولی۔

"مانگے کی۔" وہ مسکرا کر بولا تو وہ بھی ہلکا سا مسکرادی۔

"اوکے۔ مجھے ذرا مارکیٹ تک ڈراپ کردیں۔" شہریار کو ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مان جائے گی۔

واقعی اس کی زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں سے یہ لڑکی بہت مختلف تھی۔ وہ یہی سوچتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھولنے لگا۔

"ویسے میں آپ کو بھی ڈرائیونگ کی دعوت دیتا مگر کیا کروں کہ گاڑی مانگے کی ہے، اس لیے رسک نہیں لے سکتا۔" وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا تو وہ مسکرادی۔

اس وقت اس کا دماغ کہیں اور تھا۔

"آپ نے میرا نام نہیں پوچھا؟" مین روڈ پر آتے ہی اسے خود خیال آیا تو بولا۔

"ہوں۔ بتادیں۔" وہ اپنے خیالات سے چونک کر یوں بولی۔ "جیسے مجھے کوئی فرق نہیں

پڑے گا۔'' شہریار کو تھوڑا ناگوار سا گزرا۔

''مجھے شہریار کہتے ہیں۔'' اس نے دل پر جبر کر کے اپنا تعارف کروایا۔

اس نے جواب میں ''ہوں'' بھی نہیں کہا شاید سنا بھی نہیں تھا۔ شہریار کو اس کی بے نیازی پر خاصا طیش آیا مگر پی گیا۔

''کولڈ ڈرنک پئیں۔ یہ اسپاٹ ہے۔'' ایک کولڈ کارنر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دل پر جبر کر کے پوچھا۔

''نو تھینکس۔'' وہ مسلسل ونڈ اسکرین سے باہر ہی دیکھ رہی تھی۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ہماری دوستی ہو سکتی ہے؟'' شہریار تھوڑی دیر بعد پھر امید بھرے لہجے میں بولا۔

''ہو گئی۔ پلیز یہیں روک دیں۔'' اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''کچھ شاپنگ کرنا ہے تمہیں......؟'' وہ اترتے اترتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''بھئی۔ اب اچھی خاصی کم عمر ہو۔ میں کیا باتمیز بنا آپ آپ کرتا رہوں۔ تو کیا میں ویٹ کر لوں؟'' اس نے فوراً تم، کی وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں شکریہ۔ مجھے ٹائم لگے گا۔ میں چلی جاؤں گی۔ بائے۔'' وہ کہہ کر نیچے اتر گئی۔

''چلی جاؤں گی کسی اور کے ساتھ لفٹ لے کر۔'' وہ اس کے اترتے ہی بڑبڑایا۔ ''حرج کوئی نہیں اگر کچھ دیر انتظار کر لیا جائے۔ آج تو قسمت مہربان ہوتی لگ رہی ہے۔'' اس نے وائبریشن پر لگے موبائل کی تھرتھراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے پاکٹ سے نکالا۔ آفس سے فون تھا یقیناً اسے جس کام سے بھیجا گیا تھا۔ اس میں اتنا وقت تو نہیں لگ سکتا تھا۔ ''سالے کو گاڑی کی فکر ہوگی اور بس۔'' اس نے لب بھینچ کر کہا اور موبائل دوبارہ پاکٹ میں ٹھونس دیا۔

''ارے آپ ابھی یہیں ہیں۔ اوکے۔ پھر ذرا مجھے گیراج تک ڈراپ کر دیں۔ مجھے اپنی گاڑی وہاں سے لینی ہے۔'' وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گئی تھی اور بے تکلفی سے کہتے ہوئے خود ہی دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''یہ کافی ہیں۔ مجھے پتا ہے اتنا کام نہیں تھا۔ آپ نے تو خاصا لمبا چوڑا بل بنا ڈالا۔'' اس نے اٹھائیس ہزار روپے گیراج کے مالک کو زبردستی تھمائے اگرچہ وہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔

''جی آپ نے گاڑی کی حالت دیکھی تھی؟'' گنج بخش والے اسے لوہے کے بھاؤ بھی نہ خریدتے۔ آپ تو یہ سمجھیں میں نے لوہے کی باڈی میں جان ڈالی ہے پورے پچاس ہزار کا کام تھا جو میں نے صرف آپ کا لحاظ کر کے...... یہ کم ہیں دو ہزار تو اور دیں۔'' وہ مصر تھا۔

''پلیز انکل! یہ کافی ہیں اور سچ کہوں۔ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' بمشکل

اس نے کہا تھا۔

''چلیں کوئی بات نہیں، پھر ادھر سے گزریں تو دے جائیں۔'' وہ جیسے ادھار پر بے فکر ہو گیا۔

''ہرگز نہیں۔ دوبارہ کام میں وعدہ نہیں کرتی۔ بس اس بار اتنے ہی ٹھیک ہیں۔ گاڑی لے جاؤں میں؟''

''ہاں، او چھوٹے! بی بی کو گاڑی لے جانے دو۔'' استاد کی آواز پر تیرہ سالہ لڑکا سلیٹی رنگ کا پھٹا پرانا پیوند لگا جگہ جگہ گریس اور پٹرول کے دھبوں سے رنگا ہوا شلوار سوٹ پہنے کسی گاڑی کے نیچے سے نکلا تھا۔ گریس اس کے ہاتھوں اور منہ پر بھی لگی تھیں۔

ایمن دو تین بار پہلے بھی ادھر آتی رہی تھی اس لیے چھوٹے کو شکلاً پہچانتی تھی، وہ بھی اسے دیکھتے ہی دانت نکالنے لگا۔

''کیسے ہو...... واہ گاڑی تو انکل نے واقعی نئی کر دی ہے۔'' اپنی گاڑی کی چمک دمک دیکھتے ہوئے وہ کھل اٹھی۔

تھوڑی دیر میں شہریار اپنی گاڑی میں اور وہ اپنی گاڑی میں آگے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔

''او...... او، رکیں، سنو۔'' چھوٹا ان دونوں کے وہاں سے جاتے ہی ایک دم چیخا تھا بلکہ ان کی گاڑیوں کے پیچھے چند قدم بھاگا بھی۔

''اوئے کیا ہو گیا، جلدی کر ادھر اتنا کام پڑا ہے شام تک وہ شیخ صاحب آ جائیں گے اپنی گاڑی لینے۔ چل مر جلدی ہاتھ چلا۔'' پیچھے سے استاد کی دھاڑ پر وہ پلٹا اور اس گاڑی کے نیچے گھس گیا جس کے نیچے پہلے لیٹا وہ کام کر رہا تھا۔

''کیا بی بی کا کوئی پرس ورس تو نہیں گر گیا یا کوئی نوٹ ووٹ۔'' اس کے ساتھ دوسری طرف لیٹا لڑکا اس کے کھوئے کھوئے سے انداز دیکھ کر بولا۔

''اپنی ایسی قسمت کہاں۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔ ''وہ دوسری گاڑی دیکھی تھی تو نے وہ جو بی بی کے ساتھ بندہ تھا وہ والی میں تو ابھی......'' اس کی ٹانگ پر کسی نے زوردار ٹھڈا مارا تھا۔

''بدبختوں باتیں بنائے جانا، کام کوئی نہ کرنا پھر روپے پیسے کاٹ لوں تمہاری ہڈحرامی کے تو گھر والے روتے پیٹتے آ جاتے ہیں۔ تمہارا کیا جاتا ہے کام کروانے والے دیر سویر ہو جانے پر آ کر تو میری جان کو سیاپا ڈالتے ہیں تم تو دیہاڑی لے کر چلتے بنتے ہو۔ کام کرو کام ہڈحرامو۔''

استاد کے ٹھڈے ہی نہیں پھٹکار بھی ایسی زوردار تھی کہ دونوں سانس نکالے بغیر اپنے اپنے کام میں منہمک ہو گئے کیونکہ انہیں پتا تھا دوسری بار استاد ٹھڈے کا استعمال نہیں کرے گا بلکہ

ایسے کاموں کے لیے بڑے اوزار تھے اور دوسری مار ان ٹھڈوں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی تھی کہ خوف کے مارے دوبارہ کام ختم کرنے تک ان کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا تھا۔

☆☆☆

''انکل کوئی گنجائش کچھ ہو......''

وہ ایک دن پہلے گولڈی کے چچا بیرسٹر فتح محمد کو پاپا کے بزنس سے متعلق جتنے بھی ڈاکو منٹس شمشاد انکل دے گئے تھے اور جو کچھ اسے ان کی ذاتی الماری کے پوشیدہ لاکرز سے مل سکا تھا، وہ انہیں دے گئی تھی کہ وہ بتائیں کہیں کسی بزنس، کسی کمپنی، کسی بینک میں ان کے کوئی اثاثے ہوں۔''

''نہیں ایما! میں نے یہ سارے پیپرز سارے ڈاکومنٹس ایگریمنٹس پوری رات اور دن کے دوران اچھی طرح اسٹڈی کیے ہیں کسی کمپنی کسی فیکٹری، کاروبار میں ان کا ایک بھی شیئر نہیں بچا۔ ہم کسی بھی پوائنٹ کو لے کر کورٹ جا کر اپیل نہیں کر سکتے۔ کچھ ہے ہی نہیں اور یہ صورتحال کوئی اتنی حیران کن بھی نہیں۔ اصل میں تو ان کا یہ ڈاؤن فال گزشتہ چھ آٹھ سالوں سے جاری تھا۔ ان کے یہ سارے پیپرز بتاتے ہیں کہ آٹھ دس سال پہلے واقعی ان کے شیئرز ایک نہیں بہت سی کمپنیز میں تھے مگر وہ آہستہ آہستہ سال چھ مہینے میں ایک ایک کر کے نکلواتے رہے۔ صرف یہی نہیں ان کے چار بینکوں میں اکاؤنٹ تھے، وہ چاروں کے چاروں اس وقت نل اسٹیٹس شو کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے کسی عیاشی میں یہ ساری دولت اڑا دی ہے۔ ان کے غیر ملکی سیر و تفریحی دورے، وہاں کی رہائش کھانا پینا اور دوسرے اخراجات کا اگر حساب لگائیں تو سب کچھ بیلنس ہوتا نظر آ رہا ہے اور پتا ہے انہوں نے گھر...... گھر میں موجود تمام سامان کے ساتھ سیل کیا ہے۔ خدا معلوم انہیں کیا ایسی اشد ضرورت تھی کہ گھر کی ہر چیز ایزاٹ از کی بنیاد پر سیل کر دی گئی۔ میری تو عقل حیران ہے ورنہ طاہر حفیظ ایسا نادان ایسا کم عقل تو نہیں تھا کہ تمہارے لیے کچھ بھی......سوری بیٹا!''

وہ نان اسٹاپ کہتے جا رہے تھے اور وہ جیسے کسی گہری دلدل میں اترتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں اترتی آنسوؤں کی دھند میں اسے گولڈی کے چچا کا چہرہ بھی غیر مبہم سا دکھائی دے رہا تھا اور ان کی ٹھہری ٹھہری سنجیدہ آواز جیسے کسی پاتال سے آ رہی تھی۔ ایسی آواز جس میں گونج تو ہو الفاظ تو ہوں مگر ان کا کوئی مفہوم نہ ہو وہ ان کے الفاظ سمجھنے سے قطعی قاصر تھی بس یک ٹک ان کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

''میں کیوں روؤں، میں نہیں روؤں گی۔'' اس نے اس دوران صرف ایک فیصلہ کیا اور کتنی دیر کا رکا ہوا سانس سینے سے خارج کیا۔ پلکوں کو زور سے جھپکا۔ سارا ریلا ندی کے بیچ سے کناروں کی جانب منتقل ہو گیا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہاری ماما کا کوئی اکاؤنٹ، ان کی جیولری...... گھر جا کر دیکھو شاید کچھ ہو۔'' وہ اس سے ہمدردی کر رہے تھے کہ مشورہ دے رہے تھے، وہ ماں باپ جو اس کے لیے پھوٹی کوڑی نہ چھوڑ کر گئے وہ کوئی خفیہ خانے میں سونا چاندی کیا پیتل تانبا بھی نہیں چھوڑ کر گئے ہوں جو گھر کے برتن فرنیچر تک سیل کر گئے وہ اس کے لیے بھلا کیا چھوڑ کر گئے ہوں گے۔

وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

''ارے ایما! رکو تو بیٹا! یہ پیپرز فائل تو لے جاؤ اور سنو پریشان نہیں ہو، ایسے اپس اینڈ ڈاؤن زندگی کا حصہ......''

گولڈی کے چچا کہتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں فائل بھی تھی جو اب اس کے لیے ردی کاغذوں کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔

''ہائے ایما! تم اچھے وقت پر آئیں۔ بڑا زبردست گیٹ ٹوگیدر ہے آج فواد کی طرف سے عینی کے اعزاز میں۔ اس نے تمہیں بھی انوائٹ کیا ہے۔'' وہ ناک کی سیدھ میں گولڈی کے چچا کے گھر سے نکل کر اپنی گاڑی وہیں چھوڑ کر جا رہی تھی جب گولڈی اپنے گھر کے گیٹ سے نکلتے ہوئے اس سے ٹکرایا تھا۔

ایمن نے اجنبی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا! خیر تو ہے۔ ایسی روٹھی روٹھی نگاہوں سے کیا دیکھ رہی ہو۔''

وہ اپنے شانوں پر پڑے تازہ شیمپو کیے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''گولڈی! ایک بات کہوں؟'' خود پر قابو پاتے ہوئے بظاہر نارمل لہجے میں بولی۔

''ہاں بولو، اندر تو چلو۔'' اس نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچا۔

''پتا ہے مجھے بھی یہ بات ابھی پتا چلی ہے۔'' وہ اپنا ہاتھ اس سے چھڑائے بغیر ذرا اس کی طرف جھک کر بولی۔

''کیسی بات؟'' وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

''آئی ایم ان لو۔'' وہ نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبا کر بولی۔

''رئیلی ہو از لکی مین؟'' وہ ایک دم سے ایکسائیٹڈ ہو کر بولا۔

''وہ لکی مین تم ہو ڈیئر فرینڈ!'' وہ کوئی بھی تمہید باندھے بغیر فوراً بولی کہ پل بھر کو تو گولڈی بھی جیسے سن ہو گیا۔ کسی نے یخ پانی کی بالٹی اس پر انڈیل دی ہو۔

''تم مذاق کر رہی ہو؟'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ

چھوڑ دیا۔

"ایسے معاملوں میں مذاق نہیں ہوا کرتے۔ تم جانتے ہو۔" وہ برا مان کر بولی۔

"تو تم سیریس ہو؟" گولڈی ڈرے ڈرے سے انداز میں بولا۔

"آف کورس!" وہ با اعتماد لہجے میں کہہ کر جکڑے شولڈر کٹ بال جھٹک کر بولی اس کے چچا کے پاس بیٹھے دل و دماغ پر جو غبار سا چھایا تھا ایک دم سے چھٹ گیا۔ گولڈی کے چہرے کے تاثرات پول لائٹ کی ملگجی روشنی میں خاصے مضحکہ خیز اور تھوڑے پریشان کن تھے۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔

"ہاں ہوئی ہے۔" وہ بادل نخواستہ مسکرایا تھا۔

"تو پھر......؟" وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تو پھر کیا؟" گولڈی نے گردن جھٹکی۔

"ول یو میری می؟" وہ پہلے کی طرح تمہید باندھے بغیر بولی تھی۔

"واٹ!" گولڈی پر دوسری بار کسی نے یخ بالٹی انڈیل دی۔

"اے کچھ سنا تم نے؟" وہ ہنستے ہوئے اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

"ہاں سن لیا، ذرا ادھر دیکھو اس نے ایمن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کیا اور ناک سکیڑ کر اس کا منہ سونگھنے لگا۔"

"پی کر آرہی ہو، ہے نا؟" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

"تمہارے چچا بیرسٹر فتح محمد نے پلائی ہے۔ سوچو اس کا آفٹر افکٹ کیسا ہوگا۔" وہ ہنستے ہوئے مزے سے بولی۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟" گولڈی زچ ہو گیا۔

"اونہوں، کیا تمہیں برا لگا؟" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا؟" گولڈی اب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بھاگنے کے چکر میں تھا۔

"میرا یوں اظہار محبت تم خود ہی تو کہتے ہو، دوستوں کو آپس میں فیئر ہونا چاہیے۔"

"ہاں وہ تو ہے۔" "مگر اتنا بھی فیئر نہیں ہونا چاہیے۔" وہ دل میں کڑھا۔

"وہ کیا ہے گولڈی! ماما پاپا کے بعد میں خود کو اتنی تنہا اکیلی محسوس کر رہی ہوں کہ...... کوئی ہو جو میرا ہو، میرا اپنا اس لیے......تم سے تو بچپن سے انڈر اسٹینڈنگ ہے جتنی بار بھی خالہ بی کے کہنے پر پارٹنر کا سوچا نظروں کے سامنے تمہاری صورت آگئی۔ شاید یہ تمہاری پرخلوص بے لوث دوستی کا اثر ہے کہ جو مجھے محبت کی طرح لگا اگر تمہیں اچھا نہیں لگا تو سوری۔"

وہ بات سے بات نکالتی چلی گئی۔ گولڈی نے قدرے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ واضح طور پر نظریں چرا کر بولا۔

"اور وہ جو تم کہا کرتے تھے جب بھی شادی کرو گے ایما جیسی فرینک لڑکی سے کرو گے اور پاپا ماما کے کریش کے بعد جس طرح تم نے میری دن رات دل جوئی کی اور بار بار میسج کرتے تھے۔ ایما ڈونٹ وری ڈونٹ ویپ، آئی ایم ودھ یو بس انہیں باتوں نے پتا نہیں کیسے میرے دل میں تمہارے لیے یہ نیا جذبہ جگا دیا اور میں نے تم سے کیسے اظہار محبت کر دیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا، شاید تمہارے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" اب اسے سچ مچ گولڈی کی حالت پر مزہ آ رہا تھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اچھا چلو فواد کی طرف چلتے ہیں، اس ٹاپک پر پھر بات کریں گے۔" اسے بالآخر موضوع بدلنے کا موقع مل ہی گیا۔

"او کے، تم اچھی طرح سوچ کر مجھے ایک دو دن میں بتا دینا اور میں ذرا تیار ہو کر آتی ہوں۔ فواد کی طرف تم چلو، بائے۔"

وہ ہاتھ ہلاتی کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

"یہ اسے ہوا کیا ہے؟" گولڈی وہیں کھڑا سوچتا رہا۔

"یقیناً کوئی چکر ہے ورنہ ایما اور ہاتھ پکڑا دے۔ دال میں کچھ کالا ہے اور یہ انکل کی طرف کیا کر رہی تھی۔" وہ اس کے آگے سے گاڑی لے جاتے ہوئے ہاتھ ہلاتی چلی گئی تو وہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے چچا کی کوٹھی کی طرف بڑھ گیا۔

بیرسٹر صاحب کی گاڑی کھڑی تھی۔

"اس کا مطلب ہے، ایمان انکل سے ملنے آئی تھی، کیوں؟ ذرا پتا تو کریں۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"آلو لے لو، پیاز لے لو، ٹماٹر، ہری بھنڈیاں، گول گول ہریالے ٹینڈے۔" وہ منہ کے آگے ہاتھ رکھے اپنی پھٹی آواز کو بھونپو بنائے ریڑھی پہ رکھی سبزیاں دھکیلتا احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔

اندرون شہر کا یہ کٹڑی جہاں ایک نہیں ان گنت گھرانے آباد تھے نچلا کمرہ کسی ایک کنبے کے پاس تھا تو اوپر چھت پر برآمدہ اور کمرہ کسی دوسرے گھرانے کے قبضے میں، ساتھ والا کمرہ کسی اور خاندان کی ملکیت تھا اس پوری کٹڑی میں کسی ایک گھرانے کے پاس بھی دو سے زیادہ کمرے نہیں تھے کم ہی گھروں کے پاس علیحدہ باورچی خانہ یا غسل خانہ تھا ہر منزل پر ایک ایک غسل خانہ موجود تھا اور جہاں یہ سہولت نہیں تھی وہاں لوگوں نے کسی برآمدے میں تھوڑی سی اینٹیں سیمنٹ لگوا کر دو

دیواریں بنو کر آگے پردہ ٹانک دیا تھا یوں وہ گھر کے ساتھ اٹیچڈ باتھ روم کا کام دے رہا تھا۔

کٹڑی کے احاطے میں ایک مستطیل سی جگہ مستقل کوڑے دان کا کام دیتی تھی۔ ساری کٹڑی کے لوگ بلا تکلف اپنا کوڑا کرکٹ کمروں کی کھڑکیوں دروازوں سے نیچے اس مستطیل احاطے میں اچھال دیتے۔

اس کٹڑی کے نچلے درمیانی اور اس سے اوپرے پورشنز میں کہیں دھوپ، روشنی کا گزر نہیں تھا۔ روشنی تو پھر بھی کسی نہ کسی روزن کھڑکی روشندان سے جھانک لیتی۔ دھوپ کا گزر ادھر بے حد کم تھا اور نیچے کوڑے دان کے اس احاطے تک دھوپ کا پہنچنا ناممکن۔ جو بھی کٹڑی کا بڑا سا لکڑی والا پھاٹک جو دن رات کھلا رہتا تھا اس کے بغلی دروازے سے اندر داخل ہوتا اسے سب سے پہلے اس کوڑے دان کا دیدار نصیب ہوتا جسے ہفتوں مہینوں بعد کارپوریشن کا ٹرک اٹھا کر لے جاتا تھا مگر یہ خصوصی توجہ ہفتوں مہینوں بعد اس احاطے کو نصیب ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کارپوریشن کا عملہ کام چور یا لاپروا تھا بلکہ جب جب وہ پیلا ٹرک کٹڑی کے باہر کی تنگ ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزر کر کٹڑی تک پہنچتا تو اس بلا کے گلیوں میں داخل ہونے سے ہر طرح کی ٹریفک پیدل، سائیکل سوار، موٹر سائیکل سوار اور ریڑھی بان عجیب عذاب میں مبتلا ہو جاتے تھے جسے شہر کی دوسری معروف مصروف سڑکوں پر ٹریفک جام کا نام دیا جاتا ہے وہی تکلیف دہ صورت حال ان گلیوں میں ظہور پذیر ہو جاتی صبح کا کوڑا اٹھانے گئے اس ٹرک کو عموماً دوپہر ڈھلے یا اکثر شام گئے ان سانپ جیسی ٹیڑھی میڑھی تنگ تاریک گلیوں سے نکلنا نصیب ہوتا اور یہ الگ بات کہ اٹھایا گیا کوڑا کرکٹ وہ سارے رستے بجلی کی تاروں کے کھمبوں تجاوزات سے ٹکراتا ادھر اُدھر سوغات کے طور پر گراتا چلا جاتا اور شام گئے تک وہ گلیاں بھی اس کوڑے کی برکت سے اچھی خاصی مشک بار ہو چکی ہوتیں۔

اس کے علاوہ جونہی وہ ٹرک اس تاریخی قدیم دروازے سے گزرتا تنگ گلیوں کی طرف آتا دکھائی دیتا تھڑوں دکانوں پر بیٹھے ریڑھیاں سجائے دکانداری کرتے دکاندار بلا تکلف ٹرک اور ٹرک کے عملے کو موٹی موٹی گالیاں (جو ان روزمرہ کی گفتگو کا لازمی حصہ ہوتی تھیں) کھلے عام بلند آواز میں دینے لگتے یوں کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا جھگڑا بھی ہو جاتا اور جھگڑے تو اس علاقے کے معمول میں شامل تھے۔

سارا دن بیروزگار نوجوان، ادھیڑ عمر لوگ مختلف تھڑوں اور نکڑوں پر ٹولیاں بنائے تاش کے پتے پھینٹتے، بیڑیاں پیتے، پان چباتے تھوکتے سگریٹ کے سوٹے لگاتے وڈیو گیمز کے گرد ہجوم لگائے بلیرڈ کھیلتے، فحش فلمیں دیکھتے گالیاں بکتے ٹھٹھے لگاتے آتے جاتوں پر آوازے کستے ان گلیوں کا ناگزیر حصہ تھے۔ یہاں رہنے والوں کے لیے ان کی موجودگی قطعی کوفت کا باعث نہ بنتی جبکہ کسی

بھی نووارد کی آمد جہاں ان کی ٹولیوں میں ذرا ارتعاش پیدا کرتی وہیں اس نووارد کو بھی اچھا خاصا ہراساں کر دیتی۔

اور کٹڑی کے باہر بیٹھے سن رسیدہ بوڑھے دھوتیاں تہبند باندھے پیروں میں گھسے ہوئے کھسے، سلیپراڑسے چندی چندی آنکھوں سے رعشہ زدہ ہاتھوں پیروں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے گئے وقتوں کو یاد کرتے رہتے کہ جب، ان تاریخی بارہ دروازوں اور ان پرانی پختہ ٹھنڈی ٹھار گلیوں میں شرفاء کا بسیرا ہوا کرتا تھا۔ جب ان دروازوں کا رہائشی ہونا قابل فخر سمجھا جاتا تھا نہ کہ آج کی طرح جب اسٹیٹس سمبل نے ان گلیوں کے شرفاء کو اچھے خاصے کمپلیکسز میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان محلوں کے رہائشی ہونے کا اعتراف کم ہی کیا کرتے تھے بلکہ جس کو موقع مل رہا تھا، چار پیسے ہاتھ آتے وہ یہاں سے نکل کر کھلے علاقوں میں جواب بذات خود چڑیا گھر بن چکے تھے، وہاں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دیتے۔

اور پھر اس کٹڑی کو چھوڑ کر جانے پر اس ایک کمرے یا دالان کو کوئی بھی خریدنے پر تیار نہ ہوتا زیادہ سے زیادہ کوئی کارخانے دار یا ہوزری چمڑے والے گودام کے لیے لے لیتے اور اس کے لیے باقی کٹڑی والے مرنے مارنے پر اتر آتے۔ مجبوراً اسے یا تو یہیں رہنا پڑتا یا پھر اس جائیداد کو اونے پونے ہمسائے کے ہاتھ بیچنا پڑتا یا تالا لگا کر کچھ عرصے کے لیے جانا پڑتا اور اس کے بعد ایک دو سالوں بعد اس کا بغلی ہمسایہ خود بخود تالا توڑے بغیر کوئی نہ کوئی خفیہ رستہ بنا کر پہلے اپنے گھر کا فالتو سامان پھر زائد افراد کے لیے شب گزاری کا اہتمام کر لیتا، پہلے چھپ چھپا کر پھر کھلے عام یہ آمد و رفت شروع ہو جاتی بے چارہ مالک اگر تو زور آور ہوتا تو ٹھیک ٹھاک مقدمہ کھڑا کر دیتا ورنہ کوئی شریف عزت کا مارا ہوتا اور قابض ذرا لچا لفنگا تو پھر مالک خون کا گھونٹ پی کر یا تھوڑی بہت رقم لے کر خود بخود پیچھے ہٹ جاتا۔

اور یہ تو یہاں کے آئے دن کے قصے تھے۔

سبزی والے کی ریڑھی کے گرد اب عورتیں اکٹھی ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

''وے دینے! کل تو پالک دے کر گیا تھا کہ نرا گھاں (گھاس) جو پالک کے پتے تھے گلے سڑے کیڑے لگے اور مول تو سونے کے بھاؤ لگاتا ہے کوئی شرم حیا ہے تیرے پلے۔'' سب سے پہلے تو اسے اس کٹڑی کی سب سے پرانی رہائشی تائی حلیمہ نے آ پکڑا تھا۔

''او تائی نہ کر شیدائی۔'' اس نے ترنگ میں آ کر ہوا میں ہاتھ لہرا کر گنگناتے ہوئے کہا۔

''نہ تو تو پہلے شیدائی ہے تجھے کسی نے کیا کرنا ہے، یہ بول ہمیں پاگل دیدہ پھٹی سمجھتے ہو جو گند مند ادھر بیچ جاتے ہو۔''

اب تائی باقاعدہ لڑنے کے لیے آگے آگئی تھی۔ وہ بے نیاز سا بنا سڑی ہوئی ہری مرچیں اور ٹماٹر احاطے کے کوڑے دان میں اچھالنے کے بعد اب سبزیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

''بھنڈیاں کس طرح ہیں؟'' سامنے والے حنیفے کی بیوی نے جھگڑا شروع ہونے سے پہلے کے وقت کو غنیمت جان کر قیمت پوچھتے ہوئے صاف صاف بھنڈیاں چننا شروع کر دیں اور اس کے ترازو میں ڈالنے لگی۔

''پورے پانچ کلو کی پالک میں سے آدھا کلو بھی نہیں نکلی اور آج جو میں سبزی لوں گی۔ تجھے ایک دھیلا نہیں دوں گی ہاں، سن رکھ۔'' تائی جارحانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھی۔

''تائی یہ ریڑھی میرے ابے کی نہیں ہے۔ نہ سبزی میرے چاچے کے کھیت سے آتی ہے جو لوگوں کو مفت بانٹتا پھروں، جو لینا ہے نقد دام ہے دینے ہوں گے۔ کتنی کردوں بھنڈیاں؟'' وہ خالصتاً کاروباری انداز میں کہتے ہوئے رکھائی سے بولا۔

''نہ ہمارے پیسے بھی کوئی درختوں پہ نہیں لگتے نہ زمین سے اگتے ہیں کہ تمہیں گندمند کے بدلے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالتے جائیں۔ خون پسینہ کر کے بچے چار پیسے کما کر لاتے ہیں اس لیے نہیں کہ انہیں رات کو چج (ڈھنگ) کی روٹی بھی نصیب نہ ہو۔'' تائی کون سا دبکنے والی تھی اس سے بھی بلند آواز میں چلائی۔

''بس کلو کر دو۔'' حنیفے کی بیوی نے جلدی سے روپے نکال کر اس کے ترازو میں رکھے اور بھنڈیاں لے کر چل پڑی۔ وہ کتنی دیر سے تاک میں تھی تائی اور دینے کے درمیان جھگڑا بڑھ گیا۔

اس نے چپکے سے دونوں کی سائیڈ سے ہو کر دو موٹی موٹی نیچے جھولے میں پڑی گاجریں اٹھائیں اور احاطے کے آگے سے گزرتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔

''اے......اے کیا لے کر گئی۔'' دینا لڑائی میں ایسا بھی گم نہیں ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف لپکتا۔ وہ گاجریں جھولی میں چھپائے کسی مشاق ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی اونچے اونچے پائدان والی سیمنٹ کی سیڑھیاں دو دو کر کے پھلانگتی چلی گئی۔

''تو بچے گی نہیں مجھ سے، کل سہی، نظر آئے تیری ماں......'' دینے نے غصے میں لال پیلے ہوتے ہوئے موٹی سی گالی بکی اور وہ سیڑھیاں پھلانگتی آخری زینے پر پہنچ کر دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے ہنسے جارہی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آگیا لال سرخ تپتے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپا کر اس نے جھولی میں پڑی گاجروں میں سے ایک اٹھا کر دامن سے خوب رگڑا اور کچر کچر کھانے لگی۔

☆☆☆

''افوہ! اب یہ کیوں آگئے ہیں بھلا؟'' وہ جیسے ہی گیٹ کھول کر گاڑی اندر کرنے لگی۔ راشد انکل کی گاڑی دیکھ کر مارے کوفت کے پاؤں پٹخ کر رہ گئی۔

وہ دبے پاؤں ڈرائنگ روم کے آگے سے گزری تھی۔ کم از کم اب وہ اس شاطر بوڑھے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی جو سویٹی پریٹی ایما کہہ کہہ کر اسے بیوقوف بناتا رہا۔

شاید میرے اس پیغام کا غصہ چڑھا ہو جو صبح اس کے سیکرٹری کو دے کر آئی تھی۔

کمرے میں آکر اس نے کیچر سے سلکی براؤن بالوں کو آزاد کیا اور جلدی جلدی برش کرنے لگی۔ واش روم جا کر خوب اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا اور باہر آگئی۔

''اب یہ سنکی کب جائے گا۔ بھوک لگ رہی ہے۔ خالہ بی نے اللہ جانے کیا پکایا ہوگا۔ ان کا بھی تو موڈ اچھا نہیں تھا کہ میں پیسے کیوں واپس دینے جارہی ہوں۔ آخر ہم کہاں سے کھائیں پئیں گے۔ اب مجھے جاب کرنا ہوگی۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سلجھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''تمہیں بلا رہے ہیں وہ، آکر بات سن لو۔'' خالہ بی نہ جانے کب کمرے میں آئی تھیں رکھائی سے بولیں۔

''میں، میں کیا بات کروں گی۔ آپ کرلیں۔'' وہ جھلا کر بولی۔

''میں ان پڑھ جاہل۔ میں کیا بات کروں گی۔ انہوں نے تم ہی سے بات کرنا ہے۔ جاؤ سن لو۔'' وہ اس کا جواب سنے بغیر لوٹ گئیں۔

''افوہ! اب کیا مصیبت ہے۔'' اس نے، برش بیڈ پر اچھالا، بالوں کو دوبارہ کیچر میں جکڑا معاً اسے کچھ خیال آیا۔

مڑ کر الماری کھولی اور وائٹ سوٹ کے ساتھ لٹکا بلیک اسکارف اتار کر گلے میں ڈال لیا اور باہر نکل آئی۔

''ایسی بھی کیا ناراضی کہ ہائے ہیلو سے بھی گئے۔'' وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ وہ بے تکلفی سے اسے دیکھتے ہی بولے۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

''میں تھکی ہوئی تھی سوری۔'' اس نے بدقت لہجے کو نارمل رکھا۔

''کہاں سے آرہی ہو؟'' انہوں نے بڑے استحقاق بھرے انداز میں سوال کیا تھا اسے غصہ تو بہت آیا مگر پی گئی۔

''یونہی فرینڈز کے ساتھ۔'' وہ کندھے اچکا کر کارنر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اگر موڈ ہو تو باہر چلیں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' ان کے چہرے

پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

''بات تو مجھے بھی آپ سے کرنی ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر آہستگی سے بولی۔

''اوکے تو چلو پھر باہر چلتے ہیں۔ ڈنر بھی ہو جائے گا اور دو طرفہ ضروری باتیں بھی۔'' وہ ایک دم سے گاڑی کی چابی اور سیل فون اٹھاتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ وہ کچھ متذبذب سی بیٹھی رہی۔

''چلو اب کیا سوچنے لگیں۔'' وہ اس کے پاس آکر بولے لائٹ گرین کلر کے قیمتی سفاری سوٹ میں وہ کافی اسمارٹ اور ڈیسنٹ لگ رہے تھے اور یقیناً اس سے مخلص بھی۔

''چلو ان کے خلوص کو بھی ناپ تول لیتے ہیں۔'' وہ فیصلہ کر کے کھڑی ہوگئی۔

خالہ بی کو بتا کر وہ ان کے ساتھ فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے آرام سے بیٹھ گئی۔ گاڑی میں اے سی چل رہا تھا اور گاڑی میں پھیلی نرم خوشبو نے ماحول کو ایک دم معطر ہی نہیں رومانٹک بھی بنا ڈالا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے راشد انکل کی طرف دیکھا ان کا پورا دھیان ڈرائیونگ کی طرف تھا۔ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے مضبوط ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے، لب بھینچے اسے بے ساختہ پاپا کی یاد دلا گئے۔

وہ بھی تو اس طرح ڈرائیونگ کیا کرتے تھے۔ بالکل مگن انداز میں اور اسے بھی اکثر کہتے رہتے تھے کہ جب کوئی شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسٹیئرنگ گھما رہا ہوتا ہے تو وہ نا صرف اپنی بلکہ دوسرے جو بھی اس کے ساتھ بیٹھے ہیں ان کی موت اور زندگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اپنی توجہ صرف اور صرف سڑک اور گاڑی کی حرکت پر رکھنی چاہیے۔

''پاپا! آپ جو اس فیملی کے ڈرائیور تھے۔ آپ نے ایک بار بھی میری زندگی کے بارے میں نہیں سوچا یا آپ کو یاد ہی نہیں رہا کہ آپ دونوں کے ساتھ میں بھی اس گاڑی میں سوار ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' انہوں نے ہالی ڈے ان کے سامنے گاڑی پارکنگ ایریے کی طرف لے جاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔ وہ چپ رہی۔

''کیا منگوائیں؟'' انہوں نے مینیو کارڈ اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

''جو آپ پسند کریں۔ میرا موڈ کچھ کھانے کا نہیں ہے۔'' اس نے کارڈ کھولے بغیر میز پر ڈال دیا۔

انہوں نے ایک حیران سی نظر اس پر ڈالی اور پھر کندھے اچکا کر مینیو کارڈ دیکھنے لگے۔

کھانا دونوں نے بے حد خاموشی سے کھایا۔

اس کا تو یوں بھی دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی تھوڑے سے چاول لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ان

کے اصرار پر بھی اس نے مزید کچھ نہیں لیا۔

''کیا بات کرنی تھی تم نے مجھ سے؟'' کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے نیپکن سے ہاتھ اور منہ کے کنارے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''بہتر ہے پہلے آپ کہہ لیں۔ میری بات تو بے حد مختصر سی ہے۔'' اس نے ان کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

''نہیں، پہلے میں تمہاری بات سننا پسند کروں گا۔ یوں بھی لیڈیز فرسٹ ہوتا ہے۔'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا تو اس نے بھی ضد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''مجھے جاب کرنی ہے۔ اے لیول ادھورا ہے اسے مکمل کرنا ہے اور پارٹ ٹائم جاب اور...... بس۔'' تیسری بات کو اس نے منہ میں ہی روک لیا۔

''مجھے بے حد افسوس ہے کہ طاہر نے تمہارے لیے کچھ خاص...... بلکہ کچھ بھی نہیں...... میں نے سمجھایا تھا اسے، اور وہ خود اس بارے میں بے حد فکر مند تھا مگر اس کے مسئلے کی نوعیت ایسی تھی کہ میں زیادہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔'' وہ چونکی۔

''کیسا مسئلہ؟''

''تمہاری مدر کو گزشتہ آٹھ سالوں سے بلڈ کینسر تھا اور وہ ہر سال ان کا بلڈ چینج کرواتے...... ایک تو یہ بیماری جان لیوا پھر بے حد مہنگا علاج حالانکہ بھابی اس بات کے خلاف تھیں کہ سارا پیسہ ان کی بیماری پر لگا دیا جائے۔ ایسی بیماری پر جس میں بچنے کے چانسز بے حد مائنر تھے مگر طاہر کی جان تو بھابی میں تھی اسی وجہ سے تو وہ گزشتہ آٹھ سالوں سے کوئی بھی کام جم کر نہیں کر سکا۔ ہر وقت تو بھابی کی حالت...... اور وہ دونوں تمہیں یہ سب بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے پھر بھابی...... حالانکہ سب جانتے ہیں کینسر خدانخواستہ کوئی وائرس بیماری نہیں ہے مگر انہیں وہم تھا کہ خدانخواستہ تمہیں ساتھ رکھا تو یہ موذی بیماری کہیں تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے...... اور دوسرے۔'' وہ رکے۔

''اور دوسرے!'' وہ بے چینی سے بولی۔

''وہ تمہیں خود سے دور رکھ کر انڈیپنڈیٹ کرنا چاہتے تھے کہ تم ان کی محبت میں انوالو نہ ہو۔ عجیب منطق تھی ان کی، تمہیں خود سے دور رکھ کر خود بھی بے چین رہے اور تمہیں بھی رکھا اور طاہر کے لیے تو وہی بات سب سے مقدم تھی جو شائلہ کہتی۔ بہر حال...... یہ قدرت کا فیصلہ تھا کہ شائلہ بھابی کی ڈیتھ اس بیماری سے نہیں ہوئی جس کے سائے ان دونوں کو رات دن خوفزدہ کرتے رہتے تھے اور شاید یہ ان کی سچی محبت کا نتیجہ تھا جو دونوں اکٹھے ایئر کریش میں''...... وہ چپ ہوگئے۔

وہ دونوں کتنی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"تو اب تم جاب کرنا چاہتی ہو۔" اس خاموشی کو انہوں نے ہی توڑا۔ "ابھی تمہاری تعلیم بھی مکمل نہیں پھر اکیلے رہنا۔"

"میں عادی ہوں اور خالہ بی نے بھی اپنے گھر جانا ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"میرے پاس اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔" وہ چند ثانیے بعد بولے تو وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے میری مسز ایک زمانہ پہلے مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں۔ دو بیٹے تھے دونوں کی پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا۔ اللہ کا شکر ہے دونوں یو کے میں سیٹل ہیں۔ شادیاں بھی کرلیں، خوش باش ہیں۔ مجھے ان کی طرف سے کوئی فکر نہیں۔ اب اپنے بارے میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو عجیب سی تنہائی ڈستی ہے۔ پہلے میں نے اس بات پر نہیں سوچا تھا مگر کل تم رقم واپس کر کے گئیں تو اس چیز نے میرے دماغ کو کلک کیا۔" وہ رکے۔ "اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا......"

"کیا؟" وہ چلاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔



"تمہیں آج کہیں جانا نہیں کیا؟" وہ دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے سنگل بیڈ پر لیٹا چھت کو تکتے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا، جب رضوان نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں۔" اس نے لب ہلائے بغیر مبہم سا ہنکارا بھرا۔

"ذرا اپنے دوست شہزاد سے کہہ کر چند گھنٹوں کے لیے گاڑیاں تو دلوا دو۔ نمبر ملاؤں اس کا۔" رضوان اس کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خوشامدی سے لہجے میں بولا۔ سیل فون ہاتھ میں لیے وہ نمبر ملانے کے لیے تیار تھا۔

"وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔" شہریار نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس طرح لیٹے لیٹے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

"حد ہے اپنی قسمت ہی خراب ہے۔" رضوان نے بے دلی سے موبائل جیب میں رکھ لیا اور کرسی سے سر ٹکا کر مایوس سا بیٹھ گیا۔

"آج کس کے ساتھ ڈیٹ مارنے جا رہے ہو؟"

"تم نہیں جانتے۔" رضوان گہرا سانس لے کر بولا۔

"کوئی نیا آئٹم ہے کیا؟"

"یہی سمجھ لو۔"

وہ ذرا سا کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا اور رضوان کو دیکھنے لگا۔ "تمہیں ڈر نہیں لگتا جو اتنی کلر فل زندگی کا سورج وقت سے پہلے غروب ہو جائے وہ بھی ایک انتہائی تکلیف دہ انداز میں۔"

"اوکم آن بوائے! یہ طلوع غروب کے بارے میں اس عمر میں کون سوچتا ہے یہاں تو لمحہ موجود کی ویلیو ہے ایک ایک لمحے سے خوشی کا رس کشید کرو۔ یہ رس زہر بنتا ہے یا تریاق۔ ان ہوش ربا لمحات میں کون احمق سوچتا ہے بھلا اور تم جیسا شخص آنے والے وقت کی سنگینی سے خوفزدہ ہو کر حال کی خوشیوں سے تائب ہونے والا پہلا ٹھنڈا ٹھار نوجوان دیکھا ہے ورنہ ادھر اپنے ہاسٹل میں دیکھ لو۔ تمہارے جیسا ایک پیس بھی نہیں ہوگا۔ اب گاڑی کا کیا کروں۔ چھ بجنے والے ہیں۔" رضوان بولتے ہوئے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

''تمہارا کیا خیال ہے یہ زندگی کے مزے اس کے عیش، شاموں کی رنگینیاں مجھے اٹریکٹ نہیں کرتیں کیا؟'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''لگتا تو ایسے ہی ہے۔'' رضوان نے بے توجہی سے جواب دیا۔ اس کی بے چین نگاہیں اب بار بار گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔

''ان رنگینیوں، ان لذتوں، ان مسرتوں اور خوشیوں کے لیے میں آج سے نہیں، شاید جب سے لاشعور نے شعور کے آنگن میں آنکھ کھولی ہے میرا دل لحہ لحہ ان کو پانے کے لیے تڑپ رہا ہے۔'' وہ رک رک کر بولا جیسے کوئی منظر نگاہوں میں اتر رہا ہو۔

''تو پھر کیوں ترساتے ہو خود کو، اپنے دل کو، لعنت بھیجو ان اخلاقیات طبیعات اور نفسیات پر۔'' رضوان پر اب شدید بے چینی غالب آرہی تھی اور آدھے دماغ کے ساتھ شہریار سے باتیں کر رہا تھا۔

''مجھے تم لوگوں کی طرح یہ ساری خوشیاں، لذتیں اور نعمتیں وقتی طور پر حاصل نہیں کرنی۔ مجھے تو ہمیشگی والی خوشیاں اور نعمتیں چاہئیں دوست! تھوڑا انتظار جان لیوا سا تو ہوگا مگر میں اپنے حصے کی خوشیاں پا کر رہوں گا، بلکہ اپنے حصے سے بھی کچھ زیادہ۔ اس وقت شاید تم......''

''ویسے یار! غلط تم بھی نہیں کہتے۔ اب تو کبھی کبھار میں تمہارے خطوط پر سوچنے لگتا ہوں۔ یوں بھنورے کی طرح کلی کلی منڈلانا...... اور یہ کیسی تشنگی ہے جو ڈال ڈال پھرنے پر بھی جیسے صدیوں کے پیاسے رہتے ہیں۔ یہ کیا جنون ہے۔'' رضوان ایک دم سے کرسی پر بیٹھا اور لحہ بھر کے توقف کے بعد کہتا چلا گیا۔

''جنون کو تو تم نے خود اپنے سر پر طاری کر لیا ہے پھر یہ پیاس تو ہوگی اور رہے گی۔ کبھی نہیں ختم ہوگی۔'' شہریار اٹھ کر بیٹھ گیا

''ڈراؤ تو مت یار! میں تو اب اکثر......'' وہ رکا شہریار کو دیکھا ''چھوڑنا چاہتا ہوں ایک پاکیزہ نہ سہی مگر ڈسپلنڈ لائف گزارنا چاہتا ہوں مگر یہ ہوس کی دلدل ایسی ہے جس میں کوئی ایک بار قدم دھر دے تو پھر پہلا قدم ہی نکالنا ناممکن ہو جاتا ہے، ویسے اب میں تھوڑا سیریس ہو رہا ہوں۔''

''یعنی تائب ہونے کے لیے؟'' شہریار فوراً بولا۔

''نہیں بلکہ صرف دو یا تین کے ساتھ کانٹیکٹ میں رہنے کے لیے۔''

''لعنت ہو تم پر یعنی حرام کاریاں نہیں چھوڑنی۔''

''گویا تم کبھی طلسم ہوشربا میں قدم نہیں رکھو گے، ایک بار اے بلاک کی آنٹی زہرا ایمان کے ہاں میرے ساتھ چلو۔ سارے خیالات ساری پاکیزگی اور حاشیہ بندی آبی بخارات کی طرح

کہیں ہوا میں تحلیل ہو جائیں گی۔ چلو آج تمہیں ادھر ہی لے چلوں۔'' رضوان ایک دم پُر جوش ہو کر اٹھا۔

''جانے دو تم پر میری ساری بک بک کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ آج کل، اور پلیز یہ قیامتوں کے لالچ مجھے مت دو۔ ان ساری قیامتوں کو اپنی گنہگار بلکہ معصوم نگاہوں سے اس وقت سے دیکھ رہا ہوں کہ جب ان نگاہوں کو ان قیامتوں کے مفہوم اور ڈھائے جانے کے اثرات کا بھی نہیں پتا تھا۔'' وہ پھر نگاہیں کسی منظر پر جماتے ہوئے بولا۔

''گویا پرانے پاپی ہو؟''

''پرانا پاپی!'' شہریار استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ایسا پاپی جسے پاپ سے ایسی نفرت ہو جائے کہ......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''چھوڑو کوئی اور بات کرو یار! تم شادی کرلو ان قیامتوں اور سنگینوں رنگینیوں سے جان چھوٹ جائے گی۔'' شہریار نے فوراً مشورہ دیا۔

''اچھا سوچیں گے۔'' رضوان جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''تمہاری پروموشن کا کیا بنا؟'' شہریار نے پوچھا۔

''عنقریب متوقع سمجھو۔ باس کو خوش کر دیا ہے آنٹی زہرا کی قیامتوں نے، اپنی اے سی آر زبردست کر دی ہے، وہ بھی ایسے کہ مکمل رازداری بمعہ پردہ داری بے چارے منکر نکیر کو بھی شاید ہی پتا چلنے دیا ہو میں نے کہتا ہوں تمہارے الیاس بھٹی صاحب بھی......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ باس تو خوش ہو جائے پر اس کلف لگے بے داغ کپڑوں پر جو کالک لگے گی، وہ مجھے گوارا نہیں۔''

''کیا مضبوط بلکہ آئرن مین ہو۔ کیا کبھی کسی پر دل نہیں آیا؟''

''سچ بولوں آج......'' وہ اس کے بالمقابل آکر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں۔'' وہ اس کی کیفیت سے کچھ گھبرا کر بولا۔

''نفرت ہے مجھے جسم کی اس سستی نمائش سے...... اس سستی نمائش کے ہاتھوں میرے بدن نے نہ سہی مگر میری روح نے ایسے زخم کھائے ہیں کہ آج تک گھائل ہوں اور ان زخموں کا مرہم اتنے سالوں میں بھی کہیں سے نہیں مل سکا۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''تم مجھے کہہ رہے تھے نا کہ شادی کرلوں گھر بسالوں تو سچ کہوں میں بھی۔'' رضوان بولا، شہریار اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میں بھی آج کل یہی سوچ رہا ہوں۔''

اس نے حیرت انگیز طور پر برا مانے بغیر آرام سے کہا اور بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”ریئلی!“ رضوان کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ ”تو کوئی ہے نظر میں، میرا مطلب ہے کسی کو پسند کرلیا ہے؟“

”ابھی ایسی تو کوئی خاص بات نہیں، مگر ہو بھی سکتی ہے۔“ وہ مبہم سے لہجے میں بولا۔

”گویا ہم سے پردہ داری، سپنوں کی رانی مل گئی تمہیں؟“

”ملی تو خیر نہیں ابھی۔“ وہ پھر سے نگاہیں کسی نہ نظر آنے والے منظر پر جما کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”گویا آثار ملنے کے ہو چلے، چلو یار! ہم تو تمہیں دعا ہی دیں گے کہ تمہیں تمہاری سوچوں جیسی پاکیزہ اجلی محبت مل سکے۔“

”تمہیں میرے خیالوں کا کیا پتا، دوست! مجھے کیسی محبت چاہیے۔“ وہ پھر سے خیالوں میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”یعنی تمہارے بارے میں اتنا کچھ جان کر بھی مجھے پتا نہیں اب یہ تو نہ کہو۔“ رضوان برا سا مان کر بولا۔

”نہیں میرے دوست! اتنا کچھ کیا، تم سب کچھ بھی جان لو تب بھی کسی کے کیا اپنے بارے میں بھی درست پیشین گوئی نہیں کرسکتے۔“ اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے پرے رکھا تکیہ اپنے چہرے پر رکھا اور لیٹ گیا رضوان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر کندھے اچکا کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”یہ...... یہ کہا...... یہ اس بڈھے کھوسٹ نے؟“

خالہ بی کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا تھا۔ ساری بات سن کر...... کتنی دیر تو وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی تھیں، جیسے اس کی بات سمجھ میں آئی ہو نہ الفاظ، پھر شاید ذہن میں ایمن کے الفاظ کی بازگشت گونجی تو اس سے وہ کچھ مفہوم اخذ کرکے بے ربط سا جملہ بولی تھیں۔

ایمن نے جواب دیے بغیر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آئے ہائے! میں مرگئی قرب قیامت......“ انہوں نے بے حال سا ہوتے ہوئے اپنے سینے پر ہتھڑ مارا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ابھی تو اٹھارواں سن لگا ہے...... اٹھارواں بھی کیا......“ وہ اپنی یادداشت کی پوٹلی کھنگالتے ہوئے وہ دن یاد کرنے لگیں جب ایمن پیدا ہوئی تھی۔ موسم کیسا تھا گرمی کا یا سردی کا، دن

بڑے تھے کہ راتیں اس سال کون سا کوئی خاص بڑا واقعہ ہوا۔ عراق کویت کی جنگ یا ایران عراق کی جنگ پاکستان میں کس کی حکومت تھی۔ ان دنوں ان کی بیوی کو کون سا سال لگا تھا۔ اپنے بچے کس سن میں تھے۔

وہ بری طرح سے اس حساب کتاب میں غرق ہوچکی تھیں۔

کتنی دیر اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی کہ ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”اس کے دو بیٹے ہیں ناخیر سے تمہارے اس بڈھے کھوسٹ انکل کے۔“

اس نے گہرا سانس لے کر پھر آہستہ سے سر ہلا دیا۔

”دونوں کو بیاہ چکا ہے تمہاری ماں نے پچھلی بار بتایا تھا مجھے اور دونوں ہی باہر ہوتے ہیں ادھر یہ اکیلا ہی......“ وہ رکیں ”اور سنو وہ جو تم اپنے اس موئے لڑکی نما دوست (گولڈی) کے چچا جو وکیل ہیں، ان کے پاس گئی تھیں کیا کہہ رہے تھے وہ؟“ وہ بجھتی راکھ کرید کرید کر کوئی امید کی چنگاری برآمد کرنا چاہ رہی تھیں۔

”بتایا تو تھا آپ کو۔“ وہ اکتا کر صوفے کی پشت پر سر گراتے ہوئے بولی۔

”بھلا دوبارہ بتا دو تو کوئی بل آجائے گا تمہیں؟“ وہ چمک کر بولیں ”بڈھا دماغ ہے ادھر سنا ادھر چوپٹ۔“

”کچھ نہیں چھوڑ کر گئے ہیں وہ دونوں میرے لیے، آج آپ ایک بات مجھے بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دیجیے۔ پلیز اس کے بعد دوبارہ کچھ نہیں پوچھوں گی۔“

وہ ایک بار پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولی۔ اب کے اس کے لہجہ میں ہی نہیں دیکھنے کا انداز بھی بدلا ہوا تھا، خالہ بی یونہی اپنے دوپٹے کا کونہ ٹٹولنے لگیں۔

”میں واقعی ان دونوں کی سگی بیٹی ہوں یا انہوں نے مجھے کسی یتیم خانے یا راہ چلتے کسی رستے سے اٹھایا تھا؟“ وہ بہت ضبط کررہی تھی اور اس کوشش میں اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

خالہ بی نے حیرت کے اظہار کے طور پر انگلی اپنے آدھ کھلے لبوں پر رکھ لی اور اچنبھے سے اسے دیکھنے لگیں۔

”بتائیں نا خالہ بی مگر بالکل سچ۔“ ان کے ایسے خاموش اور تحیرانہ انداز نے اسے کچھ اور مشکوک سا کردیا تھا، وہ تھوڑا سا آگے ہو کر پوچھنے لگی۔

”اے بیٹی! اللہ اللہ کرو کیوں مرے ہوئے ماں باپ پر بہتان باندھتی ہو۔ بچے ماں باپ کو مرنے کے بعد ایصال ثواب پہنچانے کو ان کے لیے نیک دعائیں کرتے ہیں اور تم ان پر بہتان باندھ رہی ہو۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں قدرے خفا سا ہو کر بولیں۔

"اس میں بہتان کی کیا بات ہے جو کچھ وہ کر کے گئے۔ ایک چیز بھی میرے لیے نہیں چھوڑ کر گئے۔ ایسا ظلم تو کوئی فقیر ماں باپ بھی اپنی اکلوتی اولاد پر نہیں کرتے جبکہ انہیں علم ہو...... پھر میں کون سا اپنے پیروں پر کھڑی تھی جو وہ بے فکر ہو کر سب کچھ بیچ باچ گئے گھر تک۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولتے ہوئے سر جھٹکتی رہی۔

"بیچ باچ تو بے چارے اس لیے گئے۔ بتایا تو تھا تمہیں تمہاری ماں کا بڑا آپریشن تھا لاکھوں سے بڑھ کر رقم درکار تھی پھر انہیں تو امید تھی ہر کسی کو ہوتی ہے زندگی کی خواہش رکھنے کی...... چلو آپریشن تمہاری ماں کا تھا۔ اللہ کی مرضی ہوتی تو کامیاب ہوتا یا...... جو بھی اللہ کو منظور ہوتا پر تمہارا باپ تو خیر سے زندگی کی پوری امید لے کر لوٹتا۔ مجھے خود جاتے ہوئے کہہ کر گیا۔ خالہ بی! سب کچھ ختم ہوتا جا رہا ہے بس آپ دعا کریں۔ شمائلہ کی زندگی بڑھ جائے تو واپس آ کر نئے سرے سے سب شروع کروں گا اور محنت بھی۔ بس اس طرف سے مجھے بے فکری ہو جائے...... اور دیکھو کیسی رب نے اس کے لیے بے فکری لکھ دی کہ بے چارہ ہاہ آہ صحیح کہتے ہیں کسی کو آنے والے اگلے پل کا نہیں پتا۔ آپریشن کامیاب ہو گیا تو جہاز تباہ ہو گیا اب بتاؤ۔ اس میں ہم کسے الزام دیں۔" بولتے بولتے ان کی آواز بھر آئی۔

اسی طرح جب بھی وہ ماں باپ کے خلاف بولنے لگتی خالہ بی ان دونوں کی مدد کو میدان میں اتر آتیں، یوں تو وہ خود بھی ان دونوں سے بے حد نہ سہی مگر بہت پیار دل میں رکھتی تھی پر ایسی عجیب سی سچویشن کا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یوں جیسے ہر طرف سے اسے یکسر و تنہا بے آسرا و بے سہارا کر دینے کی سازشیں کی جا رہی ہوں اور اس سازش میں بڑا ہاتھ اسے اپنے مرے ہوئے ماں باپ کا ہی نظر آتا۔

"اچھا چھوڑو انہیں اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ان کی قبروں کو ٹھنڈا رکھے۔ دنیا میں وہ کون سا بہت خوش رہے......" ان کے اس جملے پر ایمن نے بے یقین سی نظروں سے خالہ بی کو دیکھا۔ اس کے ماں باپ سے زیادہ خوش باش اور زندگی کے لمحے لمحے سے خوشی و مسرت کشید کرنے والا جوڑا اس نے اور کوئی نہیں دیکھا تھا۔

"بیماری جو تمہاری پیدائش کے ساتھ تمہاری ماں کی جان سے لگی اس کی جان لے کر ہی ٹلی۔"

"میں آپ سے کیا پوچھ رہی تھی۔ کیا میں ان کی حقیقی بیٹی تھی؟"

"اے اللہ نہ کرے۔ کیوں نہیں تھی۔ خود میں شمائلہ کے نو مہینوں میں سے سات مہینے اس کے ساتھ رہی۔ آخری وقت جب اسے درد لگے ہیں میں ہی تو تھی جس نے فون کر کے تمہارے

باپ کو گھر بلوایا اور اتنے مہنگے اسپتال میں...... جب نرس نے بچی پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ میں نے اسے تمہارا گلابی رنگ کا ننھا سا فراک دیا اور اس نے تمہیں لا کر میری گود میں دیا تمہارے باپ کے ساتھ یہ موا تمہارا انکل بھی تو تھا۔ گڑیا، بے بی، میری بیٹی کہہ کہہ کر تمہیں گود میں لیے جا رہا تھا کہ میرے بیٹوں کی بہن آ گئی اور اب...... بڈھی گھوڑی لال لگام حیا نہ آئی اسے یہ بات کہتے ہوئے۔" وہ بولتے بولتے پھر طیش میں آ گئیں۔

ایمن جھاگ کی طرح ٹھنڈی ہو کر بیٹھ چکی تھی اور اس میں کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ کے ہاتھوں اس کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ ماما کی بیسٹ فرینڈ تھیں اکثر ان کی گیٹ ٹو گیدر میں آتی رہتی تھیں۔ اسے پنکی اور باربی کہہ کر چھیڑتی رہتی تھیں۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک لمحہ لمحہ کی تصویریں مووِیز اسے اور کیا ثبوت چاہیے تھا۔ خالہ بی کی حیرت بے جا نہ تھی۔

"دیکھو۔ کیا زمانہ آ گیا۔ تم کیا جواب دے کر آئیں۔"

انہوں نے یوں پوچھا جیسے اس کے جواب کے بارے میں انہیں کوئی شک تھا۔ ایمن نے بھی شکایتی نگاہ ان پر ڈالی اور چپ رہی۔

"ویسے میں کہوں۔" وہ بولیں اور چپ کر گئیں۔ ایمن نے اچٹتی سی نگاہ ان پر ڈالی اور سر پیچھے گرا کر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

"بچا کیا ہے تمہارے پاس اب؟" وہ ہولے سے بولیں ایمن اس طرح بے آس سی پڑی رہی۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"سنو ایمن! ایک بات آئی ہے میرے دل میں۔" وہ ذرا آگے ہو کر بولیں۔

ایمن نے اسی طرح سر گرائے آنکھیں موندے رکھیں۔

"بات تو سن میری بیٹی۔" وہ پُر جوش سے انداز میں اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور بڑے پیار سے اس کے ماتھے پر پڑے بالوں کو سنوارنے لگیں۔

"اگر تم ذرا سوچو، عقل سے کام لو۔ میرا مطلب تحمل اور ٹھنڈے دل سے سوچو۔" وہ نہ جانے کس بات کے لیے تمہید باندھ رہی تھیں۔ ایمن نے ترچھی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"ویسے میں کہوں جیسی اچھی شہزادیوں والی آرام طلب خوب آسائشوں والی زندگی تم نے گزاری ہے، گزار رہی ہو۔ کبھی تنگی ترشی نام کو نہیں دیکھی نہ چکھی جو معلوم ہو تلخی کس چڑیا کا نام ہے یا مشکل کسے کہتے ہیں اور میری دعا ہے اللہ نہ کرے میری بچی! تم کبھی کسی مشکل کسی کڑے وقت کا سامنا کرو جیسے ماں باپ نے پھولوں کی طرح رکھا آئندہ زندگی میں بھی ایسی خوشی بھری بہاروں اور

راحتوں میں جیتی رہو۔ آباد رہو۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے پھر ادھوری تعلیم، سر پر اپنی چھت نہ کوئی قریبی عزیز رشتہ دار ایسا جو ایسے مشکل وقت میں سہارا دے سکے، محبت کی چھاؤں دے سکے۔ سوچتی ہوں تو کلیجہ کٹ کر رہ جاتا ہے بھلا ابھی تمہاری۔"

"پلیز خالہ جی! میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہے آپ کو جو کہنا ہے۔ ایک ہی بار میں کہہ ڈالیں یوں بار بار زخموں کو ادھیڑ کر ان پر نمک پاشی کیوں کر رہی ہیں۔ پہلے ہی۔ میں کتنی ڈسٹرب ہوں۔ آپ کو کیسے بتاؤں۔" وہ ایک دم بے قراری سی ہو کر اٹھی اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"ہاں وہی تو کہہ رہی ہوں، ذرا سی بیٹھو تو آرام سے میری بات سنو۔" وہ اس کو جاتا دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ لہجے میں لجاجت سی تھی۔

"ایسے ہی بتا دیں جو کہنا ہے۔" وہ اکتاہٹ میں کھڑے کھڑے بولی۔

"دیکھو عقل مندی کا تقاضا تو یہی ہے اور جو ذرا سوچا جائے غلط تو ایسا اس نے بھی نہیں کہا۔" وہ باوجود کوشش کے ایک جملے میں اپنی بات نہ کہہ سکیں۔ ایمن نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کس نے؟"

"وہ تمہارے انکل راشد نے، ہے نا؟" وہ نظریں چرا کر بولیں۔

"کیا مطلب......؟" وہ پورے کا پورا گھوم گئی۔

"مطلب دیکھو نا، بیٹے تو اس کے بیاہے ہوئے ہیں اپنے گھروں زندگی میں سیٹ، بڈھے کے پاس دولت کا خزانہ ہے اور عمر بھی دیکھنے کو اتنی کون سی ہے تمہارے باپ کا ہم عمر یا تھوڑا سا زیادہ تو آج کل مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔ اس کی جیب دیکھتا ہے اور اس کی جیب تو کئی بینکوں میں نہ سمائے اگر تم ٹھنڈے دل سے سوچو تو ایسی کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ عیش بھری زندگی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر......"

"خالہ بی پلیز......" وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لب کچل کر اس نے خود کو جبراً روکا، آنکھوں میں تحیر بھری وحشت اور نمی سی لیے وہ لحہ بھر انہیں دیکھتی رہی اور پھر دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"لو بھلے کا زمانہ نہیں۔ ایسا کون سا برا مشورہ دیا ہے میں نے، اچھا ہے زندگی سنور جائے گی۔ میں اب کیا عمر بھر اس کی دُم سے بندھی بیٹھی رہوں۔ اپنا بھی گھر بار ہے میرا بچوں کو دیکھے مہینے بیت گئے۔ ماں باپ اچھا مجھے مصیبت میں ڈال گئے۔ اچھا ہوتا کہ میں پہلے ہی آئی نہ ہوتی۔ میں نے تو سوچا تھا، اس بار طاہر میاں سے بیٹے کے گھر کے لیے دس پانچ لاکھ لے جاؤں گی اور جو مجھے پتا ہوتا کنگلے ہوئے پڑے ہیں تو کبھی ادھر آتی ہی نہیں، اچھی بلا میرے گلے پڑ گئی۔" وہ لبوں میں

بڑبڑاتے ہوئے عشاء کا وضو کرنے چل دیں۔

☆☆☆

وہ بہت دنوں بعد اس کمرے میں آئی تھی۔

اس ماسٹر بیڈ روم کی ...... سب سے خوب صورت اور فوراً اٹریکٹ کرنے والی چیز اسے سامنے دیوار پر لگی ماما پاپا کی وہ تصویر لگتی تھی، جو ان کی فرسٹ ویڈنگ اینورسری پر بنوائی گئی تھی۔ اتنی خوب صورت، اتنی جان دار کہ آنکھوں کو لگے یہ دونوں مسکراتے زندگی کی سرخیوں سے سجے یہ چہرے اور جگنوؤں کی سی چمک لیے ان کی جگر جگر کرتی آنکھیں زندہ ہیں۔

ہر بار کی طرح وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس تصویر پر نظر پڑتے ارد گرد سے بے خبر ہو چکی تھی وہ دونوں بے تحاشا محبت اور شوق سے پوری وارفتگی اور دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ایما! آؤ میری جان رک کیوں گئیں۔" ماما کی جگر جگر کرتی نگاہوں نے بے اختیار باہیں پھیلا کر اسے اپنی طرف بلایا تھا۔

وہ بے خودی ایک قدم آگے بڑھی تھی۔

"کم آن ایما ڈارلنگ! آج اتنے دنوں بعد کیوں آئیں؟" پاپا کی گھنی براؤن مونچھوں کے نیچے بھرے بھرے سے زندہ لب ہلے۔

وہ ایک قدم اور آگے بڑھی مگر اس کی نگاہوں میں ڈھیر ساری شکایت اُمڈ آئی تھی۔ اس نے وہی گھٹا بھری شکایتی نگاہ سے پاپا کی جانب دیکھا تو وہ اور بھی کھل کر مسکرا دیے جس سے اس کی خفگی اور بھی بڑھ گئی۔

"آؤ نا میری جان! میرے پاس۔" ماما نے محبت بھری مٹھاس سے اسے پکارا ایسی مٹھاس جو ان کے لہجے کا ناگزیر حصہ تھی اور صرف اس کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ وہ سب کے ساتھ ہی ایسے میٹھے لہجے میں بات کیا کرتی تھیں۔ شاید اس مٹھاس بھری گاڑھی محبت نے پاپا کو زندگی بھر کہیں اور دیکھنے یا کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے تو ماما کی ایک مسکراہٹ کے لیے اپنا بزنس، اپنا مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

"پاپا! آپ نے ایسا کیوں کیا؟" بے اختیار وہ مچل کر بولی اور کب کے روکے ہوئے آنسو بہانے لگی۔

"بری بات ایمان! یوں نہیں کرتے، میں تم سے کیا کہہ کر گیا تھا یاد کرو۔ اسے، یاد کرنا بے حد ضروری ہے تمہارے لیے۔" پاپا نے ایک بار پھر اسے سرزنش کی تھی۔

وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے مدد طلب نظروں سے ثنائلہ کی جانب دیکھنے لگی۔ انہوں نے

جیسے کندھے اچکا دیے۔

"یہ تم باپ بیٹی کا معاملہ ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ اس طرح سے بری الذمہ ہوگئیں، جیسے زندگی میں اس کی ہر بات ہر ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جایا کرتی تھیں۔

ایمان کو کون سے بورڈنگ میں بھیجنا ہے۔ یہ پاپا کو دیکھنا ہوتا تھا آج کل کیسا موسم چل رہا ہے اس حساب سے ایما کو کیسے کپڑے لے کر جانے چاہئیں، سبجیکٹ کون سے رکھنے چاہئیں اس بار ان دونوں کے ساتھ چھٹیوں پر ایمان بھی ان کے ساتھ باہر جائے گی یا نہیں جائے گی تو کہاں کہاں؟ اور وہاں جا کر...... ایما ہوٹل میں ٹھہرے گی۔ کاٹیج یا اپارٹمنٹ میں اور وہ دونوں کسی بھی ضروری کام سے باہر جائیں گے یا ایما ان کے ساتھ ہی جائے گی اس کا فیصلہ بھی پاپا کرتے تھے۔

"کیوں؟" وہ اکثر اس کیوں پر گھنٹوں کے لیے اٹک جایا کرتی تھی، اس کی ساری فرینڈز اپنی ماؤں کے بے حد قریب تھیں اور ان کے سارے فیصلے ان کی مائیں ہی کیا کرتی تھیں۔ ان کی شاپنگ ان کی اسٹڈیز سے متعلق ہر فیصلہ ان کی رائے کے بعد، ان کی مائیں ہی ان کے فادرز تک پہنچایا کرتی تھیں جبکہ .... شائلہ وہ ہمیشہ اس کے ہر معاملے سے لاتعلق رہا کرتی تھیں۔

ایک بار اس نے بے اختیار پاپا سے پوچھ ہی ڈالا تھا۔

"تمہاری ماما کو بھی تمہارے ہر معاملے میں فکر ہوتی ہے اور جو فیصلہ میں کرتا ہوں، وہ ہم دونوں کا پہلے سے بحث شدہ ہوتا ہے صرف وجہ یہ ہے کہ تمہاری ماما کی خرابی صحت کے باعث میں انہیں حتی الامکان ٹینشن فری رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں میرا پروا کرنا اچھا نہیں لگتا؟" انہوں نے آخر میں کچھ خفا سے لہجے میں پوچھا تو اس نے بے دلی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر اس کے دل سے یہ کانٹا نہیں نکل سکا تھا۔

بارہا اسے ماما کے لاتعلق رویے سے ایسا لگا کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ وہ اسے کبھی بھینچ بھینچ کر گلے لگا کر بانہوں میں لے کر پیار نہیں کرتی تھیں۔ جب بھی یہ تشنگی محسوس ہوتی تو عجیب سی محرومی اس کے روم روم میں اترنے لگتی۔

پھر اس کیوں کا دائرہ اسے گھنٹوں گول گول چکر دیے رکھتا۔

پھر یوں ہوا وہ بھی محنت سے پڑھائی کے نتیجے میں ملنے والی شاندار نمایاں کامیابی سے بے نیاز ہوتی چلی گئی۔ ماما کے لاتعلق رویے نے اسے خود سے، اپنی ذات سے لاتعلق کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہی بے نیازی جو ماما اس کے ساتھ روا رکھتی تھیں، ایمن نے اپنے ساتھ اور پھر زندگی کے ساتھ روا رکھنی شروع کر دی۔

اس کی یہ دلچسپی شوق جیسے اندر ہی اندر بے آواز سانسوں کے ساتھ مرتا چلا گیا۔ نہ اسے

لڑکیوں کی طرح اچھے فیشن کے مطابق پہننے اوڑھنے کا شوق رہا نہ کسی قرینے ضابطے یا سلیقے میں ڈھلنے کا، یا دوسرے لفظوں میں بے حس ہوتی چلی گئی۔ اس کے اندر کی حساسیت جو بچپن میں اس کی شخصیت کا حصہ تھی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ وہ جو بلی کے بچے کے چھوٹی چھوٹی آواز میں میاؤں میاؤں کرتے اپنی ماں کو تلاشتے دیکھتی تو گھٹ گھٹ کر رونے لگتی۔ اب اکثر ڈرائیونگ کے دوران سڑک پر وہ کئی گاڑیوں کے ایکسیڈنٹ کے بعد پچکے ہوئے ٹوٹے ہوئے مڑے ہوئے ڈھانچے دیکھتی اور ان سے کھینچ کھینچ کر خون میں نہائے ہوئے لوگوں کے زندہ مردہ جسموں کو دیکھتی اور مزے سے چیونگم چباتی میوزک کی دھن پر گنگناتی گزر جاتی۔ اسے دکھ تو کیسا ذرا سا ملال بھی نہ ہوتا۔

وہ اکثر کسی نہ کسی سبجیکٹ میں فیل ہونے لگی۔ ماما کا چہرہ بجھ جاتا جیسے شام کے اندھیرے کنارے پر کسی منڈیر پر رکھا دیا کوئی پھونک مار کر بجھا دے اور اسے ذرا سا بھی دکھ محسوس ہوتا، نہ ڈانٹ اور سرزنش کا خوف الٹا ان کا چہرہ بجھنے پر اس کے دل میں ہلکا سا اطمینان، ابھرنے لگا۔

ہر بڑی سے بڑی بات پر وہ اب بآسانی کندھے اچکا کر کہہ دیتی تھی۔

"آئی ڈونٹ کیئر۔" کچھ عرصہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اس لاپروا اور بے نیاز سے انداز زندگی پر ماما اسے ٹوکیں گی تھوڑا ڈپٹیں گی زندگی اور اس سے وابستہ چھوٹے بڑے معاملات کی اہمیت کے بارے میں اسے سختی سے سمجھائیں گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ سارے انداز جو اس نے ماما کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ان کی تھوڑی ڈانٹ اور سختی سہنے کے لیے اپنائے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے اندر ایسی جڑیں جما کر بیٹھ گئے کہ اس کی شخصیت یکسر بدل گئی۔

پاپا اس کی شخصیت کی اس تبدیلی کا کیا نوٹس لیتے، وہ تو سورج مکھی کا پھول تھے جس کا چہرہ صرف اس وقت کھلتا ہے روشن ہوتا ہے جب سورج کا رخ اس کی جانب ہو ان کی خوشی، ان کا دھیان ان کی توجہ اور نمو کا واحد مرکز ماما کا چہرہ، ماما کی خوشی، ان کی توجہ تھی۔

"کیا کوئی انسان، کوئی شوہر، کوئی مرد، کسی بیوی کا، کسی عورت کا اس قدر دیوانہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی محبت کی دیوانگی میں سگی اولاد کو بھی اکثر فراموش کر دے۔" اس نے خود بارہا اپنے گھر اور دوسری جگہوں پر ہونے والی پارٹیز اور فنکشنز میں سنا کہ ایسی لیلیٰ مجنوں کی جوڑی اکیسویں صدی میں شاید ہی کوئی اور ہو اور اسے یہ کمنٹس سن کر بجائے خوشی اور فخر محسوس ہونے کے تھوڑی کوفت بیزاری اور قدرے خجالت سی محسوس ہوتی۔ جیسے ان دونوں کے درمیان یہ محبت کسی جائز رشتے کے باعث نہیں کسی غیر فطری تعلق کا نتیجہ ہے۔

"ماما بیمار تھیں۔" کب سے۔

اسے یاد نہیں پڑتا پہلی بار اس کی ساعتوں نے یہ جملہ کب سنا بس جب سے اس نے

ہوش سنبھالا تھا ایک ہی جملہ ایک ہی احتیاط ایک ہی سرسراتی سرگوشی اس کے کانوں میں اترتی رہتی۔

"ایما! یوں نہیں کرتے بیٹا! تمہاری ماما بیمار ہیں۔"

"ایما! ایسے بی ہیو کیوں کر رہی ہو۔ ماما پریشان ہوں گی تمہیں معلوم نہیں وہ بیمار ہیں۔"

"تمہارے ایگزام ہیں تم بورڈنگ چلی جاؤ۔ تمہاری ماما بیمار ہیں۔"

ہر موقع پر ہر مرحلے پر ایک ہی جملے ایک ہی تاکید، اصرار کی گردان سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے کہ وہ حلق تک اس جملے سے بیزار ہو چکی تھی مگر صرف ایک چیز جو اسے اس جملے سے حلق تک بیزار کرتی تھی، وہ یہی بیماری تھی۔

پھر ایک دو بار ایسے پاپا کے ایک قریبی دوست کی عیادت کے لیے ان کے ساتھ ہاسپٹل جانا پڑا تو اسے بیمار اور صحت مندی کا فرق واضح ہو گیا۔ وہاں ہسپتال میں لیٹے کمزور نحیف مدقوق پیلی رنگتوں والے بے بس بے رونق چہروں والے کہیں مفلوج اور کہیں بے سکت بدن دیکھنے پر اسے پتا چلا بیمار ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی خوشی اپنی مرضی سے کچھ بھی نہ کر سکیں اس کے باشعور ہوتے دماغ نے پہلی بار بیمار اور صحت مند کے درمیان واضح لکیر کھینچی۔

گھر آ کر ماما کے صحت مند، سرخ و سفید کسی گلاب کی طرح کھلے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ایک بار پھر کنفیوز ہو گئی۔

"اوہ ڈارلنگ! اتنی دیر کر دی۔ مجھے باہر جانا تھا۔ ادھر میرا دم گھٹ رہا تھا۔ صبح سے یہیں بند ہوں۔" سرخ آگ کی طرح دہکتی قیمتی کام والے بارڈر کی سیاہ حاشیے والی ساڑھی میں ہلکے سے میک اپ اور ہلکی سی جیولری میں قیامت ڈھاتی ماما کا حسن دو آتشہ ہوئے جا رہا تھا اور یہ جملے بولتے ہوئے ان کی آواز کا مدوجزر اسے ہی نہیں پاپا کو بھی پریشان سا کر گیا۔

"اوہ سوری ڈیر! ویری سوری۔ تمہیں معلوم تھا۔ مجھے قریشی صاحب کی عیادت کو جانا تھا اور یہ ایما میرے ساتھ......" پاپا فوراً لجاجت بھرے لہجے میں عذر پیش کرنے لگے۔

"اچھا اچھا مجھے معلوم تھا۔ اب چلیں۔" ماما ان کی بات کی طوالت سے گھبرا کر دو قدم آگے بڑھ گئیں۔

"پاپا! میں بھی آؤں۔" وہ ان دونوں کے بیچ کھڑی تھی اور جیسے انہیں نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے خود نظر آنے کی کوشش کرنا چاہی۔

"اوہ نہیں ایما ڈارلنگ! تم گھر پر رہو۔ تمہاری ماما بیمار ہیں۔" اور یہ لازمی لاحقہ ہر جملے کا، پہلی بار اسے کسی شاک کی طرح لگا تھا۔

اس نے پورا گھوم کر بلیک نازک سینڈل کی ہیل پر سج سج چلتی خوب صورت سرخ و سفید

کسی ماڈل کی طرح سجی سنوری ماما کو بغور دیکھا، اور پہلی بار اس کے دل نے پوری طرح سے پاپا کے اس لاحقہ کی نفی کی تھی۔

"اگر ماما بیمار ہیں تو پھر وہ جو سارے لوگ ہاسپٹل کے بستر پر لیٹے تھے۔ وہ زبردست ایکٹر تھے جو بیماری کی ایکٹنگ کر رہے تھے۔" اس کے دل نے فوراً فیصلہ دیا۔

"لیکن اگر وہ سچے تھے اور سچ میں بیمار تھے تو ماما...... ماما...... ایکٹنگ۔" اس سے آگے اس کی معصوم سوچ نے جملہ پورا نہیں ہونے دیا اور یہ پہلی بار تھا جب وہ اس جملے سے حلق تک بیزار ہوئی تھی۔

اور یہ اکثر ہوتا تھا ماما کا اس ڈھائی کنال کی کوٹھی میں اکثر ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔ ان کی سانسیں ان کے نازک سینے میں اٹک اٹک کر ابھرنے ڈوبنے لگتیں اور پاپا کی جان پر بن آتی، وہ انہیں فوری طور پر اس گھٹن زدہ، در و دیوار سے دور کسی کھلی فضا میں لے جاتے اور اکثر یہ کھلی فضا بیرون ملک کوئی بھی خوب صورت تفریحی مقام ہوتا۔

یہ نہیں تھا کہ ماما ڈرامہ کرتی تھیں۔ اس نے اپنے بچپن سے لے کر آخری دنوں تک گھر میں اکثر ڈاکٹرز کو آتے جاتے دیکھا۔ کبھی کبھار ماما کو ہسپتال ایڈمٹ کرا دیا جاتا اور وہ کئی کئی دن وہیں رہتیں، وہ ایک آدھ بار پاپا کے ساتھ ان سے ملنے جاتی تو بھی ان کا رویہ اس سے اکثر بہت سرد لاتعلق سا ہوتا، ورنہ عموماً تو وہ سوئی ہوئی ہی ملتیں اور تیسری صورت میں اسے اکثر بورڈنگ روانہ کر دیا جاتا۔

ایسے میں اس کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہوتا چلا گیا کہ ماما ہر صورت اسے خود سے دور رکھنا چاہتی ہیں کیوں؟

پھر اس کیوں کی طنابیں اس کی گردن کے گرد کسنے لگتیں تو وہ فوراً اپنے خیالات کا دھارا کہیں اور موڑنے کی کوشش کرنے لگتی اور یہ الگ بات اس میں وہ کم ہی کامیاب ہوتی تھی۔

اسے ٹھیک سے یاد نہیں شاید وہ بورڈنگ سے لوٹی تھی یا اس کے دل میں اکیلے پن کے بھوت نے کسی خوف ناک دیو کی شکل اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے وہ اس رات ماما کے ساتھ سونا چاہتی تھی۔

"نو مائی ڈاٹر یو آر بریو آپ کو کانفیڈنٹ ہونا چاہیے۔ کبھی کسی پر ڈیپنڈ نہیں کرنا چاہیے۔ دن ہو یا رات کی سیاہی اپنے حوصلے، اپنے اعتماد کو اپنا سب سے مضبوط ہتھیار بناؤ۔ کبھی کسی کے ساتھ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور آپ کو معلوم ہے نا آپ کی ماما بیمار ہیں اور آپ کی ماما نہیں چاہتیں کہ ان کے ساتھ لیٹنے یا مسلسل ساتھ رہنے سے آپ کو بھی ان کی بیماری کا کوئی جرم (جراثیم)

لگ جائے اور آپ خدانخواستہ تھوڑا سا بھی بیمار ہو جاؤ۔'' پہلی بار پاپا نے اپنے طور پر اس کے بڑے ہوتے ذہن کو قدرے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ایما! آپ کی ماما دنیا کی سب سے اچھی ماما ہیں اور وہ آپ کے بارے میں بہت کیئرنگ، بہت لونگ ہیں وہ نہیں چاہتیں ذرا سا بھی آپ کو کوئی دکھ پہنچے۔کوئی بیماری لگے، آپ کو درد ہو۔'' پاپا نے اسے سمجھاتے ہوئے ماما کی اس نظر نہ آنے والی شدید محبت کا احساس دلانا چاہا تھا۔

''آپ......آپ سے ماما پیار نہیں کرتیں کیا؟'' اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پوچھا تھا۔

''کرتی ہیں، کیوں نہیں کرتیں۔'' وہ اس کی توقع کے عین مطابق فوراً بولے۔

''تو پھر آپ کو کیوں اپنے ساتھ رہنے دیتی ہیں اگر ان کی بیماری کے جرمز آپ کو لگ گئے۔آپ کو Pain ہوگئی تو......تو کیا وہ ہرٹ نہیں ہوں گی۔''

اور پہلی بار ایمن نے پاپا کا چہرہ، گہری سنجیدگی کے گمبھیر سائے میں تاریک پڑتے دیکھا تھا وہ جواب میں چپ کر گئے تھے۔

''ایما آپ چھوٹی ہیں، اگر مجھے جرمز لگیں گے تو میرا ڈیفنیو سسٹم اتنا پاورفل ہے کہ وہ اپنا ڈیفنس کر لے اور اگر ایسا نہ بھی ہو کچھ جرمز لگ بھی جائیں۔ پین ہو بھی جائے تو بیٹا! میں اسے برداشت کر سکتا ہوں مگر تمہاری ذرا سی تکلیف ہم دونوں برداشت نہیں کر سکیں گے اور رہا سوال کہ میں تمہاری بیمار ماما کے ساتھ کیوں رہتا ہوں۔'' وہ مضطرب سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''بیٹا! اگر میں ان کے ساتھ نہ رہوں ان کا خیال نہ رکھوں تو پھر کون ان کا خیال رکھے گا وہ تو اتنی نازک ہیں اور جتنی تکلیف میں ہیں وہ برداشت کرتی ہیں۔تمہارا ننھا سا دماغ اس کا تصور نہیں کر سکتا۔''

''پاپا! تکلیف شیئر کرنے سے کم ہو جاتی ہے کیا؟'' اس نے فوراً پوچھا انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ ماما کی تکلیف شیئر کرتے ہیں۔'' انہوں نے پھر ہلایا۔

''تو میں بھی آپ دونوں کی تکلیف شیئر کرنا چاہتی ہوں، میں آپ کی بیٹی ہوں نا!'' اس نے اپنے طور پر ان کا قرب پانے کی سعی کی۔

انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں ایما! محبت کرنے والے ایک دوسرے کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتے۔خصوصاً والدین اپنی اولاد کو ذرا سی بھی تکلیف نہیں دے سکتے اور تم تو ہماری ایک ہی بیٹی ہو، خدا نہ کرے، ہماری طرف سے تمہیں کوئی رنج ملے اور تم اس بارے میں زیادہ نہ سوچا کرو، ابھی تمہارا دماغ ان باتوں کو

سمجھ نہیں سکتا۔'' انہوں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔اس کے بال سہلاتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر چلے گئے۔

مگر ان کی نصیحت کے باوجود اس کا دماغ خود کو اس معمے کو سلجھانے سے آزاد نہیں کرا سکا تھا۔

وہ کتنے سال سوچتی رہی۔ان دونوں کے ساتھ وہ پوری دنیا گھوم آئی تھی ہر چھٹیوں میں ان کا کہیں نہ کہیں باہر جانے کا پروگرام طے ہوتا۔وہ سال میں ایک بار تو اسے اپنے ساتھ لے جایا ہی کرتے تھے۔ ماما کا چیک اپ ہوتا اور وہ اس دوران عموماً ہوٹل ہی میں ٹھہرا کرتی اور اس کی کھڑکیوں سے اس ملک، اس شہر کی سڑکوں پر دوڑتی ٹریفک کا مشاہدہ کرتی وہاں کے لوگوں کی نفسیات اور طرز زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی یا ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی۔

وہ آتے جاتے خود کو منتظر نگاہوں سے تکتی ماما کو ہاتھ ہلا کر بائے بائے ہاؤ آر یو فائن ماما آر یو اوکے آر یو آل رائٹ، جیسے رٹے رٹائے تین چار جملے بولتی ایک پھیکی سی بے جان مسکراہٹ ہاتھوں کو لبوں سے چھو کر ایک مصنوعی ہوائی بوسہ ان کی طرف اچھالتی وہاں سے گزر جاتی اور اکثر......اکثر ہی اپنے بیڈروم میں آنے کے بعد یا کہیں باہر جا کر اسے عجیب سا احساس ہوتا رہتا جیسے کوئی منتظر پیاسی دو نگاہیں کسی نے اس کی پشت سے چپکا دی ہوں، یہ احساس اسے ماما، پاپا کی ڈیتھ کے شاید چھ آٹھ ماہ پہلے سے زیادہ شدت سے ہونے لگا تھا۔

''کیا آخری مہینوں میں انہیں میرے قرب کی طلب تھی؟'' اس نے زور سے اپنی نم ہوتی آنکھوں کے آئینے میں دھندلے پڑتے ان مناظر کو رگڑا۔

''کیا کہہ کر گئے تھے پاپا مجھ سے جانے سے پہلے۔'' اس نے یاد کرنے کی کوشش کی، جب اپنی روانگی سے ایک رات پہلے پاپا اس سے ملنے کے لیے اس کے بیڈروم میں آئے تھے۔وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے دونوں کو جھلاتے ہوئے سامنے ٹی وی اسکرین پر کسی میوزیکل پروگرام کو انجوائے کر رہی تھی اس کے تیز میوزک میں غرق اسے پتا بھی نہیں چلا۔کب پاپا آکر اس کے کمرے کے وسط میں کھڑے اسے دیکھنے لگے۔

ان کے کھنکارنے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی اور ٹی وی کا والیوم کم کیا تھا۔

''میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا؟'' وہ اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

''تمہاری چھٹیاں کتنی باقی ہیں؟''

''ابھی تو آئی تھنک ڈیڑھ ماہ تقریباً۔'' اس نے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا۔پاپا اس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

''کیا دیکھ رہے ہیں ایسے۔'' وہ جھینپ کر بولی۔

"تمہاری بیٹی کتنی بڑی ہوگئی ہے ماشاء اللہ۔" وہ اسے دیکھ کر کچھ اداس سی مسکراہٹ سے بولے تھے۔

"میں چاہ رہا تھا۔ تم اے لیول کسی اچھی سی جگہ میرا مطلب ہے باہر کی جو بھی یونیورسٹی تمہیں پسند ہو تمہاری ماما کا آپریشن ہو جائے تو پھر ان شاء اللہ میں سب پتا کر کے یا تم میرے ساتھ چلنا ویسے تمہارے آگے ارادے کیا ہیں۔"

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس سے پوچھنے لگے۔

"کچھ خاص نہیں رزلٹ کے بعد سوچوں گی۔" وہ اسی لاپروا انداز میں بولی جواب اس کی طبیعت کا حصہ بن چکا تھا۔

"او کے۔ اچھا سنو۔" وہ جیسے اس موضوع کو تمام کرتے ہوئے بولے۔ "صبح ہماری فلائٹ ہے پندرہ دن بعد تمہاری ماما کا آپریشن ہے امید ہے۔ بلکہ ہنڈرڈ پرسینٹ امید ہے کہ کامیاب ہی ہوگا، تمہاری خالہ بی تو آ ہی چکی ہیں وہ گھر کا سارا انتظام دیکھ لیں گی، وہ بہت اچھی سمجھ دار خاتون ہیں۔ تم سے صرف اتنی ریکوسٹ ہے کہ حتی الامکان کوشش کرنا ان کی باتوں پر دھیان دینا اور جس بات سے وہ منع کریں تم اسے Avoid ہی کرنا اور یہ جو تم سارا سارا دن گاڑی لے کر نکلی رہتی ہو، اسے بھی تھوڑا کم کرو اب شہر کی سڑکوں کا وہ حال نہیں، جو سال دو سال پہلے تھا اس لیے احتیاط بہتر ہے اور جو تمہاری خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ تم تھوڑا کچن کے کام سیکھ لو تو بہتر ہے۔"

"پلیز پاپا آپ مجھے اب وہ کیا کریکٹر ہے آئی تھنک اکبری......نو اصغری......" وہ رک کر تصحیح کے لیے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اصغری!" وہ آہستگی سے بولے۔

"خالہ بی، وہ مجھے بھلا کیا سکھائیں گی بگھارے بینگن، ٹینڈے، بھنڈیاں شوربہ اور کھچڑی ......نو تھینک یو میں یہ سب سیکھے بغیر بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"او کے جیسے تمہاری مرضی۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر یہ موضوع بھی لپیٹ دیا۔

"اچھا اب جو میں کہنے جا رہا ہوں اُسے ذرا دھیان سے سننا۔" وہ اب کے سنجیدگی سے بولے تو وہ ذرا الجھ کر انہیں دیکھنے لگی ایسا انداز انہوں نے پہلے تو کبھی بھی کہیں جانے سے پہلے اس سے بات کرتے ہوئے اختیار نہیں کیا تھا۔

"تو اس بار کیا خاص بات ہے بھلا؟" اس کا اپنا دل بھی ان کے اس رویے پر ذرا الگ ہی انداز میں دھڑکا تھا۔

"یہ دنیا بہت بڑی ہے اور بہت خوف ناک بھی، ان کے لیے جو بزدل اور کم حوصلہ ہوں

یہ دنیا بہت چھوٹی اور بہت خوب صورت ہے۔ ان کے لیے جو بہادر اور باحوصلہ ہوں۔ یہ کتابی باتیں نہیں عملی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور زندگی کے امتحان ہیں جو میں دے چکا ہوں اور تمہیں اس کے لیے شروع دن سے تیار کرتا رہا ہوں، تمہیں شروع ہی میں خود سے دور دور کیوں رکھا جبکہ اس وقت تمہاری ماما بیمار بھی نہیں تھیں مگر تمہاری پیدائش پر کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوگئیں کہ جس کے بعد ہم دونوں نے کیا میڈیکل ایکسپرٹس نے ہمارے لیے یہی بہترین تجویز کیا کہ ہم کوئی اور بچہ پیدا نہ کریں۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی مگر تمہاری ماما میں بیماری کی علامات تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی محسوس ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ اس لیے وہ تمہاری دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی وقت مجھے ڈاکٹرز نے تنبیہ کر دی تھی کہ اگر میں تمہاری ماں کی زندگی چاہتا ہوں تو اسے زیادہ سے زیادہ بلکہ خوشی کی جس حد تک بھی لے جا سکتا ہوں خوش رکھوں، اب یہ میری کوششوں پر ہے کہ وہ اس کے بعد تیس برس بھی جی سکتی ہیں اور تیس ماہ بھی تمہاری ماں کو میں نے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر چاہا ہے پھر اس دن کے بعد میں نے یوں اس کی حفاظت کرنا شروع کر دی، جیسے وہ کانچ کا کوئی نازک ٹکڑا ہو اور یہ کیئر ساری زندگی کے لیے لازم ہوتی چلی گئی اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی دی، پر اس میں تھوڑا سا خسارہ یہ ہوا۔" وہ رکے۔

"ہم بحیثیت والدین شاید تمہیں اتنی توجہ اور محبت نہیں دے سکے جو اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تمہارا حق تھی مگر سچ پوچھو تو میں نے ایسا کافی حد تک جان بوجھ کر کیا۔ تمہاری ماما تمہیں نظر انداز کرنے خود سے دور رکھنے کے جرم کو کافی زیادہ محسوس کرتی ہیں جبکہ مجھے ایسا کوئی احساس نہیں بلکہ فخر محسوس ہوتا ہے۔"

وہ رک کے ایک میٹھی مہربان سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا، جو بالکل سپاٹ چہرہ لیے انہیں سن رہی تھی۔

"تمہاری جیسی پرورش میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایسی کی تمہیں بورڈنگ بھیجنے کا فیصلہ صریحاً میرا تھا۔ میں تمہیں ایک جذباتی، کمزور، محبت کی ماری، بے عمل سی لڑکی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں بہت مضبوط، بہت باہمت، خود مختار، آزاد، خود پر بھروسہ کرنے والی دیکھنا چاہتا تھا اگر تم مستقل گھر میں رہتیں، اپنی ماما کو تکلیف کی کیفیت میں دیکھتیں تو تم بہت حساس، زود رنج اور خوف زدہ سی رہتیں، کمزور اور بچی جیسی عموماً لڑکیاں ہوتی ہیں۔ شاید یہ تمہاری ماما کو بیماری اور کمزوری قلب کے مسلسل ساتھ کا ری ایکشن تھا۔ میں تمہیں اپنی ماما کے بالکل برعکس دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ سوچ رہی ہوگی میں تم سے آج یہ باتیں کیوں کر رہا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر ٹھہرے، اسے گہری نظروں سے دیکھا اور گہرا سانس لے کر بولنے کے

لیے لفظ ترتیب دینے لگے۔

''ایک تو اس لیے کہ یہ نہ سمجھنا ہمیں تم سے محبت نہیں ہے اور دوسرے تم جان سکو کہ تم کیا ہو۔ تم ایک بہادر، باعمل اور باہمت لڑکی ہو۔ ذرا سی مصیبت مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے دفاع اور تحفظ کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ نکال لوگی، نہ کہ مصیبت پڑنے پر کمزور لڑکیوں کی طرح رونا دھونا شروع کردو گی، ہمیں زندگی گزارنے کے لیے دوسرے لوگوں کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے مگر اس ساتھ کو بیساکھی نہیں بنانا چاہیے تم جتنا زیادہ خود پر بھروسہ کرنا سیکھو گی۔ اتنا زیادہ پُر سکون اور باعمل رہو گی۔

اور ایما ڈارلنگ! آپ کے پاپا آپ کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں بہادر اور باہمت حالات کتنے ہی نامساعد اور مشکل ہوں نہ رونا ہے نہ گھبرانا ہے انڈراسٹینڈ!''

وہ اب کے کھل کر مسکرائے تھے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پورے جوش سے دبایا تھا۔

''آپ...... پاپا کیا میں کسی مشکل میں...... آپ کو کیا لگتا ہے۔''

ان کی باتوں نے اسے خوف زدہ سا کردیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کس طرح اپنے دل کا خوف زبان پر لا کر ان سے پوچھے کہ کیا ہونے جارہا ہے یا کیا خوف ناک ہونے والا ہے، بس ڈری ڈری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بے ربط ہو کر بولی تو وہ نفی میں سر ہلانے لگے۔

''اس...... اسی طرح کے ری ایکشن سے تمہیں بچانا چاہتا ہوں یہ زندگی ہے۔ یہاں کوئی پتا نہیں، اگلے لمحے اگلے پل کیا ہونے والا ہے اگر ہر اگلے پل پر تم یونہی ڈرو گی خوف زدہ ہو جاؤ گی تو ذرا ذرا سی تکلیف تمہیں ہرٹ کرے گی تمہارے خوف کو تمہاری کمزوری بنا کر تمہیں تباہ کردے گی، کسی خوف کو کمزوری نہیں بننے دینا خود کو ہر حال میں کمپوز رکھنا ہے۔''

وہ رک کے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''دیکھو! کچھ انوکھا یا خوف ناک نہیں ہونے والا یہ سب تو عام سی باتیں ہیں، لیکن انہیں بھولنا نہیں، ہمیشہ یاد رکھنا۔''

وہ ان کی باتیں سمجھ رہی تھی مگر پھر بھی اندر ہی اندر پریشان سی ہوتی جارہی تھی۔

''کوئی بھی مسئلہ ہو، پرابلم، انکل راشد سے شیئر کرسکتی ہو۔ یہ میری دوسری رائے ہے ورنہ میری پہلی رائے صرف اور صرف یہ ہے کہ ہر مسئلے کو خود اور اپنے حوصلہ سے حل کرنے کی کوشش کرنا او کے اپنا خیال رکھنا بہت زیادہ اور اب سو جاؤ۔''

وہ اس کا سر تھپک کر اسے میٹھی نیند سو جانے کی تلقین کرتے ہوئے چلے گئے تھے اور اسے لگا تھا۔ آج وہ اپنی عمر سے کئی سال آگے نکل آئی ہو۔

اس رات وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی، بار بار اس کی نیند ٹوٹ جاتی شاید اس کچی پکی نیند کا کمال تھا کہ وہ صبح منہ اندھیرے ہی اٹھ گئی تھی۔

ماما، پاپا جانے کے تیار تھے۔ اسے یوں اٹھ کر آتے دیکھ کر تھوڑا حیران اور زیادہ خوش ہوئے تھے۔

ماما نے اسے شانوں کے گرد بازو حمائل کر کے پیار کیا تھا مگر اسے اپنے ساتھ نہیں لگایا تھا۔ بڑی احتیاط سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور پھر اسے خود سے پرے کردیا تھا، وہ ان کے ساتھ لپٹ کر تھوڑا رونا چاہتی تھی مگر ماما کے چہرے، ان کے انداز میں ایسی کسی دل گرفتی کے آثار نہیں تھے۔

وہ مسلسل مسکراتے ہوئے اسے میٹھی میٹھی نظروں سے تکے جارہی تھیں، پاپا نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا تھا کوئی نصیحت نہیں کی تھی۔

ماما نے اسے دو قدم پرے کھڑے کھڑے محبت بھری تاکید کی تھیں، وہ سر ہلائے بغیر یک ٹک ان کی طرف دیکھتی رہی۔

سیاہ لباس میں جس پر کہیں کہیں کوئی سفید تارہ سا جھانک رہا تھا اسے اپنی ماما بہت کمزور بالکل کسی ڈھانچے کی مانند لگی تھیں اس نے نامعلوم کتنے دنوں کے بعد انہیں یوں غور سے دیکھا تھا ان کی پیلی زرد کھال چہرے کی ہڈیوں کے ساتھ کسی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد جیسے کسی نے سیاہ رنگ کا حاشیہ بنا دیا ہوا ان کے گورے سفید ہاتھ اور دودھیا انگلیاں کرخت سی ہڈیوں میں بدل گئی تھیں۔ ٹائٹ قمیص بھی ان کے ڈھانچہ بدن پر جھول رہی تھی ان کے سر کے بال اس پر اسرار موذی بیماری سے جھڑ چکے تھے، جو برسوں سے ان کے ساتھ ایسی تھی جیسے کوئی جڑواں بہن ہو۔ ان کی صبیح پیشانی اب ایک چٹیل میدان کی طرح دور تک پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

اور اس چٹیل میدان سے نیچے سیاہ حاشیے سے اوپر اندر کو دھنسی ہوئی سیاہ خوف ناک سی آنکھیں۔ وہ ڈر کر ذرا سا پیچھے ہٹی تھی۔

اس نے بلا مبالغہ انہیں شاید دو ماہ بعد اتنے قریب سے دیکھا تھا ورنہ تو اس نے عرصہ ہوا ن کے قریب بیٹھنے یا بیٹھنے کی خواہش کو اپنے دل و دماغ سے نوچ پھینکا تھا۔

اور پھر اس کے خیالات اور اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔

ماما کا آپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔

''وہ بہت تیزی سے صحت مندی کی طرف آرہی ہیں اور بہت خوش ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ شائلہ واپس جا کر تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہوگی تو پتا ہے ایما تمہاری ماما نے

کیا جواب دیا۔'' پاپا کی آواز میں کیسا جوش تھا۔

''وہ کہہ رہی تھیں میں واپس جا کر صرف اپنی بیٹی کو گلے لگانا چاہوں گی اور بس۔''

اور ماما کی خواہش سن کر اس کے اپنے احساسات عجیب سے ہو گئے تھے۔

اسے بے اختیار اس صبح کا وہ ڈوبتا جگمگاتا تارہ یاد آ گیا تھا اور اس کے دل کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔

''اب یاد آیا وہ سب کچھ۔'' وہ کہیں اور ہی تھی کہ جب اس آواز نے اسے چونکا دیا۔

پاپا کی آواز کیسی تازہ دم کیسی کھنک دار تھی، وہ ایک بار پھر ان دونوں کی اس زندہ جاوید تصویر کو دیکھ رہی تھی، جس نے اس پر کون کون سے نہاں راز افشا کیے تھے۔

''مگر اس کے باوجود میں کہتی ہوں۔'' اس نے پہلی بار اس سارے ناسٹیلجیا کے دوران پہلی بار ماما کی آواز سنی تھی۔

''ایما کتنی بہادر باہمت اور باحوصلہ ہو، اسے کسی نہ کسی مضبوط اپنے سے بھی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور رہے گی۔'' پہلی بار اس نے ماما کی اتنی ٹھوس، جان دار آواز سنی تھی اور آواز کا بے لچک انداز اسے ایک نئی سوچ سوچنے پر مجبور کرنے لگا۔

''کوئی اور مضبوط سہارا.......... خود سے بھی مضبوط ..... کون؟ کون بھلا؟'' سراسیمگی سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں اب بھی مسکرا رہے تھے اس طرح میٹھی میٹھی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے مگر اب وہ آوازیں کیسی گم ہو چکی تھیں۔

کمرے کے سناٹے میں صرف خامشی اور پراسرایت کا راج تھا کہیں کوئی آواز کوئی مشورہ کوئی ڈھارس نہیں تھی وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

☆☆☆

''کیا کھا رہی ہو؟'' وہ جو اکھڑی اینٹوں والی ٹوٹی پھوٹی مگر بے حد ٹھنڈی سیڑھیوں کے سب سے اندھیرے زینے میں چھپ کر بیٹھی چٹخارے بھرتی املی کھا رہی تھی کہ اتنے قریب سے آواز سن کر اچھل ہی پڑی اور نتیجتاً پلاسٹک کے کاغذ سے لپٹی ذرا سی املی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے تیسری سیڑھی پر جا گری۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھک کر املی کا وہ کاغذ اچک لیا اور مڑ کر کوکو کو گھورنے لگی۔

''اندھی ہو دکھائی نہیں دیتا کیا کھا رہی ہوں ہر وقت چھپکلیوں کی طرح دیواروں کے ساتھ رینگتی بغیر آواز نکالے کھانے پینے کی چیزوں کی خوشبو سونگھتے ہر اس جگہ پر پہنچ جاتی ہو۔'' وہ نیچی آواز

میں خوب غرا غرا کر بولی تھی۔

''اور تم جو...... کنکھجوروں کی طرح ایسے ٹھنڈے کونے کھدروں میں چھپ چھپ کر چوری کی ہوئی چیزیں کھاتی ہو وہ؟'' کوکو نے ندیدی نظروں سے کاغذ سے لتھڑی ذرا سی املی کو دیکھا اور ہاتھ نچا کر بولی۔

''کس کی چوری کی میں نے؟'' وہ بھی جواباً کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑنے کو تیار ہو گئی۔

''صبح جو سلو نے گھر بھر میں طوفان اٹھایا تھا، اس کا ایک روپے کا سکہ جیب سے گر گیا تھا، مجھے پتا ہے وہ تم نے ہی اٹھایا ہوگا۔'' کوکو کی نظریں اب بھی اس کاغذ پر تھیں۔ وہ صرف موقع کی تلاش میں تھی۔

''وہ واہ یہ کہاں لکھا پڑھا تم نے کہ وہ روپیہ میں نے اُچکا تھا؟'' وہ بجلی کی طرح چمکی تھی۔

''لکھے پڑھے کو گولی مارو، مجھے پتا ہے روپیہ تم نے ہی لیا تھا اٹھنی کی املی تو اٹھنی کا کیا لیا؟'' وہ پکے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

''اب کون سا زمانہ ہے اٹھنی کی املی کا، چار گٹھلیاں ڈال دی تھیں کمینے نے۔''

''تم پھر جمالے کی دکان پر گئی تھیں۔'' کوکو گھور کر بولی۔

''تو اور کون دیتا ہے ایک روپے کی چار املی کی گٹھلیاں بلکہ.....'' وہ اس کے نزدیک ہوئی۔ ''آج تو اس نے پتا نہیں غلطی سے یا بھول کر پانچ ڈال دی تھیں، میں بھی چپ کر کے لے آئی۔''

''اور جو تجھے اماں نے منع کیا ہے اس کی دکان پر جانے سے، معلوم ہے وہ کتنا ذلیل ہے۔'' کوکو ذلیل کو خوب چبا کر بولی۔

''ہوگا میں کیا کروں اور یوں بھی دو ملے تو ذلیل ہوتا ہے کوئی، اب وہ اکیلا کرے گا کیونکہ مجھے تو پتا ہے میں ذلیل نہیں۔'' وہ نیم اندھیرے میں ذومعنی انداز میں آنکھیں مٹکا کر بولی اور انگلی کاغذ سے لگا کر چاٹنے لگی۔

''دیکھو منیا! یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جمالا اور اس لین میں جتنی بھی دکانیں ہیں...... اور اماں نے تجھے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ تم اب باہر نہ نکلا کرو۔ کوئی بھی چیز لینے۔ جگنو لے تو آتا ہے جا کر۔'' کوکو نے اسے وہی بات سمجھانے کی کوشش کی جو اماں اسے دن میں دس بار تو ضرور سمجھاتی تھیں مگر کبھی اس نے دھیان دیا تھا نہ یاد رکھا تھا۔

''جانے دو میں کون سا محلہ پار کر جاتی ہوں۔ چار قدم پر تو بازار ہے پھر سارے جانتے ہیں میں کون ہوں؟'' وہ بڑے فخریہ انداز میں بولی جیسے وہ علاقے کی کونسلر ہو۔

''اب میں اماں کو جا کر بتاتی ہوں۔ سارا لفافوں کا ڈھیر بنانے والا ویسے ہی پڑا ہے، اماں کے پیٹ میں اتنا درد ہے ان سے بیٹھا نہیں جا رہا۔ جگنو اسکول سے آ کر میرے ساتھ لگا ہوا ہے آج کام پورا نہ ہوا تو شام کو گھر میں کچھ نہیں پکے گا۔ اٹھو اب جلدی سے اور یہ مجھے دو۔''

اس نے جلدی جلدی کہتے ہوئے ایک دم سے جھپٹا مارا اور کاغذ اس سے چھین لیا۔

''کوکو کی بچی! میں تجھے جان سے مار دوں گی۔ دے ادھر میری املی۔ ہاتھ ٹوٹیں تیرے۔''

وہ گالیاں بکتی کوکو کے پیچھے لپکی کوکو اس سے بڑی ہونے کے باوجود زیادہ پھرتیلی تھی، ایک ہی جست میں چار سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

''اے کمبختو! نامرادو سونے مرنے دو، دو گھڑی کو یہ مور چھل (پنکھا) ہل رہا ہے اور گھنٹے میں یہ بجلی مردود دفعان ہو جائے گی تو کوئی سکون سے مر بھی نہیں سکے اوپر سے ان کو کدکڑے سوجھ رہے ہیں کہاں تمہاری ماں مری ہے پٹہ ڈالے تمہیں جو بے دلی (بے اختیار) ہوئی جا رہی ہو ٹھہرو ذرا۔''

سیڑھیوں کا اختتام تائی کے کمرے کے آگے ہوتا تھا وہ دونوں جو ایک دوسرے کے پیچھے گالیاں بکتی اندھا دھند بھاگیں تو تائی جو ٹھنڈے فرش پر اپنے ململ کے دوپٹے کا گولہ بنا کر اس سے تکیے کا کام لے رہی تھیں، اور ذرا غنودگی میں تھیں ان دونوں کے بھاگتے قدموں کی دھمک سنتے اٹھ کر زور زور سے چیخنے لگیں۔

اب جو یہ چیخ و پکار اور کوسنے اماں کے کانوں میں پڑ گئے تو ان دونوں کی خیر نہیں ہو سکتی تھی۔ کوکو نے آخری بار خوب ندیدے پن سے اس کے پورے کاغذ پر اوپر سے نیچے تک زبان پھیری اور دھلا دھلایا کاغذ اپنے پیچھے آتی منیا کی طرف اچھال دیا، اور خود غڑاپ سے اپنے برآمدے کا بوری کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

منیا وہ کاغذ اٹھا کر اور اسے یوں صاف دیکھ کر اور بھی گالیاں بکنے لگی مگر اب کے آواز پست تھی اور لہجے میں شدید غصہ۔

اندر جانے کا مطلب اماں سے ہوائی جوتے کھانا تھا، اور باہر تائی کے کوسنے طعنے لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت اس کے لیے ایک ہی جائے پناہ تھی اوپر آخری منزل کا چوبارہ، وہ املی کا کاغذ ہاتھ میں پکڑے دبے قدموں اوپر چلی گئی۔

☆☆☆

''خدا لگتی کہوں گی، بات ایسی نامناسب بھی نہیں۔''

جیسے ہی وہ ناشتے کے بعد اٹھ کر صوفے پر بیٹھی خالہ بی اپنی چائے کا پیالہ لیے اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں اور دو گھونٹ سڑک سڑک کر کے پینے کے بعد بولی تھیں۔

ایمن نے نظریں اٹھا کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا اگرچہ وہ اس جملے کا سیاق و سباق تو سمجھ گئی تھی مگر قدرے انجان سی بن گئی اور پھر اپنا سیل اٹھا کر گولڈی کا نمبر ملانے لگی۔

''اب دیکھونا۔ کیا کرو گی نہ سر پر اپنی چھت، نہ پیروں تلے زمین اور ہاں یاد آیا یہ دیکھو۔''

وہ کچھ یاد آنے پر پیالہ ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کر کہیں چلی گئیں۔

''یہ کیا ہے؟'' ایمن نے ان کے ہاتھ سے کاغذ لے کر کھولے بغیر پوچھا۔

''میری بہو کا خط ہے بے چاری پورے دنوں سے بیٹھی ہوئی ہے۔ کل پاؤں پھسل گیا تو اچھا خاصا کام خراب ہونے لگا تھا۔ اللہ نے کرم کیا اب بے چاری نے رو رو کر میاں سے خط لکھوا دیا ہے کہ میں جلد سے جلد آ جاؤں ان دنوں تو عورت یوں بھی بڑی حساس ہوئی ہوتی ہے۔ صبح سے خط ملا ہے دل کو پنکھ سے لگے جا رہے ہیں کہ اڑ کر چلی جاؤں۔''

وہ بولتے ہوئے دوبارہ اپنی نشست سنبھال کر پیالہ ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی تھیں، ایمن نے خط کھولے بغیر سائیڈ پر رکھ دیا۔

اسے پورے دنوں کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر وہ پوچھنا بھی نہیں چاہ رہی تھی کہ پوچھنے پر خالہ جی ایسی ضروری وغیر ضروری تفصیل بتانے بیٹھ جاتی تھیں کہ اسے بھاگ جانے کے سوا اور کوئی حل نہ سوجھتا مگر اس وقت وہ بھاگنا نہیں چاہ رہی تھی۔

بیل جا رہی تھی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا گولڈی۔ اس نے نظریں اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ گیارہ بجنے کو تھے وہ دس اور گیارہ کے درمیان لازمی اٹھ جایا کرتا تھا۔

''اب بھلا بتاؤ۔ میں کیا کروں۔'' انہوں نے چائے کا خوب بڑا سا گھونٹ بھرا اور لہجے میں تھوڑی بے بسی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ایمن کندھے اچکا کر انہیں دیکھنے لگی۔

''اس طرح کب تک چلے گا۔'' وہ اب کے جھلا کر بولیں۔

''لو آپ چلی جائیں نا۔ میں نے کب آپ کو روکا ہے۔'' وہ ایک بار پھر نمبر ملاتے ہوئے جھنجھلا کر بولی۔

''لو اچھا صلہ دے رہی ہو بی بی! ساری محبتوں ریاضتوں کا یوں چھوڑ کر بھاگنا ہوتا تو چھ ماہ پہلے ہی بھاگ چکی ہوتی۔ تمہارے مرے ہوئے ماں باپ کو زبان دی تھی کہ تمہیں کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، وہ دونوں گھر لوٹ آئیں گے تو ...... ہاں انہیں تو لوٹنا نصیب ہی نہ ہوا۔ پر کیا کروں بڑے احسان ہیں ان دونوں کے مجھ غریب پر۔ پھر تم جوان جہان خدا خوفی بھی کوئی چیز ہوتی

ہے۔'' انہوں نے خالی پیالی میز پر رکھی اور دوپٹہ درست کرنے لگیں۔

''خالہ بی! کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ میں کوئی چوزہ نہیں ہوں جو کوئی یونہی مٹھی میں دبا کر چل دے گا۔ آپ کو میری طرف سے مکمل اجازت ہے۔ آپ جاسکتی ہیں میں جو ہوگا دیکھ لوں گی۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

کال پھر ڈراپ ہوگئی تھی، اسے مایوسی سی ہونے لگی۔

''اے لو۔ کیا دیکھ لوگی سب کچھ تو نظر آرہا ہے، اب اللہ نہ کرے اور کیا دیکھوگی، بس مجھے یہ بتاؤ۔ کیا سوچا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے گھر کا حال دیکھو۔ دھول مٹی میں اَٹ رہا ہے۔ صفائی کرنے کو کوئی نہیں۔ تین دن سے ہاتھ نہیں لگا اور سچی بات ہے مجھ میں تو اب دم......''

''پلیز خالہ بی! آپ مت کریں کچھ بھی، جو آپ کا دل کرتا ہے کرلیں۔ میں نے جو کرنا ہوگا۔ میں کرلوں گی۔''

وہ اکتا کر بولی اور سیل فون صوفے پر اچھال دیا گولڈی کا سیل آف ہو چکا تھا، ڈسٹربنس کے خیال سے یا اس کا نمبر دیکھ کر...... اس نے سیل آف کردیا تھا۔

''دیکھو تم جو بھی سوچو مگر اتنا جان لو۔ ہمارے اس معاشرے میں اکیلی لڑکی، پھر تمہارے جیسی کم سن لڑکی کا مرد کے بغیر اس کے مضبوط سہارے کے بغیر رہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے اور تم جو اس وقت اتنے سارے مسائل میں گھر گئی ہو، ان سب سے نکلنے کا واحد راستہ شادی ہی ہے اس کے ذریعے تم خود کو محفوظ......''

خالہ بی کہے جارہی تھیں مگر اس کے دھیان کی سوئی ان کے بولے گئے ان دو لفظوں پر اٹک چکی تھی مضبوط سہارے...... ماما بھی تو رات کو اس سے یہی کہہ رہی تھیں، بلکہ پاپا نے جو اسے نصیحت کی تھی کہ خود کو مضبوط کرو۔ خود پر بھروسا کرو۔ بہادر بنو اور اندر سے خود کو کمپوز رکھو تو ان سب کے جواب میں ماما نے ایک ہی بات کہی تھی کہ ایما کو پھر بھی ایک مضبوط سہارے کی ضرورت رہے گی۔

اور اب خالہ بی اسی مضبوط سہارے کا ذکر کررہی تھیں۔ کیا اس مضبوط سہارے کی بیساکھی تھامے بغیر اس کا زندگی گزارنا ناممکن تھا؟

وہ خالی خالی نظروں سے خالہ بی کو دیکھے جارہی تھی، جن کے ہلتے لب بتا رہے تھے کہ وہ اب بھی کچھ بول رہی تھیں کیا؟ اسے آواز تو سنائی دے رہی تھی مگر لفظ بالکل سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

''برائی نہیں ہے اس رشتے میں کوئی۔ پھر دیکھا بھالا مہذب شریف پڑھا لکھا سب سے بڑھ کر دولت وحشمت والا ہے اور کیا چاہیے ایک ہی تو خرابی ہے نا کہ عمر میں بڑا ہے تو سچ پوچھو، یہ

خرابی اس وقت تمہارے لیے ایک خوبی کا کام دے گی۔ پوچھو کیوں؟''

وہ لمحہ موجود میں لوٹ آئی تھی خالہ جی کے ہلتے لبوں سے آزاد ہونے والے الفاظ اپنے تمام ترمفہوم کے ساتھ اس کی سمجھ میں آنے لگے تھے وہ اس طرح چپ انہیں دیکھتی رہی۔

''بڑی عمر کا مرد شادی کرے کم عمر لڑکی سے تو سمجھو، اس کا غلام ہی بن جاتا ہے۔ بے دام کا غلام۔ تمہارے ایک اشارے پر پوری جان سے قربان ہونے کو تیار رہے گا، پھر بال بچوں کا بوجھ ہے اس پر نہ کوئی ان کے مستقبل کی فکر۔ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہیں تمہارے تو وہ پاؤں دھو دھو کر پیے گا اور کیا چاہیے تمہیں؟'' وہ اسے کسی بچے کی طرح پچکارتے ہوئے بولیں۔

''اور وہ جو رات کو آپ کہہ رہی تھیں جب میں نے آکر بتایا تھا آپ کو۔'' وہ کچھ طنزیہ سے لہجے میں بولی۔

''یہی ایک بات صرف عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے، اور تو کوئی بات نہیں تھی۔'' وہ صاف دامن بچاتے ہوئے بولیں۔

''تو سنئے خالہ بی میرا فیصلہ۔'' وہ چند لمحے ان کی طرف دیکھتی رہی پھر سیدھے ہوتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں بولی۔

خالہ بی، جی جان سے متوجہ ہوئی تھی۔

''میں کسی بھی ہاسٹل میں رہ لوں گی۔ شاید اسٹڈیز شروع کردوں یا کوئی جاب۔ آپ جاسکتی ہیں اپنے گھر، جب چاہیں میں ہفتہ بھر میں یا دس دنوں میں یہ گھر خالی کردوں گی۔'' اسے خود پر حیرت ہوئی اس نے کتنے آرام سے گھر خالی کردوں گی بول دیا تھا ان تین لفظوں میں، اندر کوئی دیوار سی گری تھی مگر اس کا لہجہ اس دیوار کے ڈھے جانے سے ذرا بھی لڑکھڑایا نہیں تھا۔

''ہاسٹل...... کیوں کیسے......؟'' خالہ بی ناسمجھی سے بولیں۔

''میں رہ لوں گی۔ مجھے عادت ہے رہنے کی۔''

''بی بی جس طرح کے ہاسٹلز میں تم رہتی رہی ہو اپنی تعلیم کے دوران ان کا ماحول اور ہوتا ہے پھر ایک موٹی رقم میرا مطلب ہے بھاری فیس دے کر ایسے ہاسٹل میں رہنا بالکل مختلف ہے جس کے ہاسٹل میں تم رہنے کی بات کررہی ہو، وہاں تمہارا چند ماہ تو کیا چند دن بھی رہنا مشکل ہے یہ بات میری لکھ لو...... اور پھر۔'' وہ گہرا سانس لیتے ہوئے رکیں۔ ''یہ مسئلے کا حل نہیں تمہیں یوں ہاسٹل وغیرہ میں پھینک کر میں اپنی جان چھڑا کر نہیں جاسکتی۔ یہ تمہارے ماں باپ کے احسانات کا بدل نہیں ہوسکتا۔''

''میں آپ کو ان احسانات کے قرض سے آزاد کرتی ہوں آپ پلیز میری فکر نہ کریں،

جب جانا چاہتی ہیں جائیں۔ مجھے ابھی شادی وادی نہیں کرنی اور انکل راشد صاحب سے تو بالکل بھی نہیں۔ اس لیے آپ کا ادھر ٹھہرنا رکنا یا میرے فیصلے کے بدلے جانے کا انتظار کرنا قطعاً فضول ہوگا۔ میں آپ کو پہلے سے بتا رہی ہوں۔ میں اپنا انتظام اس ہفتے کے دوران کرلوں گی۔ اس لیے آپ خواہ مخواہ اپنا وقت میرے لیے برباد نہ کریں اور نہ خود کو مجبور کرکے ان احسانات سے باندھیں جو میں نے نہیں، ان لوگوں نے آپ پر کیے تھے جو آپ سے پوچھنے کے لیے اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ میں آپ کو ہر قسم کے قرض اور وعدے سے آزاد کرتی ہوں آگے آپ کی مرضی۔'' وہ کچھ رک رک کر اور کچھ تیزی سے بولتے ہوئے اٹھی اور خالہ بی کے اترے ہوئے چہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

اگرچہ آج اس نے سارا دن گھر ہی پر گزارنے کا فیصلہ کیا تھا کہ لے جانے والا اور بیچنے والا سامان الگ الگ کرکے گاڑی کی قیمت لگوالے۔ وقت ضرورت اگر گاڑی بیچنی پڑے تو اس سے ملنے والی رقم کا کچھ آئیڈیا تو ذہن میں ہوگا، مگر خالہ جی کی باتوں نے اسے مجبور کردیا کہ وہ فی الحال گھر سے نکل جائے ورنہ وہ بار بار اسے انکل راشد سے شادی کے لامحدود فوائد پر لیکچر دیتی رہیں گی اور اس کا جی جلاتی رہیں گی۔

دوسرے اس کا خیال تھا کہ وہ گولڈی سے فون کرکے اسے بتادے گی کہ رات کو اس نے پرپوزل والی بات مذاق میں کہی تھی، ورنہ ابھی اس کا ذوق اتنا گھٹیا نہیں ہوا کہ وہ اس سے شادی پر مجبور ہوجائے مگر۔

مگر جس طرح گولڈی نے اس کا فون پہلے اٹینڈ نہیں کیا اور پھر سیل آف کردیا تو اس کے دل کو ٹھیس سی لگی تھی گویا وہ اسے نظر انداز کرکے اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا۔

بس یہی دوستی تھی ان کے بیچ میں اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے اپنے اور بھی بے سہارا ہونے کا احساس ہوا تھا، ورنہ ماما پاپا کے بعد گولڈی اور بنٹی کے اخلاقی سہارے اور اس کی فیملی نے جس طرح اس کی ڈھارس بندھائی تھی وہ اتنے بڑے حادثے پر بھی کمزور نہیں پڑی تھی۔ اب اس ایک لمحے میں جانے کیا ہوا تھا اسے اپنا آپ بے حد حقیر بے وقعت اور کمزور سا لگا تھا۔

''شاید وہ اپنے چچا کے پاس جا کر میرے موجودہ دیوالیہ پن کا حساب لگا چکا ہو، اسے پتا چل گیا ہو کہ ایمن اب کسی کروڑ پتی بزنس مین کی اکلوتی بیٹی نہیں بلکہ ایک کنگال مفلوک الحال یتیم ویسیر لڑکی بن چکی ہے۔ اس لیے رات بھر میں سارے حساب کتاب کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا ہے۔ ترک تعلقات کا، ترک دوستی کا کہ سب سے محفوظ رستہ یہی ہے بچنے کا۔''

اور اب وہ تیار ہوکر گھر سے نکل رہی تھی، وہ یک بار اپنی آنکھوں سے گولڈی کو جا کر دیکھنا

چاہتی تھی اس سے مل کر اس سے باتیں کرکے اپنے بدترین خدشے کو ناکام ہوتا دیکھنا چاہ رہی تھی۔

''جو اگر اس کے خدشے سچ ہوئے؟'' جوگرز کے لیسز کستے ہوئے اس کے دماغ میں کسی نے چٹکی بھری۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ہمارے درمیان دوستی دو چار مہینوں یا دو چار سال پرانی نہیں ہے۔ چودہ سال کی دوستی فیملی ٹرمز اور وہ مجھے جانتا ہے۔ میں ایسے کسی پر مرمٹنے والی نہیں کیا اس پر...... اسے پتا ہوگا کہ میں مذاق کررہی ہوں گی کیا وہ مجھے جانتا نہیں، جانتا ہے۔''

اس نے بڑے یقین سے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر بالوں کو کیچر میں جکڑا، لائٹ کلر کی لپ اسٹک لگائی۔ ایک آخری نظر آئینے میں اپنے عکس پر ڈالی اور شولڈر بیگ اٹھا کر اس میں موجود ضروری چیزوں کو چیک کیا اور باہر نکل آئی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' خالہ بی پورچ کے پاس ہی کھڑی تھیں۔

'' آتی ہوں تھوڑی دیر میں۔'' وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے گلاسز آنکھوں پر لگاتے ہوئے بولی۔

''وہ راشد کا فون آیا ہے۔ میں ہولڈ کروا کے آئی ہوں۔'' نہ جانے انہوں نے کیا سوچ کر انکل کا لاحقہ نہیں لگایا تھا۔

''کہہ دیجیے میں گھر پر نہیں ہوں بائے۔'' وہ کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور خالہ بی کی ''سنو تو'' بات تو کرو کہہ کیا رہا ہے دیکھو۔ ہمیں مطلب ہے۔ ہمیں ہی جھکنا......''

وہ گاڑی کے ادھ کھلے شیشے میں منہ دیے کہے جارہی تھیں کہ وہ ہاتھ ہلاتی گاڑی گیٹ سے باہر نکال لے گئی۔

☆☆☆

اس نے زندگی کا یہ رخ تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور نہ دیکھنے کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔

اس کی سوچیں تو بہت محدود سی تھیں۔

ماما کی پراسرار بیماری کے بارے میں سوچنا اور سر جھٹک دینا۔

جس چیز کی خواہش کرنا، وہ خواہش کرنے سے پہلے اس کی دسترس میں آجایا کرتی تھی۔

ماما، پاپا کے یکدم چلے جانے پر بے شک وہ بہت ہراساں ہوئی تھی، ہرٹ ہوئی تھی اور کئی دن تک چھپ چھپ کر روتی بھی رہی تھی مگر محرومی کا احساس یا اپنے بے وقعت ہونے کا احساس تو ایک بار بھی نہیں ہوا تھا وہ ان کے جانے کے بعد بھی خود کو بہت مضبوط، طاقت ور اور مادی لحاظ سے خوب مضبوط محسوس کرتی رہی تھی۔

اتنا عالی شان، خوب صورت گھر۔ گاڑیاں، بینک بیلنس کھڑے ہونے کو زمین اور سر اٹھانے کو آسمان۔ ماما، پاپا چلے گئے تو ایک خلا سا تو پیدا ہو گیا...... مگر بہت زیادہ نقصان یقیناً نہیں ہوا ان کے تابوت کو تکتے ہوئے اس نے بہت خود غرضانہ انداز میں دل ہی دل میں سارے حساب کتاب سارے جوڑ توڑ کر لیے تھے، ان کے بچھڑ جانے کا دکھ تھا فقط مگر وہ بھی اتنا گہرا نہیں کہ انہوں نے شروع ہی سے اسے خود سے لگ الگ اور دور ہی تو رکھا تھا، سو اگر وہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے تو کیا؟

وہ چند ہی دنوں میں سنبھل گئی تھی۔

زندگی ہے کیا، اسے تو پتا ہی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں بے تحاشا روپے پیسے اور گھر، گاڑی کی موجودگی میں کسی غم دکھ یا ٹینشن کی تو گنجائش ہی نہیں نکلتی۔

اور گنجائش تھی بھی نہیں، یہ روپے پیسے کے دیوالیے کا علم تو اسے اتنے ماہ بعد ہوا تھا جبکہ اپنے بے وزن ہونے کا احساس بالکل بے ضرر سا آہستہ آہستہ کسی چبھنے والی پن کی طرح، اس کے اندر ہی اندر پہلے دن سے چبھنا شروع ہو چکا تھا۔

اور اس احساس کو دوستوں اور ان کی فیملی کی بدلی ہوئی نگاہوں نے تیز تر کیا تھا اور پھر یہ چبھن دن بہ دن بڑھتی ہی چلی گئی۔

پھر سارے کھاتے کھل گئے اور کھلتے چلے گئے۔

کیسی تکلیف دہ حقیقت برہنہ ہو کر سامنے آئی تھی۔

آج اتنے دنوں بعد برہنہ حقیقت کے آشکار ہونے کے بعد اس نے اپنے اندر اتری اس نوکیلی پن کی چبھن کو پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔

گولڈی گھر میں موجود تھا۔

''چھوٹے صاحب ابھی باہر گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے۔ کہیں شہر سے باہر جا رہے ہیں' شاید کل واپس آئیں۔''

گولڈی...... اپنی سلور گرے بی ایم ڈبلیو کے بغیر شہر کیا گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا، اور اس کی بی ایم ڈبلیو اس کی عام گاڑی سے آگے پورچ میں کھڑی تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے ایمن نے گولڈی کا سیل نمبر ملایا تھا بیل گئی تھی اور تیسری بیل پر کال ڈراپ کر دی گئی تھی۔

وہ اگر اندر جا کر نمبر ملاتی تو شاید گولڈی کے سیل کی بپ اندر ہی کسی کمرے میں بج رہی ہوتی۔

''بنٹی کہاں ہے؟''

''وہ اپنی کزن کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہیں۔''

ملازم اس کے سامنے دیوار چین کی طرح پھیلا کھڑا تھا۔

اور پہلی بار اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ ملازم کو جھڑک کر دو قدم آگے بڑھ کر لاؤنج کا دروازہ کھول لے اور......

پتا نہیں پہلے بے وزن ہونے کا احساس ہوا تھا یا ان لوگوں کے بھرم رہ جانے کا خیال یا ملازم کے جھوٹ پر اس نے بادل نخواستہ یقین کر لیا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' وہ سر پکڑے کتنی دیر سے ریسٹورنٹ کے اس کونے والے خالی ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ اسے اتنے روشن دن کا اجلا پہر بھی کیسا تاریک، کیسا سیاہ نظر آ رہا تھا۔

گلاس ونڈوز سے باہر چمکتی دلکش دھوپ میں بھاگتی دوڑتی ٹریفک جیسے خود پر ہنستی محسوس ہوئی تھی، ادھر بیٹھنے کے دوران دو بار اس نے اٹھ کر نشست بدلی تھی۔

''راشد انکل سے شادی......'' اس کا اندر چھائے گہرے اندھیرے سناٹے میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔

''نہیں۔ بالکل نہیں۔'' تادیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

''پاپا! ماما! آپ نے جانا ہی تھا تو میرے بارے میں کچھ تو...... کچھ تو چھوڑ گئے ہوتے ایسا جس کے بھروسے میں چند سال......'' وہ سسکی۔

''ایما! کبھی کسی بیساکھی کا سہارا نہ ڈھونڈنا۔'' پاپا اس کے کان میں گنگنائے۔

''اس کے باوجود ایما کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔'' ماما اسی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ہولے سے بولیں۔

''راشد انکل سے شادی میں بقول خالہ بی! کچھ ایسا حرج بھی نہیں چھ آٹھ ماہ ساتھ رہ کر تھوڑی پراپرٹی اور پیسہ حاصل کر کے میں ڈائیورس لے لوں۔''

ایک نئی سوچ اس کے اندر ابھری۔

''محض لالچ اور اپنی غرض کے لیے ایک مقدس بندھن باندھ کر دھوکا دہی...... میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا اور اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں بھی مجھے چیٹنگ سے کتنی نفرت رہی ہے دوسرے کی محنت پر مجھے عیش کا ایک نمبر نہیں اچھا لگتا تھا، کجا روپے پیسے کے لیے کسی کو دھوکا...... جبکہ اس رشتے کی جگہ راشد انکل کو دیکھتے ہی میرے دل میں شدید نفرت انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے جبکہ میں نے زندگی میں کبھی کسی سے نفرت بھی نہیں کی۔ یوں میں تھوڑے سے فائدے کے لیے عمر بھر کے لیے اپنے عکس کو مسخ کر لوں، مفاد پرستی کے یہ چند ماہ مجھے عمر بھر ڈستے رہیں گے اور شاید مجھے

کبھی سکون بھی نہ مل سکے تو کیا فائدہ ایسے وقتی مفاد کا......نہیں۔''

اس نے سر جھٹک کر خود اس خیال کی نفی کر دی۔

''اب مجھے اس پوائنٹ پر دوبارہ کبھی نہیں سوچنا۔''

ویٹر کئی بار اس کی ٹیبل کی طرف آیا اور اسے گہری سوچوں میں گم دیکھ کر پلٹ گیا تھا، اس نے اپنے لیے صرف جوس منگوایا تھا، اس میں سے بھی آدھا گلاس اسی طرح پڑا تھا۔

''ماما کی جیولری شاید اور نہیں ہے وہی جو اس دن بیچ کر آئی تھی یا دو چار میری چیزیں ہوں گی۔ یہ پرانی سی گاڑی جو شاید کوئی دو لاکھ میں بھی نہیں لے گا۔ اس بار پاپا پرامس کر کے گئے تھے کہ واپسی پر مجھے نئی گاڑی لے دیں گے اور وہ موقع......''

اس نے ایک سرد آہ بھری ''اس کے علاوہ گھر میں کچھ خاص ہے نہیں۔ یوں بھی گھر تو فرنشڈ ہی سیل کیا گیا ہے تو میں کبھی ادھر سے کچھ نہیں لوں گی۔''

''ڈیڑھ دو لاکھ میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''اور جو خالہ بی بے چاری ادھر نو ماہ سے پڑی ہیں وہ ہر بار جب بھی آتی تھیں۔ جاتے وقت پاپا انہیں ایک موٹی رقم ڈھیر سارے قیمتی تحائف کے علاوہ دیتے تھے، اسی لیے تو وہ ہر بلاوے پر بھاگی بھاگی جاتی تھیں اور جتنی بے زار وہ ان دنوں ہیں۔ اب اگر خالی ہاتھ گئیں تو یقیناً منہ سے تو کچھ نہیں کہیں گی مگر دل سے آہیں بھرتی جائیں گی۔''

''ان کو بھیج کر میں کسی ہاسٹل کا پتا کروں اور کوئی چھوٹی موٹی جاب ادھوری تعلیم کے ساتھ جاب کیسے ملے گی اس لیے تعلیم مکمل کرنا بہت ضروری ہے۔''

''ایکسکیوزمی اگر میں آپ کی تنہائی میں مخل نہ ہوں تو بیٹھ سکتا ہوں۔'' شناسا سی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

یہ تو اس دن والا نوجوان تھا جو اسے راشد انکل کے آفس میں اور اس شام اس کی گاڑی کے آگے آیا تھا، جب ایمن کی حالت اتنی پتلی تھی کہ اس کے والٹ سے نکلنے والا پانچ سو کا نوٹ اس نے اڑانے کا سوچا تھا اور ناکامی ہوئی تھی۔

''یہ اس وقت میرے کس کام آ سکتا ہے؟'' اس وقت اس کا ذہن صرف ایک ہی پوائنٹ کو سوچ رہا تھا، سو اسی نظر سے اسے دیکھنے لگی۔

''اے مس آر یو......؟'' اس نے ایمن کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلایا وہ اسے دیکھنے لگی۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟'' وہ پھر ذرا سا جھکتے ہوئے اجازت طلب انداز میں بولا۔

''ہاف تو آپ بیٹھ چکے ہیں۔ ہاف بھی بیٹھ جائیں۔'' وہ اسے ٹیبل کے اوپر کور کی حالت

میں جھکے دیکھ کر لاپروائی سے بولی۔

''یعنی مکمل بیٹھ جاؤں۔ تھینکس۔'' وہ بیٹھ گیا۔

''کمال ہے ہم تین چار بار پہلے بھی مل چکے ہیں، اور ابھی تک ایک دوسرے کے ناموں سے بھی ناواقف ہیں۔'' ایمن کو توقع تھی، وہ اگلا جملہ یہ بولے گا، جو اس نے بیٹھتے ہی بولا تھا وہ لاتعلقی سے گلاس ونڈوز سے باہر دیکھنے لگی۔

''اور میں کم از کم آج رات پچھتاوے کے رت جگے میں نہیں گزار سکتا۔'' وہ چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد پھر سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس سے پہلے جتنی بار بھی آپ سے اچانک کیا کہیں گے اسے حسن اتفاق سے ملاقات ہوئی اور میں آپ کا نام پوچھنا بھول گیا تیسری بار تو یقین جانو۔ میں نے واقعی ساری رات اسی کھولن میں کڑھتے ہوئے گزاری کہ میں کیسا احمق ہوں، جو ایک لڑکی سے اس کا نام بھی نہیں پوچھ سکا۔'' وہ بے تکلف انداز میں کہتا چلا گیا۔

''چلیں ایک رات اور گزار لیجیے گا جاگتے ہوئے۔'' وہ مسکرائے بغیر خشک لہجے میں بولی، جس میں بے تکلفی کا عنصر تو ہرگز نہیں تھا۔ شہریار نے ایک گہری نظر اس کے بے نیاز سے چہرے پر ڈالی۔

''سوری! آج کی رات تو میں قطعاً نہیں جاگ سکتا کیونکہ کل رات بھی......خیر مجھے شہریار کہتے ہیں اور آپ کو......'' اس نے خوش خلقی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ایمن......ایمن ظاہر ہے نام ہے میرا۔'' وہ اس کا ہاتھ نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

''خوب صورت نام ہے آپ کی طرح۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ایمن نے اَن سنے انداز میں گردن گھمائی۔ ''اور جو آپ سے رابطہ کرنا ہو میرا مطلب ہے ملنا ہو تو کسی اگلی اتفاقیہ ملاقات کے بجائے اگر آپ کا کانٹیکٹ نمبر معلوم ہو جاتا تو سہولت ہو جائے گی۔'' وہ ان ڈائریکٹ طریقے سے اس کا نمبر لینے کے لیے بولا۔

''مگر آپ کو میرا نمبر کیوں چاہیے؟'' وہ بے زار سے انداز میں بولی۔

''آپ موویز دیکھتی ہیں؟'' وہ الٹا سوال کرتے ہوئے بولا۔

''زیادہ نہیں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''زیادہ نہ سہی۔ ایک دو بھی دیکھتی ہوں تو اتنا پتا ہوگا کہ کوئی ہیرو فلم میں ہیروئن کا نام نمبر، پتا کیوں دریافت کرتا ہے۔'' وہ چہرے پر بڑی دوستانہ سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

ایمن کو ایک لمحہ لگا، اس کی بات کا مفہوم سمجھنے میں۔

اس نے یکدم گردن سیدھی کر کے بڑے غور سے شہریار کو دیکھا۔

''ایسے کیا غور سے دیکھ رہی ہیں۔ نظروں میں تو لنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ قدرے شوخی سے بولا۔

''اوہوں۔'' وہ مبہم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آئی۔

''اچھا کوئی کار ڈیلر میرا مطلب ہے آپ کا واقف ہو میں اپنی گاڑی سیل کرنا چاہ رہی ہوں۔'' اس کے لہجے میں حیرت انگیز طور پر نرمی ابھر آئی تھی اور آنکھوں میں واضح طور پر دوستی قبول کرنے کا پیغام جھانک رہا تھا۔

''کیوں کیا نئی لینا چاہ رہی ہیں اور کیا اتنی دیر سے اسی معمولی سی بات پر غور و خوض ہو رہا تھا؟'' وہ شاید کافی دیر اسے دیکھتا رہا تھا۔

''ہاں ارادہ تو ہے لیکن فی الحال میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی ہوں، وہ بھی بہت اچھی قیمت پر۔'' اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''ایک بہت اچھا کار ڈیلر میرا واقف ہے تو سہی۔ کب تک ارادہ ہے سیل کرنے کا؟''

''ابھی ہو جائے تو اچھی بات ہے۔'' وہ فوراً بولی۔

''ابھی۔'' وہ حیران سا ہوا ''کیا خیال ہے پہلے لنچ نہ کر لیں۔'' وہ ہاتھ آیا موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

''او کے مگر لنچ میری طرف سے ہوگا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''لنچ کیا آپ ڈنر دے دیجئے گا جب گاڑی سیل ہو جائے یقیناً شام تو ہو ہی جائے گی۔''

وہ جواباً بولا تو چپ رہی۔

کھانے کے دوران دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

''کتنا عرصہ ہو گیا آپ کی جاب کو؟'' وہ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''زیادہ عرصہ نہیں اس کمپنی میں تو ابھی تیسرا مہینہ ہے پہلے، پیکجز، میں تھا ادھر میں نے تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا ہے اس کمپنی میں تو ایک سیٹ پر بٹھانے کے بعد پروموشن کرنا بھول جاتے تھے شکر ہے ادھر تو آتے ہی مجھے بہت اچھا پے اسکیل مل گیا تھا۔''

''کوالی فیکیشن کیا ہے آپ کی؟''

''ایم بی اے کر رکھا ہے مگر پرائیویٹ کالج سے صبح جاب کرتا تھا اور شام کو اسٹڈیز، بڑی

جدوجہد سے تعلیم کو مکمل کیا اور جاب حاصل کی، سیلف میڈ پرسن ہوں اور اس پر مجھے فخر بھی ہے۔'' وہ واقعی فخریہ انداز میں بتا رہا تھا۔

جبکہ ایمن کا دھیان جدوجہد، اور سیلف میڈ پر آ کر اٹک گیا تھا وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟'' وہ اس کی محویت پر بولا تو وہ جھینپ سی گئی، اس کی نظروں نے اس پل اس کے وجیہہ چہرے پر کچھ تلاشا تھا وہ چاہتی تھی تو بیان نہیں کر سکتی تھی۔

ایک موازنہ کرتی ہوئی نظر، دو بالکل متضاد شخصیات تھے۔

''انکل راشد اور شہریار۔''

''ایک دولت کی کان دوسرا سیلف میڈ۔''

''تمہیں بیساکھی سے زیادہ خود پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

''مگر اس کے باوجود ایمن کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔'' اس کے اندر کشمکش سی ہونے لگی۔

''آپ کے فادر کیا کرتے ہیں آئی مین؟'' وہ اسی کشمکش کے دوران اس سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ نہیں ہیں۔'' اسے خود اپنی آواز خاصی دور سے آئی۔

''کیا مطلب۔'' وہ اس کے چہرے کی سنجیدگی پر خود بھی سنجیدہ ہو گیا، ورنہ پہلے وہ یہی سمجھا ایمن مذاق کر رہی ہے۔

''چھ ماہ پہلے ایک ائیر کریش کے دوران میرے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔'' وہ اپنی دھواں دھواں نظریں ٹیبل پر پڑے برتنوں پر جما کر آہستہ سے بولی۔

''اوہ وری سیڈ! بہت دکھ ہوا مجھے تو۔'' شہریار کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے شدید صدمے کا اظہار کن الفاظ میں کرے، ورنہ اس کی اس لمحے کیا حالت تھی وہ خود سے بھی چھپانا چاہ رہا تھا۔ کتنی دیر اس افسوس ناک سی چپ میں بیت گئی۔

''آپ کے ساتھ میرا مطلب آپ اب کس کے ساتھ رہتی ہیں۔''

''شہریار نے پہلے بے چین دل کی بے چینیوں پر بہ دقت قابو پا کر پوچھا تھا، ورنہ دل بے قرار تو چلائے جا رہا تھا جلدی سے ابھی ساری تفصیل جان لے۔''

''خالہ بی ہیں میری، وہ بھی اپنے گھر سکھر جانا چاہ رہی ہیں۔'' وہ افسردگی سے سر اٹھا کر بولی۔

''تو آپ اکیلی...... اکیلی کیسے رہیں گی؟'' اس کا جی چاہ رہا تھا اپنے سامنے بیٹھی اس کم سن سی خوبصورت گڑیا کو اٹھا کر اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں چھپا لے۔

"ہوں!" اس نے مبہم سا کہا۔ "کیا چلیں اب؟" یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔

شہریار نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

بل اس نے پے کیا تھا حالانکہ ایمن نے ایک بار کہا بھی کہ بل وہ پے کرے گی، مگر شہریار نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"آپ کے پاس گاڑی ہے؟" ایمن نے باہر نکل کر پوچھا۔

"نہیں اصل میں میرے ایک دوست کو چاہیے تھی وہ مجھے ادھر ڈراپ کر کے گاڑی لے گیا۔ شام کو دے جائے گا اسے ضرورت تھی۔"

وہ سرسری سے انداز میں بولا تو وہ خاموشی سے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ کدھر رہتے ہیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

"کیا گاڑی سیل نہیں کرنی آپ نے؟" وہ کچھ حیران سا بولا۔

"اوہ ہاں یاد آیا۔ پتا نہیں کیوں اتنی غیر حاضر دماغ ہو رہی ہوں میں آج کل۔" وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔ پھر دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اسی وقت اس کے موبائل کی بپ بج اٹھی۔

گولڈی کا نمبر آ رہا تھا۔ ایمن نے لب بھینچ لیے۔ اور اگلے پل سیل آف کر کے بیگ میں ڈال لیا۔

"میں آپ کے گھر آنا چاہ رہا ہوں۔" وہ مین روڈ پر آ چکے تھے جب شہریار بولا۔

"کیوں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سامنے نظریں جما کر بولی۔

"آپ کی خالہ سے، آپ کے پیرنٹس کی ڈیتھ کا افسوس کرنے۔"

"وہ تو پرانی بات ہو گئی۔" وہ کہنا چاہ رہی تھی مگر رک گئی۔

"یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔" اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا کارڈ اٹھا کر اسے تھما دیا۔

وہ کارڈ پڑھتے ہوئے اچھا خاصا امپریس ہو گیا۔

"آپ کے پیرنٹس میرا مطلب ہے آپ کے فادر کیا کرتے ہیں۔" وہ یونہی شاید بات کرنے کو پوچھ رہی تھی۔

"وہ دونوں بھی حیات نہیں۔" وہ آہستگی سے کارڈ گھماتے ہوئے بولا۔

"اوہ سوری۔" اس نے لب سکوڑ لیے۔

گاڑی کی قیمت اس کی توقع سے بڑھ کر ملی تھی دو لاکھ پندرہ ہزار روپے اور وہ اس کے

لیے شہریار کی مشکور سی ہو گئی تھی۔

"تھینکس، تھینکس اے لاٹ۔" وہ رقم بیگ میں رکھتے ہوئے باہر نکل کر بولی تو وہ مسکرا دیا۔

"اگر میں آپ کو کچھ دینا...... میرا مطلب آپ کی سروس......" وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگی

شہریار نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

"بہت افسوس کی بات ہے ایمن! ہماری دوستی بہت پرانی نہ سہی مگر دوستی تو ہے...... ہے کہ نہیں۔" وہ رک کر پوچھنے لگا۔

"ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر دوستوں کے درمیان اس طرح کی باتیں...... معمولی سی بات کا معاوضہ...... مجھے دکھ ہوا ہے۔" وہ رنجیدہ ہو کر بولا۔

"سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے سڑک سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر رکوایا۔

"میں کل شام آؤں گا تمہاری طرف۔"

"میں انتظار کروں گی۔ بائے۔" وہ ہاتھ ہلاتی ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

شہریار کو لگا جیسے اسے اپنے خوابوں کی دنیا میں داخل ہونے کا ویزا پاسپورٹ اور ٹکٹ سب ایک ہی دن میں مل گیا ہو، جس دنیا میں داخل ہونے کا خواب اس کی آنکھیں برسوں سے دیکھ رہی تھیں اور آج ایک ہی پل میں...... لگن سچی ہو جذبے میں شدت ہو تو مشکل سے مشکل بلکہ ناممکن خواہشوں کا مجسم ہونا ناقابل حصول نہیں ہے میں اور میرے خواب میں اور میرے خواب...... اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یہیں کھڑے کھڑے ناچنا شروع کر دے۔

☆☆☆

"ہاں بیٹا! بس اللہ کی مرضی۔ اس کی مرضی سے کون لڑ سکتا ہے اور کون اپنی منوا سکتا ہے، ماشاء اللہ ہنستے کھیلتے گھر سے گئے اس کی ماں کا آپریشن تھا اور کرنی خدا کی دیکھو آپریشن کامیاب بھی ہو گیا مگر موت دوسری طرف سے آ کر پنجوں میں دبوچ لے گئی ایسے میں کوئی کیا کر سکتا ہے، سوائے رونے دھونے اور صبر کرنے کے، خیال آتا ہے تو اس پھول سی بچی کا زمانے کی سختیاں تو بڑے بڑے پتھروں کے سینے شق کر ڈالتی ہیں یہ تو پھر کل کی بچی ہے۔"

خالہ بی کی تان اسی کے ٹاپک پر آ کر ٹوٹی تھی، جس پر وہ آج کل اٹھتے بیٹھتے ٹھنڈی آہیں بھرے جا رہی تھیں۔ ایمن نے جز بز ہو کر انہیں دیکھا اور آہستہ آہستہ اضطرابی کیفیت میں ٹانگ جھلانے لگی۔ خالہ بی نے اس کی اس حرکت پر کڑی نظر سے اسے گھورا مگر وہ انجان بنی تھوڑا اور زور سے ہل جل کرنے لگی۔

”رزق بھاگتا ہے یہ اس طرح بندروں کی طرح ہر گھڑی ٹانگیں جھلانے سے، اماں نے کوئی بات جو عقل کی تمہارے دماغ میں ڈالی ہو۔ نہیں ڈالی تو مجھ گنوار سے ہی سن لو اور پلے سے باندھ لو۔ یہ اس طرح بیٹھ کر ہر گھڑی ہل جل کرنا بے برکتی کی علامت ہے۔ تم امن سے نہیں بیٹھ سکتیں۔“

خالہ بی جب سے ان کے گھر آئی تھیں اسے یوں ٹانگیں جھلاتے دیکھ کر ہر بار کوفت بھرے جملے اس کے کانوں میں ضرور انڈیلا کرتی تھیں اور وہ ہر بار ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی۔

”اور تم سناؤ۔ کیا کرتے ہو؟“ وہ تعزیت کے تکلیف دہ مرحلے کو طے کر کے فوراً اس موضوع پر آئیں، جس پر آنے کے لیے شہریار کو دیکھتے ہی ان کا دل مچلنے لگا تھا، پہلی بار تو انہیں ایمن کے ملنے والوں میں سے کوئی بھایا تھا بطور انسان کسی قابل لگا تھا، ورنہ تو انہوں نے اس کے سب ہی فرینڈز کے مختلف نام رکھ چھوڑے تھے، ان کے آتے ہی منہ پھیر کر بیٹھ جاتیں یا دوپٹہ منہ پر ڈال کر گھونگھٹ نکالے تیز تیز تسبیح کرنے لگتیں۔

”جی جاب کرتا ہوں۔“ وہ مؤدبانہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔

”ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو کتنی جماعتیں؟“ خالہ بی کے لہجے میں شہد گھلا جا رہا تھا۔ ایمن نے تنقیدی نظروں سے پہلے خالہ بی کو اور پھر مودب بنے شہریار کو دیکھا۔ ڈارک بلیو ٹو پیس کے ساتھ گہرے کلر کی شرٹ پر میچنگ ٹائی لگائے وہ خوب نکھر کر آیا تھا۔

”شاید ہم تینوں ایک ہی بات سوچ رہے ہیں ایک ہی طریقے سے سوچ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح چھپانے اور جتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دوسرے کو ہماری مخفی نیت کا پتا نہ چل سکے۔“

لمحہ بھر کو غور کرنے پر ہی ایمن کو اس پوشیدہ نکتے کا علم ہو گیا، جو شاید ان دونوں کے دلوں میں تبھی کھلبلی سی مچا رہا تھا۔ چہروں کا بظاہر سکون اندرونی کشمکش کو چھپانے کی کوشش میں کافی حد تک کامیاب تھا۔

”ایم بی اے کر رکھا ہے۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”ہوں!“ خالہ بی نے سمجھداری سے ہلاتے ہوئے ”ہوں“ کہا جیسے ان کی سمجھ میں آ گیا ہو۔

”اماں باوا میرا مطلب ہے ماں باپ کے ساتھ رہتے ہو گے؟“ وہ درجہ بہ درجہ سارے مراحل طے کر رہی تھیں انٹرویو کے۔

”جی وہ تو حیات نہیں۔ چند سال آگے پیچھے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔“ اس نے دھیمی آواز

میں قدرے افسردگی سے کہا۔

”اوہ بہت افسوس ہوا۔ ماں باپ کیسے جتنوں سے اولاد کو پیدا کرتے پالتے پڑھاتے لکھاتے ہیں اور جب پھل لگنے کا وقت آتا ہے تو دیکھو تقدیر کی ستم ظریفی مالی کو پھل چکھنے کا حکم نہیں کوچ کا ڈنکا بج جاتا ہے۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے۔ مغفرت کرے ان کی۔ بہن بھائی تو ہوں گے؟“ وہ جلدی جلدی بولتے ہوئے مطلب کے سوال پر آئیں۔

”جی بس ایک بہن ہیں، شادی شدہ اپنے گھر میں۔“

خالہ بی نے واضح طور پر گہرا سانس لے کر پہلے شہریار کو اور پھر ایمن کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر ان کی دلی کیفیت کو پڑھا جا سکتا تھا۔

”تو گھر بار میرا مطلب ہے اکیلے رہتے ہو؟“

”نہیں ہاسٹل میں رہتا ہوں۔“ اس نے بھی شاید خالہ بی کے چہرے کا اطمینان پڑھ لیا تھا۔ اب کے قدرے سکون سے سیدھے بیٹھتے ہوئے ایک گہری نظر ایمن کے چہرے پر ڈالی اور جواب دیا۔

”اے ہاسٹل میں کیوں؟ اپنا گھر بار نہیں کیا؟“ خالہ بی کو کھٹکا سا ہوا۔

”گھر بار دیکھتا کون؟ اسے مین ٹین رکھنے کے لیے میرا مطلب ہے، دیکھ بھال کون کرتا، اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہاسٹل میں رہ لیا جائے۔“

”تو کیا گھر بار بنانے کا ارادہ بھی نہیں کوئی؟“ خالہ بی نے آخری بار ایک تنقیدی نظر شہریار پر ڈالی۔

چھ فٹ سے نکلتا قد، گھنے سیاہ بالوں والا سر، کشادہ پیشانی، کھڑی ناک، سیاہ آنکھیں نہ بہت بڑی نہ چھوٹی۔ مناسب جسم چوڑے شانے پڑھا لکھا برسر روزگار اور شکل سے ٹپکتی شرافت، اتنی دنیا تو انہوں نے بھی دیکھ رکھی تھی کہ سامنے والے کی ظاہری صورت اور دوغلے پن کو آرام سے جان سکیں۔ ان کے نزدیک چہرہ کھلی کتاب ہوتا ہے، اور آنکھیں آدمی کے اندر کا حال بیان کرنے والا کیمرہ، ان دو چیزوں کو جسے صحیح طریقے سے پڑھنا آ گیا وہ کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا، اور اس وقت ان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ سامنے بیٹھا یہ وجیہہ نوجوان ہنڈرڈ پرسنٹ نہ سہی مگر اسی فیصد کھرا ہے انہیں لگ رہا تھا ان کے سر پر پڑا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔

”ارادہ ہے۔ کیوں نہیں جی!“ اب کے اس نے براہ راست ایمن کی طرف دیکھا تھا۔

”اچھی بات ہے۔“ انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور تم اب کھانا کھا کر ہی جانا اور کسی دن اپنی بہن کو بھی لاؤ ہماری طرف۔“ انہوں نے سلسلہ آگے بڑھانے کی غرض سے کہا۔

''اصل میں ان کا آنا مشکل ہے۔'' وہ چند ثانیے رک کر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''وہ کیوں بھلا؟''

''وہ ادھر نہیں ہوتیں، میرا مطلب ہے پاکستان میں۔''

''اچھا تو پھر اگر تمہیں کوئی فیصلہ کرنا پڑا میرا مطلب ہے کیا ایسے ہی کر گزرو گے؟''

''ظاہر ہے، پہلے بھی تو زندگی کا ہر چھوٹا بڑا فیصلہ خود ہی کیا ہے۔ ماں باپ تو زیادہ تعلیم دلوانے کے حق میں بھی نہیں تھے کہ میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے بس زندگی کا سلسلہ چلاؤں۔ میں نے خود اپنے طور پر تعلیم حاصل کی۔ جاب ڈھونڈی اور ان شاء اللہ باقی کے تمام فیصلے اپنی زندگی کے بارے میں مجھے خود ہی کرنے ہیں۔'' وہ پورے اعتماد سے بولا کہ خالہ بی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''او کے! میں اب چلتا ہوں خالہ جان! پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا او کے ایمن!'' وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایسا ہے بیٹا کہ تم اپنا کوئی اتا پتا میرا مطلب ہے اگر تم سے دوبارہ رابطہ کرنا ہو۔ اصل میں اکیلے ہوتے ہیں ہم دونوں تو کوئی ایسا مسئلہ ہو جائے۔ سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں جنہیں صرف مرد......''

''پلیز خالہ بی!'' ایمن نے ایک دم سے انہیں ٹوکا، جبکہ وہ والٹ سے اپنا کارڈ نکال چکا تھا۔

''بہت شکریہ خالہ جان! مجھے اس قابل سمجھنے کا اور مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکا۔ یہ میرا کارڈ ہے آفس کا، ظاہر ہے گھر تو کوئی ہے نہیں۔ اس پر میرا کانٹیکٹ نمبر بھی ہے۔ آپ مجھے یاد کریں گی تو مجھے خوشی ہوگی اور ایمن! خالہ جان بالکل درست کہتی ہیں۔ زندگی میں بہت سے مسائل ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے مرد و عورت کی تخصیص ضروری ہو یا نہ ہو، کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے، اور آج سے میں آپ کے ساتھ ہوں اینڈ آئی مین اٹ۔''

وہ جاتے جاتے اس کے پاس آکر کچھ اس طرح سے بولا کہ آخری دو جملے خالہ بی سن ہی نہ سکیں اگر سن بھی لیتیں تو اس وقت ان سے بڑا انجان اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ایمن اسے چھوڑنے باہر تک ساتھ گئی۔

''ماشاء اللہ سے گھر آپ کا بہت زبردست ہے۔'' وہ جاتے جاتے رک کر بولا ایمن نے نظریں چرالیں اور سر ہلا کر رہ گئی۔

''کل ملاقات ہوگی؟'' گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا وہ اس کے پاس کھڑی اس کے لباس سے اٹھتی مسحور کن خوشبو کو اپنے اندر اترتا محسوس کر رہی تھی۔

''دیکھو ابھی تو ''بے کار'' ہوں۔ گاڑی کا کوئی انتظام ہوتا ہے تو پھر ہی یا کسی سے......''

اسے ایک دم گولڈی کے ہرجائی پن کا خیال آگیا تو کہتے کہتے رک گئی۔

''او کے ٹیک کیئر۔'' اس نے مسکرا کر الوداعی کلمات بولے۔

''میں کل شام کو تمہیں پک کرلوں گا۔ چھ بجے تیار رہنا۔'' وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولا۔

''میں فون کر کے بتادوں گی جو موڈ ہوا بائے۔'' اس نے ہاتھ ہلا کر کہا اور گیٹ کے اندر جاتے ہوئے گیٹ بند کرگئی۔ شہریار نے گاڑی آگے بڑھادی۔

''دیکھو۔ اللہ نے ہماری سن لی۔'' اس کی توقع کے عین مطابق خالہ بی پُر جوش انداز میں بولیں۔

''وہ کیسے بھلا؟'' وہ کشن گود میں لے کر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کرنے لگی۔

''کیسا گھڑا گھڑایا ہیرا بھیج دیا ہماری مدد کو۔'' وہ اس کے پیروں کی طرف صوفے پر آکر بیٹھ گئیں۔

''کیسی مدد؟ ہمارے گھر کیا آگ لگی ہے جو ہمیں اس کی مدد درکار ہے۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی اور ذرا آگے ہو کر خالہ بی کے کندھے کی سائیڈ سے ٹی وی دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''پلیز ادھر سے تو اٹھ جائیں۔'' آدھی نظر آتی اسکرین پر وہ جھلا کر بولی۔

''اے پرے کرو اس منحوس کو، جہاں دو بندے بات کرنے کو بیٹھے بیچ میں یہ گھس آتا ہے اپنی بک بک کرنے۔ اب وہ دونوں کیا بات کریں۔ آپس میں ٹکٹکی باندھے اس کو تکتے رہتے ہیں کم بخت نے بندے کو بندے سے دور کردیا ہے۔ اس کے مشوروں پر سب کان دھرتے ہیں اس کا دکھایا ہوا لبادہ پہنتے ہیں۔ اسی کے بتائے کھانے اچھے لگتے ہیں۔ اسی میں چلتے پھرتے مصنوعی انسان آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ خود بھی ان ہی جیسا ہو جانا چاہتے ہیں جب نہیں ہو پاتے تو اپنے اور دوسروں کے گلے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ ساری چالیں، سارے دھوکے یہ دماغوں میں ڈال رہا ہے شیطان کا سب سے مضبوط آلہ کار ہے اور اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا، جسے دیکھو وہ اسی کا دیوانہ ہوا نظر آرہا ہے پہلے انسان کے دکھ سکھ کا ساتھی انسان ہوتا تھا۔ اب یہ چوبیس انچ کا رنگ برنگا ڈبہ خوش ہو تو اس کے آگے بیٹھ کر تھرکنے لگو۔ اداس ہو تو دیوانوں کی طرح چینل پہ چینل بدلتے مخبوط الحواس بنے جاؤ آدمی سے آدمیت چھین لی، اس موئے نے اور کسی کا اس کے جرائم کی طرف دھیان نہیں، سب ہی اس کے اوصاف کے گن گاتے ہیں کیا بچے کیا جوان کیا بڑے کیا بوڑھے کیا پاگل کیا عقل والے......''

''افوہ خالہ بی! حد ہوگئی۔ آپ کو تو ٹی وی کے خلاف کسی ٹاک شو میں بھیج دیں تو ساروں کو ناک آؤٹ ہی کر کے آئیں گی۔ لیجیے بند کردیتی ہوں۔ کہیے کیا کہنا ہے اور پلیز یہ شادی شادی نہ

الاپے گا۔"

اس نے عاجز آتے ہوئے ٹی وی آف کر کے ریموٹ پرے پھینک دیا اور بیزار شکل بنا کر خالہ بی کی طرف دیکھنے لگی۔

"ضروری ہے میری بیٹی! بہت ضروری ہے تمہارے لیے شادی بہت ضروری ہے۔ بہشتی ماں باپ زندہ رہتے بھلے دس سال اور نہ کوئی نام لیتا پروا نہیں تھی۔ ابھی تمہاری عمر ہے بھی کہاں شادی کی۔ شادی تو پوری ذمہ داریوں کے ایک معاہدے پر دستخط کرنے کا نام ہے اور تم ابھی کیا کوئی ذمہ داری اٹھاؤ گی۔ اسی لیے تو دل ڈرتا ہے کانپتا ہے۔ پندرہ برس کی تھی میں جب ماں باپ نے اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونے کے لیے بیاہ دیا۔ ابا تو تھے نہیں۔ اماں میری شادی کے دو سال بعد ابا سے جا ملیں تو مت پوچھو پھر اس شادی کے سمجھوتے نے کیسے کس بل نکالے میرے، وہ تو شکر شادی کے چار پانچ سال تک کوئی بچہ ہی نہ ہوا اور جب دونوں بچے اوپر تلے ہوئے تو کمانے والا ہی نہ تھا، ہائے کیسی قیامت تھی مجھ کمزور کے لیے اور کیسی آفت میرے کم سن بچوں کے لیے، عمر ایسی کہ چھپائے نہ چھپے۔ ڈھکیے نہ بنے، بھرپور جوانی تو آئی ہی بیاہ کے پانچ برس بعد تھی کہ جوانی کی حفاظت کرنے والا ہی نہ رہا نہ ہاتھ میں کوئی ہنر نہ کسب نہ کوئی ڈگری نہ لکھت پڑھت کی سمجھ، سر پر اپنی چھت نہ پیروں تلے چند گز زمین۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔

"مرنے والے تو مر کر منوں مٹی تلے سو جاتے ہیں ہائے نیندیں تو برباد ہو جاتی ہیں پیچھے رہ جانے والوں کی۔ مت پوچھو میری گڑیا! یہ قیامت میں نے کیسی جھیلی۔"

"اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے تمہارے بہشتی نیک ماں باپ کو نہ وہ دونوں ہوتے تو آج شاید میں بھی کوئی گئے وقتوں کی کہانی بن چکی ہوتی۔" انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں اترے نادیدہ آنسوؤں کو رگڑا۔

"دونوں نے خدا لگتی کہوں۔ عزت سے، مال و دولت سے، اخلاقی سہارے جس جس چیز کی مجھے ضرورت ہوئی۔ ہر طرح سے بہم پہنچائی چھوٹا سا سہی اپنا گھر لے کر دیا پھر سال بھر کا راشن اور دوسری ضروریات خود گھر آ کر پوری کر جاتے تھے بس گھر بیٹھے بچوں کو قرآن پڑھاتی یا کوئی اور معمولی دست کاری کا کام اور اس سے کیا بنتا تھا تمام تر ذمہ داری تو ان دونوں نے اٹھا رکھی تھی۔ اللہ انہیں اس نیکی کا ایسا اجر دے کہ......" وہ رکیں اور سچ مچ رونے لگیں۔

"آج بھی ایسی کمزور ناتواں اور کم ہمت ہوں کہ ان کے احسانوں کا کچھ بدلہ اتارنے کا موقع آیا ہے تو جان چھڑا کر بھاگی جا رہی ہوں۔ خود غرض ہوں اور اپنے بچوں کی محبت میں بے حد

بچی، ان کو دیکھے بغیر رہ نہیں سکتی اور پھر ابھی بھی اس قابل نہیں کہ تھوڑی بہت کوئی مالی مدد ہی کر سکوں۔ الٹا تم پر بوجھ بنی جا رہی ہوں۔ اس لیے کہتی ہوں کہ کسی اچھے نیک شریف اور مہذب انسان کا ساتھ مل جائے تو سمجھ کچھ تو ان کی نظروں کے سامنے سرخرو ہو سکوں گی ورنہ...... کیسے کیسے ان دونوں کا سامنا کروں گی۔" وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکنے لگیں تو ایمن انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"ہر شخص کو اپنی "بچت" کی فکر ہے چاہے دوسرے کی آزادی بیچ کر دام کھرے کیے جائیں۔"

"اچھا پلیز خالہ بی! روئیں تو نہیں۔" وہ بیزاری سی آواز میں بولی۔

"روک رہی ہوں شرم ساری کے آنسو ہیں، پر کیا فائدہ؟"

انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے منہ صاف کیا "جو یہ آنسو کسی کے کام نہ آ سکیں۔ سن میری بچی! غور سے میری بات۔"

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے کہا۔ آنسوؤں سے ان کی آنکھیں دھل کر گلابی سی ہو رہی تھیں۔

"مجھے یہ لڑکا بڑا اچھا لگا ہے۔ ہر لحاظ سے ویسا جیسا میں تمہارے لیے سوچ رہی تھی۔ عمر بھی مناسب اور شکل و صورت تو اللہ کے فضل سے بہت ہی مناسب، پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ پڑھا لکھا ہے گھر کا مسئلہ ہے۔ وہ بھی بات بنے گی تو کہوں گی پہلے گھر لے...... اور......"

"خالہ بی! آپ بھولی ہیں بہت۔" اس نے بے زاری سے کہتے ہوئے ٹانگیں سمیٹیں۔

"کیا مطلب؟ بے وقوف ہوں۔ صاف کہو یا مجھے بندے کی پہچان نہیں کھرے کھوٹے میں فرق نہیں کر سکتی۔" وہ خفا ہوتے ہوئے اپنے ہاتھ چھڑا کر بولیں۔

"خالہ بی! جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں، یہی وہ سوچ رہا ہو تو............"

"سوچ رہا ہو تو اچھی بات ہے ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔" وہ چمک کر بولیں۔

"وہ ہمیں مال دار آسامی سمجھ کر اتنا جھکاؤ شو کر رہا ہو؟" ایمن نے کہا تو خالہ بی لحہ بھر کو چپ کر گئیں۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" انہوں نے کھنکار کر کہا۔

"آخر وہ بھی اس دنیا کا باسی ہے آج کل کے رجحان سے ہٹ کر تو نہیں سوچے گا، پر جیسی اس کی حیثیت ہے۔ ہم اس سے کم تر تو نہیں ہیں کسی بھی طرح۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بول رہی تھیں، جیسے جواب میں کوئی دلیل سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

"خالہ بی! وہ آپ کو شکل سے بے وقوف تو نہیں لگتا۔"

وہ سر ہلا کر رہ گئیں یا شاید خود بخود ہل گیا تھا۔

"تو اس کا مطلب کیا ہے؟" وہ ایک لمبی خاموشی کے بعد بولیں۔

"ہم سب کچھ سے سچ سچ بتا دیں۔" وہ آرام سے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

"اے خبردار!" خالہ بی کو جیسے کسی نے ڈنک مارا۔ "اگر تم نے غلطی سے بھی یہ حماقت کی ہو۔" وہ ایک دم غصے میں آ کر بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں نہیں بتاؤں گی اور آپ بھی اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھائیں گی۔ خواہ مخواہ تو میں کسی کے سر پر مسلط ہونا پسند نہیں کروں گی۔" ان کے اٹھتے ہی اس نے پھر ٹی وی آن کر لیا۔

"ہاں یوں ہی میرے سینے پر مونگ دلنا ہے۔" وہ منہ میں بڑبڑائیں کہ ایمن کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"چلو صبح ذرا پتا کرواتی ہوں، یہ ادھر دفتر میں کرتا کیا ہے؟" انہوں نے اٹھ کر کارڈ دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کہاں سے پتا کروائیں گی بھلا۔" وہ مذاق اڑانے والے لہجے میں بولی۔

"کروالوں گی پتا۔ ایسا احمق نہ سمجھو مجھے۔" اسی وقت ڈور بیل بج اٹھی۔

"یہ اس وقت کون آ گیا بھلا اور اپنے نمک حرام ملازموں کو دیکھو۔ کم بخت سارے کے سارے ہی منہ موڑ گئے۔ ہر مہینے جیب گرم رہتی تھی تو دم ہلاتے رہتے تھے مالکوں کی آنکھیں بند ہوتے ہی کیسے آنکھیں دکھاتے ایک ایک کرتے چلتے بنے نامراد۔" وہ بڑبڑاتی گیٹ کھولنے چل دیں۔

وہ خالہ بی کے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھ کر ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا طریقہ ہے؟" وہ اندر داخل ہوتے ہی غصے سے بولے۔

"کون سا طریقہ؟" وہ تیکھے چتون سے بے لحاظ لہجے میں بولی۔

"ہوٹل سے بغیر کسی بات کا جواب دیے اٹھ کر چلی آئیں اور فون کرتا ہوں تو ریسیو نہیں کرتیں۔ آخر ایسا کیا کہہ دیا میں نے تم سے۔" وہ بھی دوبدو اس کے سامنے آ کر بولے۔

"ابھی کچھ کہنے کی کسر باقی تھی کیا؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔

خالہ بی نے پیچھے کھڑے کھڑے تائید میں سر ہلا دیا۔

"ایسا کچھ انوکھا یا انہونا تو نہیں کہا تھا میں نے۔ تمہاری مشکلات دیکھتے ہوئے ایک بہترین پرپوزل پیش کیا تھا اور بس۔" انہیں کسی نے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی آگے بڑھ کر سنگل صوفے پر بیٹھ گئے۔

"شکریہ بہت آپ کی اس خاص نظر کرم کا۔ شرم نہ آئی آپ کو اپنا پرپوزل میرے لیے...... میرے لیے...... بھول گئے آپ، کیا کہتے تھے۔ آپ مجھے بیٹی...... بیٹی کہتے تھے۔ آپ مجھے......" وہ

کھڑے ہوتے ہوئے یوں غصے سے چلائی جیسے کسی نے سوکھے بھس میں جلتی تیلی پھینک دی ہو۔

"میں اس سے کب انکار کر رہا ہوں مگر یہ بات بھی تو سچ ہے کہ تم بہر حال میری بیٹی تو نہیں تھیں اور کسی کو بیٹی، بیٹا یا ماں باپ کہہ دینے سے کوئی حقیقی رشتہ تو قائم نہیں ہو جاتا۔ اس کی شرع نے بھی مذمت کی ہے اور......"

"بس کریں اچھے نہیں لگتے آپ یوں اپنی دوغلی صورت کو شرع کے فریم میں پینٹ کرتے ہوئے۔" وہ سرخ چہرہ لیے غصے میں بولی۔

"شٹ اپ!" انہیں بھی غصہ آ ہی گیا۔ "میں نے کوئی دوغلا پن نہیں دکھایا جو دل میں، جو سمجھ میں آیا، تمہاری بہتری کے لیے کہہ دیا۔ تم نے اس کو اتنے نیگیٹو انداز میں لیا تو تمہاری مرضی۔ میں نے کسی بھی اوچھے طریقے سے کوئی زور زبردستی نہیں کی۔ تمہارا دل مانتا تو ٹھیک تھا۔ نہیں مانتا تو نو پرابلم۔ کم سے کم بات تو کرو۔ یوں منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولے تو ایمن کو اور بھی غصہ آ گیا۔

"منہ چھپانے کی ضرورت مجھے نہیں آپ کو ہے۔ جس طرح کی "بہتری" آپ میرے بارے میں سوچ رہے ہیں، آپ کی جگہ کوئی غیرت والا شخص ہوتا تو سامنے ہی نہ آتا۔" وہ غصے میں دوٹوک انداز میں بولی۔

"واٹ!" راشد صاحب کا ری ایکشن فطری تھا۔ وہ غصے میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔ میں......" انہوں نے شدید غصے میں خود کو کچھ سخت ترین کہنے سے روکا۔

"ناجائز فائدے تو آپ نے اٹھائے ہیں مسٹر راشد! میرے پیرنٹس کی ناگہانی موت کے، ان کے بزنس میں کتنے فیصد شیئرز تھے اور کہاں کہاں تھے۔ آپ اور آپ کے وکیل صاحب بخوبی جانتے تھے اور ان چھ ماہ کے دوران آپ نے کس کس طرح سے ہر ثبوت، ہر پروف کو غائب کیا ہے۔ اس کے بعد سوچیں۔ آپ کے جائز کام کیسے ہوں گے، آپ جیسے لوگ تو مردوں کے کفن بیچ کر کھا جاتے ہیں۔ آپ نے تو فقط میرے باپ کی پراپرٹی ہضم کی ہے اور اب ازراہِ مہربانی اس سارے ناجائز پروسیس کو جائز آئی مین لیگلائز کرنے کے لیے آپ مجھ کو اپنے سایہ عاطفت میں لے کر ایک احسان عظیم فرمانا چاہ رہے ہیں۔ آپ تو زبردست کھلاڑی ہیں راشد صاحب! مان گئی میں آپ کو اور آپ کے سارے گیم کو۔"

وہ عین ان کے مقابل کھڑی سرخ چہرہ لیے چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔ راشد صاحب کے چہرے کے رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتے جا رہے تھے۔ پہلے حیرت اور تردد تھا۔ بعد میں غصہ اور طیش بتدریج

بڑھتے چلے گئے۔

''اگر تم میرے مرحوم دوست کی بیٹی نہ ہوتیں تو خدا کی قسم تمہاری اس ساری بکواس پر میں تمہارا وہ حشر کرتا کہ دنیا عبرت پکڑتی۔ تمہاری لاش کے ٹکڑے کتے نوچتے پھرتے۔ احسان فراموش گھٹیا لڑکی! میں تمہیں گنواؤں۔ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا، اور تمہارا عیاش باپ جو ساری زندگی ٹک کر نہ بیٹھا، جو چار پیسے کماتا وہ تو ساری زندگی تمہاری اس بیماری کی پوٹ ماں کے نازنخرے اٹھاتا اسے ہسپتالوں میں لیے پھرتا جو سال بھر میں اپنی پونجی کا پرافٹ کماتا۔ اس کے ساتھ سیر سپاٹے اور دوا دارو پہ لگاتا رہا۔ وہ دونوں خود غرض اور بے حس تھے تو تم بھی ان ہی کا خون ہو۔ تمہارے اندر لحاظ، مروت، حیا کس طرح آسکتی ہے جب وہ بے حیائی سے مجھ سے قرض پر قرض اپنی چہیتی بیوی کی بیماری کے نام پر اینٹھتا گیا اور......''

''شٹ اپ......شٹ اپ یور ماؤتھ اینڈ گیٹ آؤٹ......''

''گیٹ لاسٹ......'' وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

راشد صاحب دانت پیستے اسے چند لمحے دیکھتے رہے پھر زمین پر پاؤں مارتے وہاں سے چلے گئے۔

اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے پیچھے پڑے صوفے پر گرنے کو تھی جب خالہ بی اسے تھامنے کو آگے بڑھیں۔

''بے وقوف ہو تم اور نادان بھی یہ دنیا اس جیسے گدھوں سے بھری پڑی ہے، محض اپنے جذباتی پن اور سچائی سے کس کس کا مقابلہ کرو گی۔ اکیلی ہو تم اور بغیر کسی سہارے کے، اب جو وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارتا گیا ہے تو کیا جا کر یونہی اپنے بستر پر لیٹ جائے گا۔ مردود کے شیطانی دماغ میں اپنی بے عزتی پر کیا کیا نہ انتقام کے حربے ابھریں گے اور تم...... پاگلوں کی طرح اس کے گریبان پر جھپٹ پڑیں، اسی لیے سمجھا رہی ہوں۔ اپنا سر پیٹ رہی ہوں بچی سمجھ کر۔ یہ وقت قیمتی ہے۔ بغیر کسی مشکل میں پڑے آبرومندانہ رستہ اپنالے۔ اچھا ہے۔ وہ لڑکا۔ کم از کم اس بڈھے کھوسٹ عیار لومڑ سے تو ہزار درجے......''

''پلیز خالہ! چپ کر جائیں۔ چپ کر جائیں اس وقت ورنہ میں خود کو شوٹ کرلوں گی۔ چپ کر جائیں۔''

وہ غصے میں چلاتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی تو خالہ بی تاسف سے اسے جاتا دیکھ کر سر ہلانے لگیں۔

☆☆☆

اور اس بے وقت کے طیش کا نتیجہ اگلے دن ہی نکل آیا۔

راشد نذیر نے گھر سے بے دخلی کے لیے انہیں دس دن کا نوٹس دے دیا تھا بہ صورت دیگر کیا ہو سکتا تھا۔ اس کا تصور کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

وہ تلملایا ہوا شخص غصے کی انتہا پر کس حد تک گر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ کچھ ایسا دشوار نہیں تھا۔

''آدمی کو بولتے وقت، چلاتے وقت کچھ تو اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہیے کہ یہ جو سامنے کھڑے شخص پر میں یونہی دولتیاں چلا رہا ہوں۔ کل کو اسی گدھے کو باپ بھی بنانا پڑسکتا ہے۔ آدمی ہے، بندہ بشر ہے۔ حاجت وضرورت سے بے نیاز کیسے ہو سکتا ہے۔ بولتے وقت تھوڑا خود پر قابو پالیا ہوتا، اس گوشت کے لوتھڑے کو سنبھال لیا ہوتا تو وہ کمبخت ایسے جلال میں نہ آتا۔ جانا تو تھا ہی مہینہ دو اور ٹھہر جاتا۔ چلو اگر مصلحت اندیشی کو نہیں سامنے رکھا جس کی منت بھی کی کہ ان حالات میں اس سے بہتر راستہ اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ پر کون سنتا ہے۔ مجھ جیسی پاگل دیوانی کی۔ اب بھگتو اور کرو خالی گھر دس دن کے اندر، جیسے اماں باوا......''

خالہ بی کا پارہ نیچے آ ہی نہیں رہا تھا۔

''پلیز خالہ بی یوں چلانے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہر کسی نے شیوہ بنالیا ہے میرے ماں باپ کو طعنہ دینے کا۔ وہ جتنی دیر زندہ رہے۔ مجھے ایک کانٹے کی تکلیف نہیں پہنچی۔ اب وہ حیات نہیں اور ہر کسی نے انہیں کوسنے کو ٹھیکہ لے لیا ہے جیسے۔ بس اب کسی بھی بات میں ان کا ذکر نہیں آئے گا۔ سنا آپ نے۔ میری قسمت میں جتنا سکھ، جتنی خوشیاں ان کے باعث ملنا لکھی تھیں مل گئیں۔ اب آگے کیا ہونا ہے، کیا ہونے والا ہے۔ میں اسے سوچ سوچ کر نہ خود کو ہلکان کرسکتی ہوں اور نہ انہیں موردِ الزام ٹھہرا سکتی ہوں۔ آپ کو جانا ہے تو بے شک آپ ابھی اور اسی وقت چلی جائیں۔ مجھے جو کرنا ہوگا۔ کرلوں گی۔'' وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اپنے اصلی رنگ پر آتے ہوئے چلائی تھی۔

خالہ بی کچھ دیر تو ناسمجھی سے اسے دیکھتی رہیں یا پھر منہ میں آئے اگلے طعنے تشنے اگلنے کے پروگرام کو ملتوی کرنے کی کوشش میں لگی تھیں۔ اسی لیے چپ رہیں۔

''اب اس کا کوئی حل؟'' انہوں نے نوٹس کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ تو طے ہے کہ میں تمہیں یونہی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، سو اس پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک سامنے کا حل ہے جو آسان ہے بھی ہے اور قابل عمل بھی۔''

وہ اپنے کھولتے غصے اور طعنوں پر قابو پا کر بالکل نارمل لہجے میں بولی تھیں کہ لمحہ بھر کو ایمن ہی شرمسار سی ہوگئی کہ وہ رات سے ان پر اسی طرح چلا رہی ہے۔ بے شک وہ من مرضی کی مالک تھی۔ اپنے سامنے کسی اور کی سنتی بھی نہیں تھی۔ مگر بدتمیز یا زبان دراز بہرحال نہیں تھی یہ تو شاید

ان تیزی سے بدلتے حالات اور مشکلات نے اس کی اصلی شخصیت کے خول میں دراڑیں سی ڈال دی تھیں۔

''اور ایما ڈارلنگ جینوئن آدمی وہی ہوتا ہے جو بھری برسات میں، جلتی بھنتی تپتی بھری گرمی میں اور برفیلی سرد شاموں میں ایک سا ہی رہے۔ موسم رنگ بدلے، اس کی شخصیت کا رنگ ایک ہی رہنا چاہیے۔ پکے والا کبھی نہ اترنے والا۔ ان معمولی برساتوں اور تیز دھوپ سے نہ اڑ جانے والا نہ بہہ جانے والا۔ جس نے اپنے رنگ کو زندگی کے کڑے سے کڑے وقت میں بدلنے سے بچا لیا پھر اسے کوئی توڑ پھوڑ نہیں سکتا۔ خود کو اتنا مضبوط، اتنا کمپوز رکھو کہ اوپر کا ملمع بھی اترنے نہ پائے جو تمہاری اندرونی شخصیت و کردار کی چمک دمک اور پالش ہے پھر دیکھو حالات کیسے تمہاری ہی وفا کا دم بھرتے ہیں شرط ہے تمہاری وفاداری و استواری۔''

اف ماما پاپا مرنے کے بعد اس کے کتنے قریب آ گئے تھے۔

وہ ساری باتیں، وہ سارے مکالمے جو اس نے ان کی زندگی میں یونہی چلتے پھرتے بورڈنگ گیٹ پر انہیں سی آف کرتے، ہاتھ ہلاتے ان کے مشفق لہجے میں سنی تھیں درخورِ اعتناء نہ سمجھی تھیں اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ساری باتیں وہ سارے اقوال کس طرح زیر زبر کے ساتھ اس کے دماغ کی تختی پر نقش ہوئے پڑے ہیں۔

''اتنے برے حالات تو نہیں کہ میں اپنا اصل رنگ ہی بہا ڈالوں۔''

اس نے خود سے سرگوشی کی اور آرام سے بیٹھ کر بچا ہوا ناشتہ کرنے لگی۔

خالہ بی نے اسے بیٹھتے دیکھ کر اپنی کرسی سنبھال لی۔

''تم میرے ساتھ سکھر چلو۔ بس ہو گیا فیصلہ۔'' وہ اپنی چائے پیالے میں نکالتے ہوئے بولیں، انداز اچھا خاصہ حکمیہ تھا۔ ایمن کو ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

''ٹھیک ہے نا۔ پھر تم خدانخواستہ کوئی لاوارث ہو جو یونہی ادھر ادھر رلتی پھرو۔ میں ابھی ہوں نا تمہارے سر پر۔'' ان کے لہجے میں نہیں نظروں سے بھی ڈھیر ساری ممتا ابلنے لگی تھی۔

''نہیں خالہ بی! بالکل نہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔'' اس نے سلائس کا آخری لقمہ منہ میں ڈالا اور کرسی ذرا پرے کھسکا کر بیٹھ گئی۔

''مگر بیٹا! اس میں ہرج ہی کیا ہے۔'' وہ عاجز سی آ کر بولیں۔

'خالہ بی! آپ کو معلوم ہے، میں کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتی، اسپیشلی آپ کے ساتھ۔''

اس نے کوئی بھی لحاظ مروت رکھے بغیر صاف گوئی سے کہا۔

خالہ بی بے چاری کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

''ہاں بیٹا! تم ہم جیسے غریبوں کے ساتھ...... ٹھیک ہے تمہارا کہا بجا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر سڑک سڑک چائے پینے لگیں۔

''یہ بات نہیں خالہ بی!'' وہ بہرحال انہیں دکھی نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''اب پھر کیا کرو گی اور یہ جو نوٹس۔'' انہوں نے فوراً بات بدل دی۔

''ویسے تو اس کا حل ہو سکتا ہے، میں کورٹ ہی کے ذریعے Stay Order لا سکتی ہوں۔ کم از کم سال بھر کے لیے مگر خالہ بی! میں اس شخص کی ملکیت میں کسی بھی طرح رہنا گوارا نہیں کروں گی۔ ہم دس دن میں گھر خالی کر دیں گے۔ دیٹس آل۔'' وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جائیں گے؟'' خالہ بی چائے پینا بھول گئیں۔

''کہیں بھی۔'' وہ لاپروائی سے میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''وہ جو تمہارے اَن گنت دوست تھے، تمہارے باپ کے لکھ پتی دوستوں کا ہجوم۔ وہ کیا ہوا کسی اور سے رابطہ کرو۔ کچھ مہلت لے لی جائے۔''

''پلیز خالہ بی! مجھے کسی سے کوئی رابطہ نہیں کرنا اور نہ کوئی مہلت لینی ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''تو ٹھیک ہے پھر شادی کر لو۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

''شادی کر لوں۔ کیا لڑکے درختوں سے لٹکے ہیں ہاتھ بڑھا کر کسی کو بھی اتار لوں اور شادی کر لوں۔ حد ہو گئی۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بڑبڑائی۔

''کل جو وہ لڑکا شہریار آیا تھا۔ ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ اس کا کارڈ کہاں گیا۔ یہ رکھا ہے۔'' وہ اٹھ کر ٹرالی کی دراز کھول کر دیکھنے لگیں۔

''اس کو کیا کریں گی؟''

''قریشی صاحب کے پاس لے کر جا رہی ہوں۔ ان کے ماشاءاللہ بڑے تعلقات ہیں۔ شام سے پہلے اس لڑکے کے بارے میں سب معلوم کروا دیں گے پھر میں خود ہی فون کر کے بلوا لوں گی اسے...... بات ختم۔'' وہ بات ختم کر کے تیزی سے بچی ہوئی چائے پینے لگیں۔

''اچھا! اگر وہ اس نیت سے ادھر آیا ہی نہ ہو بلکہ فقط تعزیت کے خیال سے...... اور خالہ بی! میں اسے کون سا جانتی ہوں، محض دو دن کی واقفیت کی بنیاد پر عمر بھر کا سمجھوتا...... میں نہیں کر سکتی۔'' وہ یہ تصور کرتے ہی گھبرا سی گئی تھی۔

''اور بی بی! جن سے عمر بھر کے تعلقات تھے۔ ان کے رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھ لیے، خیر سے وہ تمہارے گولڈی اور بنٹی جن کے لیے تم ساری دنیا سے لڑنے مرنے کو تیار ہوتی تھیں، ان کے عشق و محبت میں نہ دن دیکھا نہ رات بس گاڑی کی چابی اٹھائی اور نکل پڑنا۔ ان کی دوستی تو برسوں

پرانی تھی، وہ کیا ہوئی؟''

پہلی بار اسے لگا کسی کی گفتگو سے یا کسی کے خیال سے دل کو اتنی تکلیف بھی ہو سکتی ہے۔ وہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔

کھڑکی سے باہر نظر آتے امرود کے پیڑ کی ہلتی شاخوں کو نظر جمائے دیکھنے لگی تھی۔

کل صرف ایک بار گولڈی کی میسڈ کال آئی تھی اور اس نے غصے میں توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے دوبارہ محض میسڈ کال کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

واقعی خالہ بی درست کہتی تھیں۔ نئے پرانے کی بنیاد پر کسی کے خلوص کو پرکھا نہیں جا سکتا۔

مگر ایک کسوٹی تو ایسی ہے جس پر نیا پرانا تو کیا اصلی نقلی، کھرا کھوٹا سب جانچا جا سکتا تھا اور بالکل ٹھیک نتیجہ حاصل ہو سکتا تھا اور وہ کسوٹی تھی پیسے کی کسوٹی۔

اس کسوٹی پر شہریار صاحب کی خلوص نیت کو بڑی آسانی سے جانچا جا سکتا ہے۔ اس سوچ نے اسے ایک دم سے مطمئن سا کر دیا تھا۔

مگر یہ اطمینان بھی وقتی تھا

''اگر وہ پرکھا گیا اور پیمائش سے کم نکلا تو...... تو کیا کروں گی؟'' ہاسٹل اور جاب سب کچھ جیسے کسی اندھیرے خلا میں گم ہونے لگتا تھا۔

''میں ابھی آئی۔ قریشی صاحب ابھی گھر میں ہوں گے اور ان کے ملازم کو بھی، لا کر ذرا گھر صاف کروالوں، دو چار دن ہی سہی، رہنا تو ہے نا ادھر۔'' وہ اس کا جواب سنے بغیر تیز تیز بولتی باہر نکل گئیں۔

دو چار دن...... بس دو چار دن اور...... ایک عجیب سی ڈپریس کیفیت اس کے دل کا احاطہ کرنے لگی۔

''تو کیا مجھے یہاں سے کچھ بھی نہیں لینا جانے سے پہلے...... اور جانا تو طے ہے۔'' وہ اٹھ کر بے چین سی ٹہلنے لگی۔

اسی وقت اس کے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔ گولڈی کا نمبر آ رہا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''اوہ فولش گرل! کہاں ہو تم؟ کل سے کال کر رہا ہوں۔'' وہ چھوٹتے ہی حسب عادت بولا۔

''اچھا ہاں یاد آیا۔ بیس کے قریب مس کالز تو میں نے بھی دیکھی تھیں۔'' وہ طنز بھرے لہجے میں بولی۔

[illegible]

''کس خوشی میں؟'' اس کا موڈ سخت آف تھا۔

''اوئیس۔ خوشی بھی ہے بلکہ سرپرائز سمجھو۔ آؤ گی تو پتا چلے گا۔'' وہ ایک دم سے پُر جوش ہو کر بولا۔

''سرپرائز کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ بتانا چاہو تو ابھی بتا دو۔'' وہ روکھے سے لہجے میں بولی۔

''اتنی آدم بیزاری کیوں ہو رہی ہو۔ کیا کاٹا ہے کسی نے؟'' وہ اس کے انداز پر چڑ کر بولا۔

''ہاں کاٹا۔''

''کس نے تم جیسی خونخوار بلی کو کاٹنے کی جرأت کی؟''

''جھوٹی دوستی اور مصنوعی محبت نے۔ سنا تم نے۔'' وہ تیزی سے چڑے ہوئے لہجے میں بولی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

''اوہ کم آن ایما! تم یہ کیا لوئر مڈل کلاس کی سی حساسیت کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ یار ایسے ڈائیلاگ تو ان کے ڈراموں میں عام چلتے ہیں۔ تم ان کی زد میں کہاں سے آ گئیں۔'' وہ بے تکے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

''جب سے لوگوں کے اصل چہرے دیکھے ہیں۔''

''اوہ پلیز۔ یہ شکوے شکایتیں اور روٹھنا وغیرہ ادھار رکھو۔ ابھی تو ادھر آؤ ایک جمباسٹک بریکنگ نیوز ہے۔ آ رہی ہو نا۔'' وہ اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں آ سکتی ''بے کار'' ہوں۔'' وہ بے زاری ہو کر بولی۔

''بے کار...... مطلب فارغ ہو نا تو آ جاؤ۔''

''گاڑی نہیں ہے میرے پاس۔ سنا تم نے کچھ۔'' وہ اب کے زور سے چلائی۔

''اف کیا کان پھاڑو گی میرا۔ اچھا میں آ رہا ہوں تمہیں پک کرنے۔ تم تیار ہو جاؤ، تھوڑا ہلا گلا اور مستی پروگرام ہے۔ میں آ رہا ہوں تیار ہو جاؤ۔ بائے۔'' اس نے تیز تیز کہتے ہوئے لائن منقطع کر دی۔ ''ہلا گلا اور مستی پروگرام۔'' اس نے موبائل رکھتے ہوئے زیر لب دہرایا۔ ان چند دنوں میں ہی اپنے منہ سے بار بار استعمال کرنے والے یہ الفاظ اسے کتنے اجنبی سے لگ رہے تھے۔

''کیا سرپرائز ہو گا اس کے پاس اور لہجے سے کتنا خوش اور بشاش لگ رہا تھا۔ کیا اس شام کی بات، میرا پرپوزل اگر اس نے او کے کر دیا ہو تو......'' اس کے دماغ میں نئی سوچ ابھری۔

''شاید اس نے میری اس شام کی اداس صورت اور پریشانی کا ذکر بنٹی سے، اپنی ماما سے کیا ہو اور ان کا جواب...... مثبت جواب آنے میں اتنا ٹائم لگ گیا ہو۔ وہ مجھے جانتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ ہیں، دوست ہیں۔ ایک دوسرے کے دل کی بات کہے بغیر جان لیتے ہیں۔ میری

اینڈ جینز کا نوٹ سے ہمارا ساتھ ہے پھر گھوڑا گلی بورڈنگ میں تین سال اکٹھے گزارے کہ ہم تینوں کی تکون میں کتنا عرصہ اور کوئی داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکا تھا۔ مجھے ان کی دوستی کے بارے میں مشکوک نہیں ہونا چاہیے، اور یہ بھی ہے کہ میں گولڈی کے خلوص پر شک نہیں کرسکتی اور یہ بھی ہے کہ میں اس کے ''اوکے'' کہہ دینے کے باوجود اس سے شادی تو نہیں کرسکتی۔ اس بات کے لیے تو خالہ بھی کسی صورت راضی نہیں ہوں گی اگرچہ اس دن وہ اپنے منہ سے کہہ رہی تھیں کہ گولڈی ہی سے میں شادی کرلوں پر مجھے پتا ہے، وہ اوپرے دل سے کہہ رہی تھیں۔''

میں شہریار کے بارے میں تو سوچنے کی کوشش کرسکتی ہوں مگر گولڈی کے بارے میں نہیں۔ صرف مجھے اس کے یوں منہ چھپانے سے دکھ ہوا تھا۔ بھلے وہ انکار کردیتا۔ مگر مجھے اس طرح اگنور نہ کرتا اور اب تو وہ آرہا ہے۔ مجھے لینے۔ دن بھر کے لیے ایک زبردست پروگرام، ہلا گلا، مستی اور خوشی...... اف کتنے دن ہوگئے ہیں یوں بور پھرتے ہوئے محض روپے پیسے اور پراپرٹی کے گم ہونے کا دکھ سینے پر لیے۔ آج ساری ٹینشن ریلیز ہوجائے گی۔

واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز گولڈی ڈیئر! میرے لیے تو فرینڈز کی کمپنی دوبارہ مل جانا ہی زبردست سرپرائز ہے۔ اس سے بڑی بریکنگ نیوز تو میرے لیے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ تھینکس آئی ایم ہیپی۔ مجھے یوں روئی روئی صورت بنا کر پھرنے سے کتنی نفرت ہے۔ اس خوشی میں ایک بھرپور ہاتھ لیا جائے اور زبردست ڈریسنگ۔ گولڈی یقیناً آتا ہوگا۔''

اس نے گھڑی پر نگاہ کی۔ اب اس کے پاس زیادہ ٹائم نہیں تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں تیار ہونے چل دی۔

☆☆☆

لگتا تھا۔ کوئی بہت ہی خاص قسم کا سرپرائز تھا جو گولڈی بھی آج اچھے خاصے ''سرپرائز'' حلیے میں تھا۔

امپورٹڈ برانڈ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس، سوکھا سڑا، تنگ سینے اور جھکے ہوئے تنگ سے کندھوں والا گولڈی تو اس سوٹ کی لش پش میں ہی کہیں چھپا تھا۔ اس کے تنگ کندھے اور گھٹا ہوا سینہ جو عام ڈریس، گندی سی مسلی ہوئی شرٹ اور جگہ جگہ سے ادھڑی پھٹی رنگ اڑی جینز میں کتنا رف اور معمولی سا لگتا تھا پھر دونوں ہاتھوں کی سخت ہڈیوں والی آخری انگلیوں کے ناخنوں پر گلیٹر کے ساتھ چمکتی نیل پالش نیلم زمرد یا دوسرے نقلی سٹونز والی موٹی انگوٹھیوں کے پہننے سے اس کے ہاتھ خوب صورت یا قابل توجہ دکھنے کے بجائے بہت کریہہ لگتے تھے۔ کم از کم ایمن کو بہت زیادہ مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے اس عزیز ترین دوست کا دل ذرا سا بھی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

چوڑی لکڑی کی پھٹی جیسی سانولی بالوں بھری کلائی پر مختلف رنگوں کے بینڈز اور بریسلیٹ اکثر ہی چڑھے ہوتے تھے۔ بال خوب جیل لگے سلیقے سے کھینچ کر بنائی ہوئی پونی میں کسے ہوئے اور شیو تو وہ اکثر ہی بڑھائے رکھتا تھا اگر شیو کر بھی لیتا تو اسٹار پلس کے کریکٹر کی طرح کہیں کہیں نقطہ نما داڑھی یا مونچھ چھوڑ دیا کرتا پھر بنٹی اور دوسرے فرینڈز کے مذاق اڑانے پر دو چار دن بعد ان پر بھی ریزر چلا دیا کرتا تھا۔

گولڈی کا تصور ذہن میں لاتے ہی ایک ، لاپروا، تھوڑا بچکانہ تھوڑا بگڑا ہوا تھوڑا مغرور اور رف اینڈ ٹف سا ایک ناپسندیدہ کردار ذہن میں آجاتا۔

مگر اس وقت وہ بالکل ایک بدلے ہوئے حلیے میں بالکل بدلا ہوا گولڈی نظر آرہا تھا۔

قیمتی لیدر کے بلیک ٹوہ والے شوز پہنے، سلیقے سے اچھی شیو بنائے، سیاہ گلاسز آنکھوں پر چڑھائے کندھوں تک آتے سیاہ سلکی بال سرے سے غائب تھے۔ اس کے سر کے بال کم تو ہوئے تھے مگر اتنے نہیں کہ کوئی اسٹائل ہی نہ بن سکے۔ شیمپو کیے کھڑے کھڑے سے بال اسے ایک فیشن ایبل پڑھا لکھا پرکشش نوجوان ظاہر کررہے تھے۔

ایمن گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی دروازہ پکڑ کر ٹھٹک گئی تھی۔ حد تو یہ کہ قریشی صاحب کی کوٹھی سے نکل کر اپنی کوٹھی کی باڑھ کراس کرکے گیٹ کے آگے کھڑی گاڑی میں بیٹھے نوجوان کو خالہ بی بھی نہیں پہچان سکی تھیں۔

آنکھ اچکا کر ایمن سے اس کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ وہ ذرا سا مسکرا کر خالہ بی کو ہاتھ ہلا کر کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گئی۔

''خیریت تو ہے۔ آج کہیں شوٹنگ تو نہیں ہے تمہاری؟'' وہ بیٹھتے ہی بولی۔

''ہاں ہاں۔'' اس کا قہقہہ ویسا ہی تھا بلند بانگ، پھٹے بانس جیسا کھردرا۔

''یہی سمجھ لو۔''

''سمجھ لو کیا۔ خواہ مخواہ کا سسپنس۔ پلیز گولڈی! بتاؤ مجھے، کیا سرپرائز ہے۔'' وہ زچ آکر بولی۔

''او ڈیئر تھوڑا ویٹ، اتنی بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔ تمہاری گاڑی کہاں گئی؟'' وہ موڑ مڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بیچ دی۔'' وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولی۔

''شوٹنگ تو آج تمہاری بھی لگ رہی ہے میڈم سنو وائٹ۔'' وہ اس کے نکھرے اجلے روپ پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بولا تو وہ بے اختیار ہی ذرا سا سمٹ گئی حالانکہ یہ تو ستائش کا بے حد معمولی انداز تھا۔

اب نہ جانے کہاں تبدیلی آگئی تھی کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر چونکنے لگی تھی۔ گولڈی وقتاً فوقتاً گردن موڑ کر اس پر ایک پُر شوق نگاہ گویا اچھال رہا تھا۔

وہ وائٹ شرٹ کے ساتھ وائٹ ہی پینٹ پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ نازک سینڈل کے ساتھ سلور میچنگ شولڈر بیگ تھا۔ تازہ شیمپو کی خوشبو سے مہکتے اس کے شولڈر کٹ بال اس کے چہرے کے اطراف پھریریاں سی لے رہے تھے۔

ان دونوں کے بیچ کچھ آگیا تھا!

کیا؟ اس کا سراغ اسے نہیں مل رہا تھا۔

پتا نہیں وہ کیوں اس سے پہلی سی بے تکلفی سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ اس سے بہت چاہتے ہوئے بھی کچھ شیئر نہیں کر پا رہی تھی حالانکہ اس وقت اس کا بہت جی چاہ رہا تھا، وہ اسے سب کچھ بتا دے اور کچھ نہیں تو راشد انکل کی خباثت، ان کے پرپوزل ...... یا کم سے کم صبح آنے والے نوٹس کے بارے میں ...... کچھ تو اسے بتائے، شاید اسی طرح یہ اَن دیکھی اجنبیت کی دیوار ڈھے جائے۔ اسے کوشش تو کرنی چاہیے۔

اس نے ایک نظر گولڈی کے بے نیاز سے مگر اچھے لگتے چہرے کی طرف دیکھا اور کہنے کے لیے لب کھولے۔

''نئی گاڑی لینی ہے نا تو اس ہفتے کا پروگرام بنا لو میں ساتھ چلوں گا۔ اس کے بعد ورنہ میں خاصا بزی ہو جاؤں گا کون سی گاڑی لو گی؟'' اس نے جو کہا ایمن کے کھلتے لب خود بخود بند ہو گئے۔

''ابھی سوچا نہیں۔'' وہ تکلیف دہ انداز میں کہہ کر باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

''گولڈی! ایک بات پوچھوں؟'' چند لمحے خود کو کمپوز کر کے اس نے پھر ہمت کر ڈالی۔

''ہاں پوچھو یار! آئس کریم چلے گی۔''

''نہیں ...... تم اس ...... شام ...... وہ جب میں تمہارے گھر ...... تم اپنے چاچو کے پاس گئے تھے اس کے بعد۔'' وہ اس شام کا واضح ذکر کرنے سے کترا رہی تھی کہ اس شام اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایمن نے گولڈی سے کیا کہا تھا۔

''چاچو کی طرف کیوں بھلا؟'' وہ ابرو اچکا کر گردن موڑتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں۔ گلاسز کے پیچھے ہونے کی وجہ سے ایمن جان نہ سکی۔

''یونہی میں نے سوچا۔ شاید تم ان کی طرف گئے ہو اور انہوں نے تمہیں بتایا ہو۔'' وہ تھکن زدہ لہجے میں بولی۔

''کس بارے میں؟'' وہ یکسر بے تاثر لہجے میں بولا تھا۔ ایمن نے ایک بار پھر اندازہ لگانے کی کوشش کی اور ناکام ہوئی۔

''میں پاپا کی پراپرٹی اور شیئرز کی ڈیٹیل لے کر گئی تھی ان کے پاس۔'' وہ اب اس ناقابلِ برداشت بوجھ کو اٹھائے اٹھائے تھک رہی تھی سو سب کہہ دینا چاہتی تھی۔

''پھر ...... پھر کیا کہا انہوں نے؟''

''انہوں نے ......'' وہ رکی۔ ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

''گویا اپنے پاپا کا بزنس سنبھالنے کا ارادہ ہے سمسٹر تو تم نے مکمل کیا نہیں۔ اس ادھوری تعلیم کے ساتھ کیسے سب کرو گی۔''

''چلو کر ہی لوگی۔ میں بھی تو جلد ہی پاپا کو جوائن کر رہا ہوں۔ دونوں مل کر ایک دوسرے کی حماقتوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔'' وہ ہنسا اور وہ اس کا ساتھ بھی نہیں دے سکی۔

''گولڈی ...... ! تمہارے چاچو بتا رہے تھے ...... بلکہ پہلے پاپا کے لائر ...... کچھ نہیں چھوڑ کر گئے وہ دونوں میرے لیے۔ کچھ بھی نہیں Even نہ گھر نہ کوئی پراپرٹی نہ......'' وہ رک رک کر گویا ایک ایک لفظ کانٹوں پر چلتے ہوئے بول رہی تھی۔

''اوکم آن ایما! نو مور جوک پلیز ...... تم دن بدن humorous (مزاحیہ) ہوتی جا رہی ہو۔ چلو آؤ اندر چلتے ہیں۔'' اس نے گاڑی اپنے گھر کے گیٹ کے آگے روکتے ہوئے گاڑی بند کر کے کہا۔

''جیسے اس شام تم جو کچھ کہہ کر گئیں اور ان سب کے باوجود مائی ڈیئر فرینڈ آئی لو یو۔ چلیں اب۔'' وہ اترتے اترتے رک کر اس کے ہاتھ کو گرم جوشی سے دبا کر بولا اور دروازہ کھول کر اتر گیا۔ وہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔

وہ لڑکی جس کے ماں باپ ایئر کریش میں مر گئے ہوں، اس کی پراپرٹی، بزنس سب کچھ پلک جھپکتے میں ختم ہو گیا ہو۔ اس کا قریب ترین، عزیز دوست اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ آج کل بہت ''مزاحیہ'' ہوتی جا رہی ہے۔

''کیا میں واقعی 'مزاحیہ' ہو گئی ہوں۔'' اس نے تیز چمکتی دھوپ میں آنکھوں میں اترتی شبنم کو جھٹکتے ہوئے خود سے پوچھا۔

''وہ جو تقدیر کے اچانک ''مذاق'' کا شکار ہو جائیں۔ وہ شاید دوسروں کو ایسے ہی ''مزاحیہ'' لگنے لگتے ہیں۔ وہ واقعی تقدیر کے اتنے اچانک بھیانک ''مذاق'' کا نشانہ بننے کے بعد ''مزاحیہ'' ہو گئی تھی کہ کوئی بھی اس کی بات سن کر ناقابلِ یقین سی کیفیت میں ہنس سکتا تھا۔ سر ہلا کر

ہوا میں مکھی اڑا سکتا تھا جیسے گولڈی نے کیا تھا تو کچھ غلط نہیں کیا تھا۔''

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

''تو اسے وہ شام اور اس شام کو میرا وہ ''مزاحیہ'' پرپوزل بھی یاد ہے اور اس نے اسے بطور ''مذاق'' ہی لیا ہے۔''

وہ بہت آہستہ قدموں سے چل رہی تھی۔ خود پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ سینڈل کیوں پہن کر آئی۔ اسے جاگرز کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ عام سی جوتی بھی پہننا بوجھ لگتا تھا۔

''ہائے ایما! آج اتنے دنوں بعد شکل دکھائی!'' بنٹی اپنے لاڈلے سائل پپی اور سفید رشین موٹی تازی بلی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دونوں اس کی گود میں، کندھے پر اٹکھیلیاں کر رہے تھے بنٹی کے آگے ماربل کے خوب صورت پیالوں میں دودھ پڑا تھا اور اس نخریلے لاڈلے نخروں سے تھوڑے سے دودھ کو زبان پر پھیرتے اور پھر بنٹی کے گرد گھومنے لگتے کبھی اس کی کمر سہلاتے اور کبھی اس کے ہاتھوں پر زبان پھیرنے لگتے۔

''تمہیں کون سا میری یاد آگئی۔ اتنے دنوں سے میں ہی آ رہی ہوں تم نے تو مس کال دینا بھی چھوڑ دی۔'' وہ شکوہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ اسے زود رنج لوگوں کی طرح شکوے شکایتیں کرنا پسند تھیں مگر آج نہ جانے کیسے اس کی زبان پھسل پڑی۔

''اوہ کم آن! آج کل یار! بہت بزی ہوں۔ مت پوچھو، کسی کو کیا میں خود کو بھی مسڈ کال نہیں دے رہی۔''

وہ للی کو گدگداتے ہوئے اس کے سلکی بالوں سے اپنے گال رگڑتے ہوئے بولی۔

''ایسی کون سی سونے کی کان کھود رہی ہو آج کل؟'' اس کے طنز میں بھی سونا چاندی، روپیہ پیسہ کی مثالیں آگئی تھیں کہ اسے اپنے یہ اجنبی انداز خود ہی بیگانے سے اور کچھ حیران کن سے لگ رہے تھے اور یوں طنز کرنا اس کا شیوہ تو نہیں تھا۔

''محبت کی کان میری جان! آج کل ہم محبت کی ''کان'' کھود رہے ہیں محبت کے ہیرے موتی ڈائمنڈز جھولی بھرے جا رہے ہیں لالچی کمپنیوں کی طرح اور طبیعت سیر ہونے میں نہیں آتی۔'' وہ سائل کو اپنی دودھیا گردن پر لٹاتے ہوئے سر پیچھے کی طرف ڈالتے ہوئے عجب مخمور سے لہجے میں بولی۔

''محبت کی کان؟ میں سمجھی نہیں۔''

''یہ تو میری جان وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس ''کان کنی'' میں ہاتھ ڈالا ہو۔ میرا مطلب ہے۔'' وہ سائل کو پرے کر کے تھوڑی سیدھی ہوئی ''محبت کی ہے کبھی؟''

''کرلیں گے یہ بھی۔ کوئی ایسا ضروری کام تو نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اور بھی غم ہیں زمانے

میں محبت کے سوا۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہہ ڈالا۔

''غم؟'' بنٹی زور سے ہنسی سائل چھوٹی سی چھلانگ لگا کر اس کے کندھے تک پہنچ گیا تھا۔ محبت تو خوشی ہے جوائے ایکسائٹمنٹ انتہائی مسرت اور تمہیں کیا بتاؤں ایما ڈارلنگ!'' ایمن تو اس کی حالت دیکھ کر دم بخود سی تھی۔ کتنی دیر تک کچھ کہنا پوچھنا ہی بھول گئی۔

''کون ہے وہ؟ بتاؤ گی نہیں۔''

''بتاؤں گی تمہیں، میری جان دکھاؤں گی تمہیں۔ نیکسٹ ویک گرینڈ فنکشن ہے۔ اسی لیے تو اتنی بزی ہوں۔ کل ہی تو دبئی سے آئی ہوں۔''

''دبئی گئی تھیں تم؟ کیا کرنے؟''

''محبت کی کان میں کھدائی کرنے۔'' وہ خود ہی کہہ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی ''تم بہت انوسینٹ، ایما ڈارلنگ!''

''افوہ بنٹی! یہ گولڈی کدھر رہ گیا۔ مجھے پارلر جانا تھا۔ ایک بجے کی اپائنٹمنٹ تھی اور اب دو بجنے کو ہیں۔''

اسی وقت عینی اندر سے ان کی طرف آتے ہوئے جھنجھلائے لہجے میں بولی۔ وہ اسکن کلر کی ٹاپ کے ساتھ شارٹس پہنے ہوئے تھی۔

''یہ ابھی تک ادھر ہی ہے؟'' ایمن کو اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں کوفت سی ہوئی۔

''ہائے!'' اس نے ایمن کی طرف دیکھ کر فضا میں دو انگلیاں سی ہلائیں۔

''ابھی تو ادھر ہی تھا۔ ایمن کو لے کر آیا ہے۔''

بنٹی نے اسے جواب دیا اور جواب سنتے ہی عینی کا ماتھا شکنوں سے اٹ گیا۔ بڑی بڑی سیاہ کھلے دریچوں سی آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہوگئیں لب دانتوں تلے بھینچ کر وہ کتنی دیر بے حس سی کھڑی رہی۔

''ہائے عینی ڈارلنگ! آر یو ریڈی۔'' اسی وقت گولڈی ہاتھ میں چین گھماتا اندر داخل ہوا۔ اسے کمرے میں عینی کے سوا اور کوئی شاید نظر ہی نہیں آیا تھا۔

''چلیں۔'' وہ اس کے بالکل مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''ہوں چلو۔'' عینی جیسے کسی گہرے کنوئیں سے بولی اور پلٹ گئی۔ گولڈی اس کے پیچھے جاتے ہوئے ان کی طرف ہاتھ ہلا گیا۔

''نیکسٹ ویک جو گرینڈ فنکشن ہے ہوٹل میں، اس سلسلے میں یہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آج ہی دوسرے شہروں سے گیسٹ آنا شروع ہو رہے ہیں۔ مجھے خود تین بجے پارلر جانا ہے اور واپس آ کر

شاپنگ پر۔ تمہیں اس لیے بلوایا تھا کہ تم چلو میرے ساتھ۔'' وہ اب بلی کے نرم روئی سے بالوں کو سہلا رہی تھی۔

''اب یہ بھی بتا دو، یہ گرینڈ فنکشن کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟'' وہ اپنے اندر کیسا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا ابھی وہ اندازہ بھی نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

مگر اس وقت بنٹی کے سامنے خود کو بیٹھے وہ دنیا کی احمق ترین لڑکی محسوس کر رہی تھی اور جس طرح عینی اور گولڈی اسے نظر انداز کر کے گئے تھے اور اب جس طرح بنٹی نے اسے محض دوسرا ہٹ کے لیے کسی جز وقتی، ملازمہ کی طرح اس کی خدمات ہائر کی تھیں، اسے اپنا آپ بہت کمتر سا محسوس ہو رہا تھا۔

''اونہوں بھئی۔ سرپرائز ہی رہنے دو۔'' وہ ذرا سا مسکائی اور پہلی بار اسے بنٹی پر اتنا شدید غصہ آیا اور نفرت سی محسوس ہوئی کہ وہ دوبارہ کبھی اس کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔

''عینی اور گولڈی کی انگیج منٹ بلکہ یوں سمجھو۔ شادی کے لیے ڈیٹ فکس ہو گی اور میری اور اسد کی انگیج منٹ شادی میری اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے کے بعد۔ گویا بھرپور رومانس لڑانے کے لیے ہم دونوں کے پاس ایک گولڈن پیریڈ ہے اف تم اسد کو دیکھو گی تو پاگل ہو جاؤ گی۔ کسی اسٹیٹ کا پرنس لگتا ہے۔ اتنا چارمنگ، اتنا ڈیشنگ، اسمارٹ اور پرنس تو وہ ہے ہی اتنی پراپرٹی۔ اتنا بزنس ہے ان کا کہ حساب کتاب نہ ہو سکے۔ اف میں کتنی لکی ہوں۔''

''اور عینی ...... عینی اور گولڈی کا رومانس۔ آج کل دیکھ ہی رہی ہو تم گولڈی کے بدلے ہوئے انداز۔ سارے کا سارا بدل ڈالتی ہے یہ محبت انسان کو۔ گولڈی سمجھو عینی کی محبت میں پاگل ہی ہو گیا ہے۔ پر یار ایک پتے کی بات بتاؤں تمہیں، اسے گرہ سے باندھ لینا۔''

وہ اپنے آگے پڑے دودھ کے پیالے پرے کرتے ہوئے بولی۔

''محبت کرو مگر آنکھیں کھول کر۔ سمجھیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ یہ وہی بنٹی تھی جو بھولے سے بھی نہیں ہنستی تھی مسکراہٹ تو دور کی بات تھی ہر وقت سڑیل سی، ماتھے پر شکنیں سجائے کتابوں میں گم رہا کرتی تھی اگرچہ ان کے ساتھ ہلے گلے میں بھرپور شرکت کرتی تھی۔ خوش بھی ہوتی تھی مگر نہ مسکراتی تھی نہ ہنستی تھی۔

اور اب ...... بے وجہ اس کا چہرہ، اس کے ہونٹ مسکرائے جا رہے تھے۔ شاید یہ بھی محبت کا اعجاز ہے۔ اس کے اپنے بھی رنگ ڈھنگ بدلے ہوئے تھے۔

''خالی چہرے سے، دل سے، خوب صورت جسم سے کبھی محبت نہ کرنا۔ پہلے سارا حساب کتاب، محبوب کا آگا پیچھا دیکھ بھال کر...... بھئی سچی بات ہے۔ محبت اپنی جگہ مگر انسانی خواہشات

بلکہ نسوانی خواہشات اپنی جگہ اور تمہیں تو پتا ہے میں شاپنگ کے بغیر رہ سکتی ہوں نہ اچھی گاڑی کے بغیر نہ سوئمنگ پول کے بغیر کسی چھوٹے سے گھر میں ...... میں آج کے دور کی لڑکی ہوں۔ یہ آسائشات میرے لیے جھیل کا پانی ہیں اور میں ان میں بہنے والی خوش رہنے والی مچھلی۔ اس لیے میں نے محبت تو کی ہے میری جان مگر خوب دیکھ بھال کر۔''

وہ رکی۔ ایمن سپاٹ چہرہ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اور گولڈی بھی تو میرا بھائی ہے۔ آج کل پاپا کا بزنس سمجھو ڈاؤن جا رہا ہے اور عینی کے پاپا، دبئی میں ان کی ایمپائر ہے۔ انہوں نے پاپا کو فل سپورٹ دینے کا وعدہ کیا ہے بلکہ وعدہ کیا کیا ہے۔ دینا بھی شروع کر دی ہے اور یہ شادی اس بزنس ڈیل کا ایک حصہ ہے۔ بلکہ اب تو ناگزیر حصہ کہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد پسند کرنے لگے ہیں اور سوری ایما! تم مائنڈ تو نہیں کرو گی۔''

وہ ایک بار پھر رک کر اسے دیکھنے لگی اور ایمن چاہتے ہوئے بھی نفی میں سر نہیں ہلا سکی۔ بس خاموش نظروں سے بنٹی کو دیکھتی رہی۔

''عینی بہت پوزیسیو ہے۔ وہ گولڈی کی ذرا سی توجہ اپنے علاوہ کہیں اور برداشت نہیں کر سکتی۔ اس میں بس یہی خراب عادت ہے ورنہ تو بڑے کھلے دل کی مالک ہے، بہت فرینڈلی اور بہت محبت کرنے والی پھر اسے کون سا ادھر ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ سال کے دس ماہ دبئی میں اپنے پاپا کی طرف سے ملنے والے شاندار محل میں اور دو ماہ یورپ یا پھر ادھر سو ہمیں صبر کرنے کی ضرورت۔ شادی کے بعد عینی کی پوزیٹو نیچر گولڈی کا ہیڈک ہو گا نہ کہ ہمارا۔ اسے تو ہم تینوں کی اتنی پکی دوستی میں بھی کوئی پوشیدہ سپاٹ دکھائی دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ اچھی خاصی خردماغ ہے اس لیے اتنے دن میں نے جان بوجھ کر تم سے کانٹیکٹ نہیں کیا اور گولڈی بھی تھوڑا تم سے پرے ہی رہا۔ پلیز تم مائنڈ تو نہیں کرو گی ورنہ تو تم جانتی ہو، تم ہمیں کتنی عزیز ہو اور کتنی پیاری۔ اصل میں پاپا کے بزنس کا پرابلم نہ ہوتا تو شاید ہم اتنا کانشس نہ ہوتے۔ تم سمجھ رہی ہو نا، اس لیے تھوڑا کیئرفل ہی رہنا۔ گولڈی سے ملنے اور ...... میرا مطلب ہے......''

''او کے بنٹی! میں چلتی ہوں۔ خالہ بی سے گھنٹہ بھر میں آنے کا کہہ کر آئی تھی۔ اب اتنا ٹائم ہو گیا ہے...... اور ہاں تمہیں مبارک ہو، محبت کا ملنا۔'' وہ اٹھتے اٹھتے بھی رک کر اس کا گال سہلاتے پرخلوص لہجے میں بولی۔

''تھینکس ڈیئر پر تم ابھی نہیں جا سکتیں۔ ابھی لنچ کریں گے پھر میرے ساتھ پارلر اور شاپنگ......'' وہ اس کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے بولی۔

''نہیں بنٹی! پھر آؤں گی تو سارا دن رہوں گی۔ آج مجھے خود ایک دو جگہ ضروری جانا ہے۔

اوکے بائے، ٹیک کیئر۔'' وہ آہستگی سے ہاتھ چھڑا کر باہر نکل آئی۔

''کیسے جاؤ گی؟ گاڑی ہے تمہارے پاس؟'' بنٹی ذرا سا اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

ایمن نے اپنے قدم تیز کر لیے، اگرچہ سینڈل کے ساتھ تیز چلنا یقیناً اسے بہت مشکل میں ڈال رہا تھا مگر اسے لگ رہا تھا یہ مشکل تو بہت چھوٹی اور معمولی ہے ورنہ اس کے آگے مشکلات کا ایک بحر بے کنار آنے والا ہے وہ اس بحر بے کنار کو کیسے عبور کرے گی اگر بھڑکتی کڑکتی دھوپ سے جلتی یہ سڑک تیز قدموں سے عبور نہ کر سکی تو؟ اس نے تیز تیز چلتے ہوئے خود سے سوال کیا تو جیسے چلنا آسان ہو گیا اور سڑک کے کنارے چلتے ہوئے کسی ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

وہ دوپہر اس کی زندگی کی لمبی ترین اور تلخ ترین دوپہر تھی۔

چلتے چلتے اس کے پیر جیسے من من کے ہو گئے تھے مگر کوئی ٹیکسی، رکشہ نظر نہیں آیا تھا۔ چلچلاتی تیز چمکتی چبھتی دھوپ اور وہ تارکول سے بنی لاوے کی طرح تپتی سڑک پر چل رہی تھی۔

جو اسے چالیس منٹ اس تکلیف دہ اذیت ناک پیدل چلنے کے بعد فواد نہ ملتا تو شاید وہ وہیں کہیں گر کر فوت ہو چکی ہوتی۔ اسے پہلی بار موت کا لفظ اتنا اچھا اور اتنا قریب لگا تھا کہ بے اختیار جی چاہا۔ کہیں سے لپک کر موت جھپٹ لے۔ کم سے کم اس اذیت ناک سفر سے تو نجات ملے گی، وہ شاید فٹ پاتھ پر بیٹھ ہی گئی تھی جب فواد نے اسے دیکھا اور کافی دور سے گاڑی بیک کر کے لایا۔

وہ اس کے اس پیدل مارچ کو بھی اس کی ایڈونچرس طبیعت کا حصہ سمجھا تھا اور وہ چپ رہی تھی۔ آج وہ ہر الزام ہنس کر سن رہی تھی اور سہہ رہی تھی۔ اس کے اندر واقعی اتنی قوت برداشت ہے، اسے آج سے پہلے بالکل اندازہ نہیں تھا۔

فواد کی دس باتوں کے جواب میں اس نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی تھی کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی مگر یہ جملہ بولتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اب بہت دفعہ یہ جھوٹ نہیں گھڑ سکے گی اسے یا تو سب کو سچ سچ بتا دینا چاہیے یا پھر...... یا پھر ان سب نام نہاد، ابن الوقت دوستوں سے جان چھڑا لے۔

پہلی بات پہ تو سب کو یقین آتے آتے نہ جانے کتنے دن لگ جائیں البتہ دوسری بات......اسے خاصی قابل قبول لگی۔

اس کے دوستوں میں قریب ترین اور عزیز گولڈی اور بنٹی تھے سو وہ خود ہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ باقی کے چھ سات کو خود سے نظر انداز کر دینا قطعاً مشکل نہیں تھا، صرف ان دونوں کے پیچھے

ہٹنے سے اس کے دل کو جو تکلیف ہوئی ہے۔ وہ باقیوں کو چھوڑ دینے سے نہیں ہو گی۔ اتنا اسے یقین تھا اسی فیصلے پر عمل درآمد کے طور پر اس نے گھر کے آگے گاڑی سے اترتے ہوئے فواد کو رسماً بھی اندر آنے کو نہیں کہا بلکہ بڑے دل سے ایک آخری الوداعی نظر اس پر ڈالتے ہوئے اسے خدا حافظ، کہہ ڈالا تھا وہ اگرچہ اس کے بدلے بدلے رویے پر کچھ حیران تھا مگر بولا کچھ نہیں۔ لاپروا انداز میں خدا حافظ کہہ کر ہاتھ ہلاتا وہاں سے گاڑی بھگا لے گیا۔

ایمن کو لگا اب یہ تھکن عمر بھر کے لیے اس کی ہمجولی بننے چلی ہے دوستوں کو خدا حافظ کہہ دینے کے بعد دکھوں اور تھکن سے ہی دوستی گانٹھنی تھی، وہ ذرا سا ہنسی اور اندر چلی آئی۔

خالہ بی نماز پڑھ رہی تھیں۔

وہ سینڈل ہاتھ میں پکڑے دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے اتنا تو یاد تھا کہ وہ چینج کرنے کے بعد جو بستر پر گری ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ یاد نہیں۔ خالہ بی شاید اسے جگانے آئی تھیں۔ کتنی بار؟ یہ بھی یاد نہیں۔ ہاں شام سات بجے کے قریب انہوں نے اسے تقریباً جھنجھوڑ ہی ڈالا تھا۔

''اٹھو، کیا مردوں سے شرط لگا کر سوئی ہو۔ غضب خدا کا۔ بھری دوپہر میں خدا جانے کہاں کہاں مٹرگشت کرتی کہاں سے تشریف لائیں اور اتنی زحمت بھی نہیں کہ بتا ہی دو کب تشریف لائیں۔ ایسی بھی کیا بے خوفی، دیدہ دلیری۔ کسی کو کچھ سمجھنا ہی نہیں۔ بات سنو ایمن بی بی لڑکی ہو تم۔ لڑکی ہوش کرو۔ کچھ کتنا نازک معاملہ ہوتا ہے لڑکی ذات کا۔ تمہیں کچھ خبر ہے اوئی اللہ سوچو تو میرا دماغ گھوم جائے۔ اکیلی جوان جہاں لڑکی یوں بن سنور کر بالکل تنہا، اکیلی نہ جانے کہاں کہاں ...... چلو پہلے گاڑی تھی۔ تھوڑا ڈھارس رہتی تھی کہ آنے جانے کی سردردی نہیں مگر اب تو...... تم چاہتی کیا ہو۔''

یا تو وہ اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر اس درجہ جھنجھلائی تھیں یا واقعی وہ اس کے لیے پریشان ہو گئی تھیں۔

اس نے ان کی کچھ باتیں سنیں کچھ نیند میں ڈوب گئیں۔

''اے ہے اٹھو، کچھ پی پلا تو نہیں آئیں ان موئے ہیجڑوں جیسے دوستوں سے اور کیا تحفہ مل سکتا ہے۔ دنیا بھر کی خرافات کے علاوہ۔'' وہ اس پر جھک کر اس کی ناک منہ سونگھتے ہوئے اس کے گال زور زور سے تھپکنے لگیں۔

''افوہ خالہ بی! کیا آفت آئی ہے۔ سونے بھی دیں۔'' اس نے کوفت میں کروٹ بدلی اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

''بہت ہو گیا۔ اٹھو۔ میں کوئی تمہاری ...'' ملازمہ کو انہوں نے بدقت لبوں میں روکا شاید

کوئی لحاظ باقی تھا۔ وہ سن سی پڑی رہی۔

''اچھا سنو میری بیٹی! اٹھو۔ میں نے کتنا تمہارا انتظار کیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب آکر تم کمرے میں سو بھی گئیں۔ اتنی دوپہر تھی۔ دل ہولتا رہا کہ معلوم نہیں کچھ کھایا پیا بھی ہوگا یا یونہی...... اچھا اٹھو تو سہی۔ تم سے ضروری بات بھی کرنا ہے۔'' انہوں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے بڑی مشکل سے لہجے کو نارمل کیا تھا۔ اس کے بال سلجھاتے ہوئے پیار سے اُسے سیدھا کرنے لگیں۔

''اب کیا نئی بات ہے۔ اب کیا کورٹ سے دوسرا سمن آگیا ہے؟'' وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی۔

''وہ بھی آجائے گا اگر تم اسی طرح ہاتھ پیر چھوڑ کر لمبی تان کر سوتی رہیں۔''

خالہ بی اطمینان سے بولیں۔ وہ منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر جمائی روکنے لگی۔

''پھر کیا حکم ہے میرے لیے؟''

''ذرا اٹھ کر نہا دھولو۔ کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہنو اور......''

''پلیز خالہ بی! اب میرے اندر کہیں جانے کی ہمت نہیں۔ سخت طبیعت ست ہو رہی ہے اور جو تھکن۔'' اسے زور سے آنے والی جمائی نے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

''میں کہاں بھیج رہی ہوں۔ میں تو کہہ رہی ہوں، طبیعت تازہ دم ہو جائے گی۔ ذرا اٹھ کر نہا لو اور......'' کوئی بات تھی جو وہ کہتے کہتے رک جاتی تھیں۔

''پلیز جو کہنا ہے۔ کہہ ڈالیے نا!'' اس نے تکیے دوسری طرف اٹھا کر پھر سے لیٹنا چاہا۔

''اے خبردار، اب نہیں لیٹنا کیا شام کے وقت نحوست پھیلا رکھی ہے اور بتاتی ہوں۔ تم ذرا اٹھ تو جاؤ۔ میں ذرا کچن میں دیکھ لوں۔ یہ آسیہ بی بی اتنی مشکلوں سے ہاتھ لگیں۔ مجھے تو یہ کمبخت نئے فیشنوں کے کھانے بھی نہیں پکانے آتے۔ دوسروں کی منتیں کرو۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کے بیڈ کی شیٹ درست کرنے لگیں۔

''اب کس لیے کھانا پکوا رہی ہیں؟'' وہ بادل نخواستہ اٹھ ہی گئی۔

''ہم خود بھی تو ہیں کھانے والے۔ ایسی کیا بات ہے۔ تم چلو ذرا نہا کر آؤ تو ایک نظر کچن میں ڈال لینا۔ میں ذرا مغرب کی نماز تو پڑھ لوں۔'' وہ اسے تاکید کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

''لو بھلا میں کچن میں جا کر کیا کروں گی۔ مجھے کون سا کچھ پکانا آتا ہے۔'' وہ خود ہی منہ میں بڑبڑائی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

نہا لینے سے واقعی اس کی طبیعت میں تازگی آگئی تھی اور بالوں میں برش کرتے ہوئے اسے احساس ہوا اس کے پیٹ میں تو چوہے کیا اس نسل کا چوپایہ ریس لگا رہا ہے صبح کا صرف ہلکا سا ناشتہ کیا تھا، اس نے خالہ بی کا نکالا ہوا پنک کاٹن کا شلوار دوپٹہ ہی پہنا تھا۔

''اب تو کچن کی طرف جانا ہی پڑے گا۔'' اس نے جلدی جلدی بالوں میں برش چلا کر اسے بیڈ پر اچھالا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

چائنیز رائس کے لیے چاول ابلے ہوئے تھے۔ سبزیاں کٹی پڑی تھیں دوسری ڈش بھی کچھ ادھوری تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا اوون سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے جھانکا تو سالم مرغ روسٹ تیار ہو رہا تھا اس کے منہ میں ایک دم سے پانی بھر آیا۔ تیسرے پتیلے میں کوفتے البتہ تیار تھے۔

''افوہ! اتنا کچھ پڑا ہے اور کھانے کے لیے کچھ بھی ریڈی نہیں۔'' اس نے جھنجھلا کر چاول پلیٹ میں نکال کر اس پر دو کوفتے اور تھوڑا سالن ڈالا فریج میں سلاد کی دو ڈشیں اور ٹرائفل کا پیالہ سجا پڑا تھا تھوڑی سلاد لے کر وہ باہر نکل آئی۔

''خالہ بی بھی حد کرتی ہیں۔ نظر بھی آرہا ہے، کیسے ٹائٹ حالات چل رہے ہیں پھر ایسی فضول خرچی۔ وہ بھی دو دو سلاد کی ڈشیں۔'' پہلی بار اسے فضول خرچی کا احساس ہوا تھا۔

خالہ بی عام دنوں کے مقابلے میں اچھے لباس اور تیار حالت میں بیٹھی تھیں۔ وہ ذرا سا ٹھٹھکی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''یہ کھانا ابھی تک تیار نہیں۔ ایک سالن بن گیا تھا۔ کافی تھا۔'' اس نے بیٹھ کر جتانے والے انداز میں کہا۔

''اپنے لیے تو ایک سالن بھی کافی نہیں ضرورت سے زیادہ ہی سمجھو مگر مہمان کے آگے تو اچھا نہیں لگتا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولیں جیسے وہ بہت باخبر ہو۔

''مہمان۔ کون مہمان؟'' وہ تیز تیز نوالہ نگلتے ہوئے بولی۔

''شہریار کو بلوایا ہے میں نے۔'' انہوں نے حسب عادت ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر رکھیں۔

''وہ کیوں بھلا؟'' وہ اگلا نوالہ لینا بھول گئی۔

''تاکہ یہ سلسلہ آگے بڑھایا جاسکے۔''

''کون سا سلسلہ؟'' اسے قطعاً سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''میں نے پتا کروا لیا ہے قریشی صاحب کے ذریعے۔ شام کو انہوں نے بلایا تھا مجھے۔ اللہ انہیں اس کا اجر دے۔ کس فرض شناسی اور تن دہی سے ساری معلومات کروائیں اور ذمہ داری بھی لی کہ ایک فیصد بھی غلط نہیں۔'' وہ چہرے سے ہی نہیں اندر کے حال سے بھی خاصی مطمئن خاصی پُرجوش نظر آرہی تھیں۔

''کیا غلط نہیں بھلا؟'' اسے خالہ بی کے اطمینان پر حیرت در حیرت ہو رہی تھی، وہ کتنے

اعتماد سے سب کہے جا رہی تھیں۔

"بہت اچھا، نیک، شریف، باکردار، سلجھا ہوا، پڑھا لکھا سب سے بڑھ کر برسرِ روزگار اپنے پیروں پر کھڑا اور روشن مستقبل کی مکمل ضمانت سمجھو۔" وہ جیسے اسے شیشے میں اتارنے لگیں۔

"کس کے روشن مستقبل کی ضمانت؟" وہ پھر سے چاول کھانے لگی بھوک کی شدت حیرت کے غلبے پر فتح یاب ہوئی تھی۔

"فی الحال تو اپنے بعد میں تمہارے۔"

"میرے کیوں؟"

"ارے احمق لڑکی! میں تو بھئی بغیر لگی لپٹی کے صاف بات کہوں گی اسے تمہارے لیے پسند کرلیا ہے اور دوپہر میں استخارہ بھی کیا۔ دل مطمئن ہوگیا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" اس کا نوالہ پھر حلق میں اٹک گیا۔

"استخارہ کسی بھی کام میں اللہ تعالیٰ کی صلاح لینا ویسے تو یہی لکھا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر دو نفل پڑھو اور استخارے کی دعا مانگ کر دل میں نیت کر کے قبلہ رو سو جاؤ جو خواب نظر آئے، اسے اشارہ سمجھو لیکن خواب ضروری نہیں۔ تین دن ایسا کرنے کے بعد جس طرف دل مائل ہو وہی رستہ اختیار کرو پر اب ایسی سختی میری بوڑھی جان یوں نہیں کرسکتی کہ وضو کرکے سوئے تو بس تھوڑی دیر کو رہتا ہے اور نیند آئے تو خواب آئیں، اشارے ملیں اپنی تو رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے اس لیے استخارے کے لیے دن میں جو اوقات نوافل کے لیے ہوتے ہیں ان میں دو نفل پڑھ کر نیت کرلو۔ اللہ خود ہی دل کو ایک خیال کی طرف جما دیتا ہے اور بھئی۔ میرا تو دل شہریار کی طرف سے آج ہی دو نفل پڑھنے کے بعد ایسا مطمئن ہوا ہے کہ کیا بتاؤں۔"

وہ اسے یوں خوش خوش بتا رہی تھیں جیسے کسی بہت بڑے بوجھ کے اترنے کی نوید سنا رہی ہوں اور شہریار، شہریار یوں کر رہی تھیں جیسے برسوں سے اسے جانتی ہوں۔ وہ اب آہستہ آہستہ نوالہ منہ میں ڈالے منہ چلا رہی تھی ذہن جیسے خالی ہوگیا تھا۔

"اس نے آٹھ بجے آنے کو کہا تھا اور آٹھ تو بج چکے۔ دیکھو کب آتا ہے۔ میرے خیال میں آسیہ آگئی ہے۔ کچن میں باقی کا کام نپٹانے، تم نے دیکھا۔"

"مجھے تو نظر نہیں آئی۔"

"کمبخت میرے نکلتے ہی جان چھڑا کر بھاگ لی۔ ابھی بلواتی ہوں۔" وہ لشتم پشتم اٹھ کر چل دیں۔

ان کے باہر جاتے ہی اس نے آدھی پلیٹ چاولوں کی ایسے ہی چھوڑ دی۔

"یہ خالہ بی کیا کرنے جا رہی ہیں۔ شہریار؟" اس کے اندر چھائے گہرے سناٹے میں آواز گونجی۔

"یونہی اٹھ کر اس کے ساتھ کیسے چل پڑوں نہ جان نہ پہچان۔ اس سے تو اچھا تھا۔ میں اسے گھر ہی نہ بلواتی۔ خالہ بی تو بس تیار ہی بیٹھی تھیں۔ یہ سب۔ کرنے کے لیے۔" وہ سوچنے لگی۔

اور اس کے علاوہ کون سا راستہ ہے؟ کورٹ کا...... اور کورٹ کے لیے اخراجات پھر میری ناتجربہ کاری۔ راشد انکل ایک گھاگ آدمی اور خالہ بی تو کبھی رکنے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔ ہاسٹل میں کیسے رہوں گی پھر وہاں کے اخراجات ادا کرنے کے لیے جاب کرنی پڑے گی۔ محض اولیول کی بنیاد پر کون مجھے جاب دے گا۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا سرمایہ کتنے دن چلے گا اور ہمدرد، خیر خواہ...... گولڈی، بنٹی، فواد، احمد، رویا انہوں نے تو ابھی سے آنکھیں پھیر لی ہیں جبکہ انہیں میری اصل حقیقت سن کر لگتا ہے میں ان سے جوک کر رہی ہوں اور میں بہت Funny ہوگئی ہوں آج کل؟"

"تو پھر کیا کروں......" اسے حقیقتاً آج دوپہر کے وقت اس کڑی دھوپ میں پیدل مارچ کے دوران احساس ہوا تھا کہ سر پر تنی اس قیامت سی دوپہر میں نہ تو چلنا آسان ہے نہ اسے ٹالنا اور وہ کیسے کرائسز میں گھر چکی ہے۔ اس کا احساس بھی اسے اس تکلیف دہ سفر کے دوران ہوا تھا اور اب خالہ بی کی باتیں اسے پھر سے اس خلا میں گھسیٹ لائی تھیں کہ اگر وہ ان کی باتوں بلکہ ان کے اکلوتے فرار کے رستے کی طرف دھیان نہیں لگاتی تو یقیناً تباہی اس کا مقدر ہے۔ خستہ ترین زندگی بانہیں پھیلائے اس کی جانب بڑھ رہی ہے تو ایسی خستگی کو کوئی زندگی کیسے کہہ سکتا ہے۔ اسے تباہی ہی تو کہا جائے گا!



"تو اس اکلوتی راہ فرار کے بارے میں سوچنے میں کیا حرج ہے؟" پہلی بار کسی نے اس کے اندر سرگوشی سی کی۔

"بڑی ہڈ حرام ہے آسیہ! پکڑ کر لائی ہوں کان سے اور جب تک مالک آنکھ کا اشارہ نہ کریں۔ یہ کمبخت کسی کو کیا سمجھتے ہیں۔" خالہ بی بولتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں۔ "آیا نہیں وہ ابھی تک۔" اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"خالہ بی! مجھے یہ سب صحیح نہیں لگ رہا۔" اس نے ان کی شکل دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا؟ کیا صحیح نہیں لگ رہا۔" ایک شکن سی ان کے ماتھے پر ابھری اور معدوم ہوگئی اور سر ہلاتے ہوئے وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"میری بچی! کیا صحیح نہیں جو تیرے دل میں ہے، کہہ ڈال مجھ سے نہیں کہے گی تو اور کس سے کہے گی۔" وہ پہلی بار اتنی محبت بھری اپنائیت سے اس سے بولی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہونے لگے۔

"خالہ بی، آپ، میں اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟" وہ آنکھیں جھپک کر آہستگی سے بولی۔

"کسی سے بھی جب اس طرح کا تعلق باندھتے ہیں تو اسی طرح اکثر صرف سامنے نظر آتے شخص اور اس کے متعلق معلومات پر بھروسا کرتے یہ جوا کھیلنا پڑتا ہے۔ اکثر تو جن کے ساتھ ہم سالوں سے رہ رہے ہوتے ہیں، جب اس بندھن میں بندھتے ہیں تو وہ یکسر مختلف انسان ثابت ہوتے ہیں، اسی لیے تو میری بیٹی، بیٹیوں کے معاملوں میں یہ رسک لازمی شامل ہو جاتا ہے۔ دیکھو ہفتہ دس دن پہلے تک تم اسے جانتی تک نہ تھیں۔ دیکھو یہ خدا کی مدد بھی تو ہوسکتی ہے کہ جو حالات تمہیں آگے پیش آنے تھے، ان کے مقابلے کے لیے تم بہت کمزور ہو تو اللہ نے تمہاری مضبوطی کے لیے یہ سہارا بھیج دیا ہو، قریشی صاحب بتا رہے تھے کردار کے لحاظ سے بہت صاف ستھرا، قابل اعتبار بلکہ سونا لڑکا ہے۔ سگریٹ، پان، جو کسی بھی قسم کی لت نہیں، کسی طرح تمہاری ذمے داری خوش اسلوبی سے ادا کر کے بری الذمہ ہوں۔ میری مجبوری کو سمجھو میری بیٹی۔"

آخر میں ان کے رقت آمیز ڈائیلاگ پر اس کا دل پسیجا۔

"مگر خالہ بی! یہ بھی تو ٹھیک نہیں۔"

"اب کیا ٹھیک نہیں؟" وہ جیسے بے زار ہو کر بولیں۔

"اسے ہمارے بارے میں، میرا مطلب ہے، میرے بارے میں سب پتا ہونا چاہیے۔"

"ارے کیا پتا ہونا چاہیے خدانخواستہ تم میں کیا عیب ہے؟"

وہ بھول پن سے بولیں تو ایمن کو ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ ان کا دھیان اس کے سب سے بڑے عیب کی طرف نہیں تھا۔

"خالی ہاتھ ہوں میں، بالکل کنگال، اس سے بڑا عیب کیا ہوگا مجھ میں۔" وہ تلخی سے بولی تو وہ لمحہ بھر کو چپ کر گئیں۔

"شادی ہو جائے تو بعد میں آرام سے بتا دینا پھر تو کوئی واویلا نہیں کر سکے گا۔" وہ کچھ دیر بعد بولیں۔

"خالہ بی! اس کے دل میں کیا ہے یہ بہتر نہیں کہ ابھی پتا چل جائے کہ ابھی اگر وہ واویلا کرنا چاہے ہم سے تعلق نہ جوڑنا چاہے تو آرام سے توڑ دے، بعد میں تو یہ سب بہت مشکل اور خاصا ناقابل برداشت ہوگا۔" خالہ بی نے اس کی بات سن کر دل میں تو سراہا مگر اس پر عمل کرنے سے ان کا اپنا جانا کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔

"دیکھ لو بی بی! میں تو یہ مناسب نہیں سمجھتی، آگے تمہاری اپنی مرضی۔ اچھا بھلا بنتا معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔" وہ ایک دم سے بے زار اور بے نیاز سی ہوگئی تھیں۔ اسی وقت ڈور بیل بجنے کی آواز سنائی دی۔

"میرا خیال ہے وہ آ گیا ہے اور میں کہہ رہی ہوں۔ ابھی آج ہی اس سے یہ بات کرنے کی ضرورت نہیں، دو ایک دن ٹھہر جاؤ، سوچ سمجھ کر جو کرنا ہوگا کر لینا۔" وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"ہاں تاکہ اس نے جو آس لگائی ہو۔ ان دو تین دنوں میں لگا بیٹھے تو خوامخواہ کی بدمزگی پیدا ہو۔" وہ ان کے جاتے ہی بڑبڑائی۔

وہ اسی طرح بیٹھی ٹی وی کے چینل بدلتی رہی۔ خالہ بی اسے آنے کا کہہ گئی تھیں۔

"ذرا تھوڑی لپ اسٹک، کچھ میک اپ کر کے آنا۔" وہ جاتے جاتے اسے تاکید کر گئیں جسے اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔

وہ اسے آتے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

خالہ بی کے اندازے بالکل درست تھے۔ وہ اس پر لٹو ہو چکا تھا۔

''بی بی! تجربہ ہے ان بوڑھی آنکھوں کو، سامنے والے کے نظروں کے زاویے کو خوب سمجھتی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں تمہیں دیکھتے ہی کیسی چمک ابھری تھی۔ وہ محض دو دن کی شناسائی کا نتیجہ نہیں۔''

''گویا ہم سالوں سے مل رہے ہیں اور میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں۔'' وہ بھی تنک کر بولی تھی۔

''ایسی چمک سالوں کی رفاقت کا نتیجہ نہیں ہوتی میری جھلی بٹی یہ تو دل کے معاملے ہوتے ہیں، جو دل لگائے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔'' وہ بڑے مدبرانہ انداز میں بولی تھیں تو ایمن کو ہنسی آ گئی تھی وہ جیسے اپنے دور کی بڑی سسی یا لیلیٰ رہ چکی ہوں۔

مگر اس لمحے اسے خالہ بی کا مشاہدہ بالکل درست معلوم ہوا، اس کی آنکھوں کی چمک اور روشن چہرے پر لو دیتی مسکراہٹ کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

خالہ بی شاید اس سے کافی بات چیت کر چکی تھیں، جو اس کے دیکھنے ہی نہیں بات کرنے کے انداز بھی خاصے بے تکلف سے تھے۔

''بس خالہ بی! ٹائم ہی نہیں ملتا صبح کو آفس جاتا ہوں اور شام کو کسی نہ کسی شارٹ کورس میں داخلہ لیے رکھتا ہوں ایک تو فضول کی فرصت سے بچ جاتا ہوں اور نکمے مشاغل سے بھی، دوسرے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے پھر اضافی ڈگری یا سرٹیفکیٹ جو آگے پروموشن میں بہت کام آتا ہے۔''

وہ بات تو خالہ بی سے کر رہا تھا مگر وقفے وقفے سے اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا، اگرچہ اس کی نظروں میں چھچھورا پن نہیں تھا مگر اس کے باوجود ایمن کو کوفت سی ہو رہی تھی اس کا واسطہ کبھی اس طرح کی سچویشن سے نہیں پڑا تھا۔

''اور آپ کیا کر رہی ہیں آج کل ایمن؟'' خالہ بی کھانا لگوانے چلی گئیں تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ بجھی ہوئی آواز میں بولی ''میرج وہ آؤٹ لو تو اس کے پلان میں کبھی شامل نہیں تھی مگر یہ سب کچھ تو بغیر کسی منصوبہ بندی کے ہوا جا رہا تھا۔ وہ ذہنی اور دلی طور پر اس کے لیے خود کو تیار نہیں کر پا رہی تھی۔

''میں رات کو تمہیں فون کرنے لگا پھر سوچا۔ شاید تمہیں اچھا نہ لگے۔'' وہ چند لمحوں بعد بولا تو اس نے دل میں کہا ''اچھا کیا جو نہیں کیا مجھے واقعی اچھا نہ لگتا۔''

''آپ کی خالہ بی بہت نائس ہیں۔'' وہ یونہی بات کرنے کو بولا تھا دونوں کے پاس کہنے کو بہت

کچھ تھا مگر سرا نہیں مل رہا تھا۔ خالہ بی نے دونوں کو اس کشمکش سے نجات دلائی۔ ''چلو بیٹا! کھانا کھا لو۔''

''کھانا تو بہت لذیذ ہے۔ ایمن نے بنایا ہے؟'' وہ کھانے کا پہلا لقمہ لیتے ہی بولا۔

''جی مجھے کھانا پکانا نہیں آتا بالکل بھی۔'' اس سے پہلے کہ خالہ بی کسی جھوٹ کا ٹانکا لگاتیں۔ اس نے فوراً کہہ ڈالا۔ شہریار کے لب مسکرا اٹھے جبکہ خالہ بی اسے گھور کر رہ گئیں۔ ''یہ لڑکی کچھ کر کے رہے گی۔'' وہ دل میں کلس کر رہ گئیں۔

پھر کھانا خاموشی ہی سے کھایا گیا۔

آسیہ خالہ بی اور شہریار کو قہوہ سرو کر کے کھانے کے برتن سمیٹنے لگی جبکہ وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔

خالہ بی کی مسلسل آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، وہ کیا کہہ رہی تھیں، یہ تو اسے سنائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کے دل کو پتا تھا۔ وہ کیا کچھ کہہ رہی ہوں گی۔

''آ جاؤ بیٹا! ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔ ذرا گپ شپ کر لو۔ میں ایک نظر اس آسیہ کو دیکھ آؤں۔ آدھے برتن یونہی نہ چھوڑ کر چل دے۔'' وہ قصداً اٹھ کر چلی گئی تھیں، شہریار اٹھ کر اس کے بالمقابل بڑے صوفے پر آ بیٹھا۔

اس کی نظریں لاؤنج کے خوب صورت وڈ ورک آرائشیں، قیمتی مینٹل پیس سے ہوتی ہوئی لمحہ بھر کو چھت پر لگے قیمتی فانوس پر ٹھہریں اور سامنے لاتعلق سی بیٹھی ایمن کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔

پنک کلر کا خوب صورت شیڈ اس کے چہرے کو بھی گلابی رنگ میں ڈبو رہا تھا۔

''میرا خیال ہے، میں نے پہلی بار تمہیں اس ڈریس میں دیکھا ہے بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے ستائشی انداز میں کہا تھا ایمن کا چہرہ بے تاثر ہی رہا، اس نے اسی طرح ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے رکھیں۔

''آپ سے خالہ بی نے کیا بات کی ہے۔'' ذرا سے توقف کے بعد اس نے ٹی وی آف کر دیا اور اپنا رخ شہریار کی طرف کرتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''کیا تمہیں نہیں پتا۔ انہوں نے کیا بات کی ہے۔'' اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''میں آپ کے منہ سے سننا پسند کروں گی۔'' وہ اس کے چہرے پر نظر جما کر بولی۔

''انہوں نے۔'' وہ رکا تھوڑا سا جھکا۔ ''ہماری شادی کی بات کی ہے کیا تمہیں علم نہیں۔''

''پھر آپ نے کیا جواب دیا؟'' وہ اس کا سوال نظرانداز کر کے بولی۔

''میں نے۔'' وہ پھر ٹھٹکا۔ ''مجھے تو کچھ خاص اعتراض نہیں ہوا اور میں نے کیا بھی

نہیں۔" اس نے ڈھکے چھپے انداز میں اپنی رضامندی کا بتایا۔

"تو گویا آپ ایگری ہیں۔" وہ کسی وکیل کی طرح اس سے جرح کر رہی تھی۔

"میں نے کہا تو ہے، مجھے اس پرپوزل میں کوئی خاص اعتراض والی بات نہیں لگی۔ اس لیے۔" وہ کچھ جھلا کر بولتے ہوئے چپ کر گیا۔

"کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"تمہارے بارے میں؟" اس نے ایک سوچتی ہوئی سی نظر اس پر ڈالی۔ "تم مجھے پہلی نظر میں اچھی لگی تھیں۔"

اس کی بات پر ایمن کا جی چاہا زور سے ہنس دے، شاید اس کے چہرے پر اس ہنسی کا عکس چمکا تھا جو شہریار کچھ کھسیا کر مسکرانے لگا۔

"کون سی پہلی نظر جب آپ گاڑی سے ٹکرائے تھے یا جب میں راشد انکل کے آفس میں گئی تھی اور آپ لفٹ کے پاس...... شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔" وہ جتانے والے انداز میں بولی تو شہریار گڑبڑا سا گیا۔

"دونوں ہی بار مگر بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔"

"پہلے ٹکراؤ پر آپ نے بات تو کی تھی پھر کون سی بات کے لیے ہمت نہیں کر سکے تھے۔" وہ ایک بار پھر اسی لہجے میں بولی۔

"کہ تم مجھے اچھی لگی ہو پہلی نظر میں ہی۔" شہریار نے دل کڑا کر کے اس کے ہر سوال کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایمن نے ذرا سا نفی میں سر ہلایا جیسے اس کے جواب سے متفق نہ ہو۔

"خیر جانے دیں۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔ میں کب اچھی لگنا شروع ہوئی جب راشد انکل کے آفس میں سیکنڈ ٹائم ہم ملے تھے اور کیوں اچھی لگی۔ اس کی وجہ بھی بتاتی ہوں ورنہ تو آپ روزانہ ہزاروں چلتی پھرتی لفٹ سے اترتی گاڑیاں دوڑاتی لڑکیاں دیکھتے ہوں گے۔" وہ تیز تیز بولتی چلی گئی۔

اس کی نظریں اب لاؤنج کی طرف تھیں جہاں سے خالہ بی کی آمد جلد ہی متوقع تھی، وہ ان کے آنے سے پہلے اپنی بات مکمل کر لینا چاہتی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں نہ تو میں دل پھینک ہوں نہ فلرٹی جو راہ چلتی ہر لڑکی پر عاشق ہوتا پھروں۔ تم میں کیا خصوصی پن تھا۔ یہ میں بھی نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں تم پر پڑنے والی پہلی نظر میرے اندر کہیں جم کر رہ گئی تھی، اور دوسری بار تمہیں راشد صاحب کے آفس میں دیکھنے کے بعد خیالات کی ٹریفک کا بہاؤ بہت بار ڈسٹرب ہوا تو میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس کی وجہ کیا ہے اور

تیسری بار ملنے پر میرے دل نے جس کیفیات کا اظہار کیا۔ اس نے بہت کچھ مجھ پر واضح کر دیا، جس کے نتیجے میں اس وقت میں یہاں بیٹھا ہوں۔"

اس نے بھی حتی الامکان اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی جبکہ ایمن کا چہرہ اسی طرح بے تاثر تھا۔

"خیر میں بھی اگر اس میں حصہ ڈال دوں یعنی وضاحت کہ میں آپ کو کیوں اچھی لگی؟" وہ اس کی بات ختم ہوتے ہی بولی۔

"آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں۔" وہ بتاتے بتاتے پھر سوال کر بیٹھی۔

"یہی کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو، تھوڑی بے پروا مگر اچھی نیچر کی مالک اور یہ کہ تمہارے پیرنٹس نہیں ہیں اور یہ کہ تمہاری اکلوتی رشتہ دار خالہ بی ہیں، یہ کہ خالہ بی جلد سے جلد اپنے گھر جانا چاہتی ہیں اس لیے۔" وہ شرارتاً لب دبا کر بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔

"خیر...... جتنا آپ میرے بارے میں جانتے ہیں، وہ شادی کے لیے ناکافی ہوتا ہے، آپ سمجھتے ہیں میں اپنے والدین کی چھوڑی ہوئی ڈھیروں ڈھیر دولت و جائیداد کی اکلوتی وارث ہوں نا؟" اس نے بولتے ہوئے اس کا جواب سننے کے لیے شہریار کی طرف دیکھا۔

وہ چپ رہا مگر ایمن کی بات پر اس کا دل دھڑکا تھا جیسے اندر چھپے کسی انجان شخص نے لمحہ بھر کو اس کے دل کو مٹھی میں لے لیا ہو۔

"تو ایسا ہے شہریار صاحب کہ میرے والدین میرے لیے کچھ نہیں چھوڑ کر گئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں۔ میں دیوالیہ ہو چکی ہوں بالکل خالی ہاتھ، خالی دامن...... اس ضروری نالج کے بعد میں آپ کو پریشرائز کروں گی کہ آپ بتائیں۔ میں آپ کو کیوں اچھی لگی تھی۔ آپ سوچنے کے لیے وقت لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں ابھی اٹھ کر جانا چاہیں تو میں روکوں گی نہیں۔ مجھے بس یہی کہنا تھا۔"

وہ بات ختم کر کے اٹھی اور باہر نکل گئی اندر داخل ہوتی خالہ بی نے سر جھکائے گپ چپ بیٹھے شہریار اور سرخ چہرہ لیے باہر جاتی ایمن کو دیکھا تو انہیں معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ ان کا جی چاہا پلٹ کر ایمن کو دو ہاتھ جڑ دیں۔

شہریار اٹھ کر ان کے پاس آیا اور جانے کے لیے اجازت مانگنے لگا اور وہ اسے "خدا حافظ" کہتے ہوئے یہ بھی نہیں پوچھ سکیں کہ بیٹا دوبارہ کب آؤ گے، انہیں اس کے انداز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔

☆☆☆

آج کا دن اس کی زندگی کا پہلا دن تھا کہ پہلی بار وہ زندگی سے ہاتھ ملا رہی تھی اور اس کے چودہ ہی نہیں سارے کے سارے طبق روشن ہو گئے تھے۔

اگرچہ گھر سے نکلتے ہوئے خالہ بی نے اسے ٹوکا تو کچھ سوچ کر وہ کمرے میں پلٹ گئی اور چھوٹی سی ٹاپ کی جگہ لیمن کلر کا کرتا بلو جینز کے ساتھ چینج کر آئی اور گلے میں اسٹول بھی ڈال لیا۔ اس کے باوجود پہلی بار پبلک کنوینس میں سفر کرتے ہوئے لگا وہ گھر سے کچھ بھی نہیں پہن کر نکلی یا اگر پہن کر نکلی بھی ہے تو کچھ ایسا کہ ہر دیکھنے والے کی نظروں کے لیے وہ کسی بہت ہی طاقت ور مقناطیس کا کام دے رہا ہے۔

اور پہلے ہی اسٹاپ پر کھڑے کھڑے اس نے تین پوائنٹ مس کر دیے۔

وہ کیا کرتی انتشار تھا لوگوں کا، کتنی دیر تو وہ دو قدم ہمت کر کے آگے بڑھتی اور پسینہ پسینہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتی۔

یہاں تک بھی خیریت گزری۔ اس نے دل چھوڑا نہ ہمت ہاری۔

مگر کھچا کھچ بھری اس چھوٹی سی وین میں مرغوں کی طرح کھڑے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے رستہ بنا کر گزرنا اس کی زندگی کا خوف ناک اور دہشت میں مبتلا کر دینے والا تجربہ تھا۔

اسے ایک بار پھر جھٹکا لگا۔

پیچھے سے اتر کر جانے والا وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس اچھا پڑھا لکھا نوجوان تھا اور جاتے جاتے خوامخواہ ٹھوکر کھا کر جس طرح وہ اس سے لپٹا تھا، مارے غصے کے اس کا جی چاہا تو وہ اس کا منہ تھپڑوں سے لال کر دے ...... اس نے نوجوان کو پرے دھکا دے کر انگریزی میں دو گالیاں بکی تھیں، سب لوگوں کے چہرے پر دبی دبی تمسخر آمیز مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی تھی اور باآواز سرگوشیوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ دن اس کی زندگی کا بہت ہی برا دن تھا۔

وہ تین جگہ انٹرویو کے لیے گئی اور تینوں جگہ کچھ اس طرح کا رسپانس تھا کہ اس رسپانس کو سوچ کر زندگی میں چوتھی جگہ انٹرویو کے لیے نہیں جا سکتی تھی۔

وہ خوش شکل خوش لباس خوش آواز شخص بے فکری سے کرسی پر جھولتا ہوا گویا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا تھا۔

اس کا سارا اعتماد سارا انداز بے نیازی، خود پر سارا بھروسہ اس کے ایک تمسخرانہ فقرے کے ساتھ، اس ٹھنڈے کمرے کی خنک فضا میں کہیں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

"مجھے خود پر کانفیڈنس ہے کہ ......" سوکھتے حلق کو تر کرتے ہوئے اس نے بے بس سا

ادھورا فقرہ بول کر اس تحلیل شدہ اعتماد کو واپس اپنی مٹھی میں کرنے کی ناکام کوشش کی۔

ریوالونگ چیئر کے جھولے میں جھولتے شخص کی مسکراہٹ اور بھی گہری اور بھی تمسخرانہ ہو گئی۔

"کانفیڈنس یو مین اٹ۔" چمکیلی آنکھوں میں کیسی تضحیک تھی، ایمن کو رونے سے نفرت تھی مگر اس لمحے اس کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ "آپ میری پرسنل سیکرٹری کے لیے اپلائی کرنے آئی ہیں اور اس کے لیے کوالیفیکیشن ہم نے کم سے کم ماسٹر ان انگلش یا اسی لیول کی کوئی ڈگری ڈیمانڈ کی ہے۔ میرے لیے انٹرسٹنگ بات تو یہ ہے کہ آپ کو ان ڈاکومنٹس کے ساتھ ...... اندر کیوں آنے دیا گویا کہ میرا اسٹاف بھی آپ کی طرح کورچشم ہو چکا ہے۔ آپ کا شکریہ آپ نے میرے اسٹاف کے اتنے بڑے اور سیریس مرض کا پتا لگانے میں میری ہیلپ کی، ورنہ میں تو ان پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔"

اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتا۔ وہ آنکھوں میں اترے پانیوں کو جھپکاتی وہاں سے بھاگ آئی۔

"ویری بیڈ کیا اسٹڈیز میں دل نہیں لگتا یا گھر والوں کی طرف سے جاب کے لیے پریشر ہے۔" دوسرے صاحب اچھے بھلے خفا ہو گئے کہ وہ اتنی کم عمری میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر جاب کے لیے کیوں نکل آئی ہے۔

"سر! ظاہر ہے مجبوری ہی انسان کو وہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے، جو شاید وہ خوشی سے کرنے پر تیار نہ ہو۔" اس نے ڈوبتے ابھرتے اعتماد کو تنکے کی طرح مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کی۔

"سوری بے بی! میں کہہ چکا ہوں میرے نزدیک ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، جبکہ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی جنریشن کے پاس کھیلنے کے لیے سب سے اہم ٹوائے وقت ہی ہے، جسے آپ اس طرح کے لاحاصل ایڈونچرز موبائل ٹونز سیٹ کرنے فضول اور گھٹیا قسم کے ایس ایم ایس سینڈ کرنے کمپیوٹر پر گھنٹوں بیٹھ کر چیٹنگ کرنے یا فون پر گپیں لگانے کے لیے ٹائم سے بڑا کھلونا کوئی نہیں۔ غور و خوض کرنے فکر یا تدبر کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں، زبان اور کان فرصت پائیں تو کچھ تفکر کریں۔ اگر فرصت ملے تو خود کو دیکھ لیجیے گا ہمیں ایک میچور ذمہ دار اور کم سے کم گریجویٹ لیول کے ایمپلائی کی ضرورت ہے۔ تھینک یو۔ یو مے گو۔"

اس سنجیدہ تھوڑے غصیلے تیور والے شخص کے ریمارکس نے اسے جیسے تنکے سے بھی حقیر کر ڈالا اور وہ اسی بے وزنی کی حالت میں گرتی پڑتی باہر نکل آئی۔

اگرچہ گھر تک جاتے جاتے اس کے بدن کا جوڑ جوڑ جیسے ہل گیا تھا۔ کچھ تھکاوٹ، کچھ

کوفت اور کچھ اس فضول خجل خواری کا اور سب سے بڑھ کر اس کے اندر ایک تکلیف دہ احساس رہ رہ کر سر اٹھا رہا تھا۔ کچھ کھو دینے کا احساس!

کیا خود پر، اپنی ذات پر اسے جو بے تحاشا اعتماد اور بھروسا تھا، اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا، اس نے اس سفر لا حاصل میں وہ اعتماد بھروسا کھو دیا ہے۔

صبح جو ایمن گھر سے نکل کر بڑے جوش اور جذبے امنگ اور عزم کے ساتھ گئی تھی، اب جو ایمن گرتی پڑتی گھر جا رہی ہے، وہ صبح والی ایمن سے بالکل مختلف بالکل اداس تھی۔

یہ فرق کیا تھا وہ اس چبھتی دھوپ اور بدن کو جلاتی حدت میں سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔

خالہ بی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی پھپک پھپک کر رو رہی تھیں۔

اس کے قدم دروازے پر ہی تھم سے گئے۔

ساری تھکن، ساری ذلت جیسے ان دو قدموں میں اتر آئی کہ اس سے ایک قدم بھی آگے نہ اٹھایا گیا۔

”کیا ہوا خالہ بی! کیوں ایسے رو رہی ہیں؟“

”خدا نے کیا سب آزمائشیں ہم غریبوں کے لیے لکھ رکھی ہیں۔“ بہتے آنسو اور بندھی ہوئی ہچکی کے بیچ وہ بمشکل بولیں ایمن ان کے پاس ہی صوفے پر ڈھے گئی۔

”اب کیا ہو گیا۔ کیا کوئی نیا نوٹس آ گیا ہے؟“ وہ بیزار سے تھکے ہوئے انداز میں نڈھال سی بولی۔

”میرے داماد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ غریب رکشہ چلاتا تھا۔ گاڑی تو تباہ ہوئی کہ کچھ نہیں بچا۔ اس کی اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ ہائے میری بچی اکیلی کیسے کرے گی سب، کیسے خود کو سنبھالے گی۔ آئے میں کیا کروں۔ کہاں سے پنکھ لگاؤں کہ اڑ کر اس کے پاس جا پہنچوں۔“ خالہ نے سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے اپنے غم کی شدت میں کچھ اور ڈوب کر کہا۔

”تو خالہ بی! آپ چلی جائیں نا ابھی روانہ ہوں گی تو کل شام تک......“

کافی دیر ان کے مسلسل رونے پر اس کے دماغ نے مشورہ دیا کہ اسے ان کو کچھ تو دلاسا دینا چاہیے۔

خالہ بی نے کچھ ایسی تیکھی روئی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ بات بھی پوری نہ کر سکی۔

”تو پھر تم بھی چلو میرے ساتھ۔ بس ہو گیا فیصلہ۔“ وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ ان کے فیصلے پر گھبرا گئی۔

”خالہ بی! میں...... میں کیوں جاؤں؟“ وہ ہکلا کر بولی۔

”کیوں ہم لوگ تمہارے کچھ نہیں لگتے۔ سچ ہے ساری عمر تمہارے ماں باپ کے دیے ہوئے ٹکڑوں پر پلتے رہے۔ کم حیثیت رشتہ داروں کو کون اپناتا ہے بھلا؟“ انہوں نے پھر خود ترسی کا وہی پرانا جملہ دہرایا۔

”یہ بات نہیں۔“ وہ فوراً بولی۔

”تم ہیں چاہے رشتہ دار سمجھو یا ملازم، تمہیں میرے ساتھ ہی جانا ہوگا۔“

”اچھی زبردستی ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”اب یہ زبردستی لگے تمہیں یا مجبوری یا جو بھی سمجھو۔“ ویسے خالہ بی کہتی رہتی تھیں، انہیں اونچا سنائی دیتا ہے اور اب اس کی معمولی سی بڑبڑاہٹ بھی سن لی تھی۔

☆☆☆

”ہاہ ہاہ ہماری قسمت دیکھو۔ اللہ نے ہماری قسمت میں کیا لکھ رکھا ہے۔“ رضوان نے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے آگے پڑے کھانے کی ٹرے کو دیکھا۔ شہریار جو میز پر ٹانگیں پھیلائے سیل ہاتھ میں لیے مسلسل کچھ سوچ میں گم ٹانگیں ہلائے جا رہا تھا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم کیا دن میں سپنے دیکھنے لگے ہو جو یوں میرے بولنے پر آنکھیں پٹپٹا کر دیکھ رہے ہو، جیسے ابھی نیند سے جاگے ہو۔“ رضوان اس کے یوں چونکنے پر چڑ کر بولا۔

”میں تم جیسا بے وقوف نہیں، جو نیند میں سپنے سجاؤں اور آنکھ کھلتے ہی چونک جاؤں۔“ وہ ذرا شوخی سے بولا۔

”کیا بات ہے، کہیں عشق وشق تو نہیں ہو گیا جو مجنوں کی طرح یونہی بات بے بات مسکرائے جا رہے ہو۔“ رضوان اس کی مسکراہٹ پر جھلا کر بولا۔

”شکل سے تمہیں اتنا بے وقوف نظر آتا ہوں جو یہ احمقوں کی بیماری لگا بیٹھوں۔ ہم تو بھئی اکیسویں صدی کی پیداوار ہیں، سیدھے سیدھے پلاننگ اور منصوبہ بندی کے مطابق پوائنٹ ٹو پوائنٹ اور فیگر ٹو فیگر چلنے والے۔“ شہریار نے گہری سانس لے کر ٹانگیں ٹیبل سے نیچے کیں۔

”اچھا ذرا میں بھی تو سنوں آنجناب کی منصوبہ بندی۔“ اس نے بیزاری سے آگے پڑی ٹرے پرے دھکیل کر دلچسپی سے پوچھا۔

”تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“ شہریار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”تم کیوں نہیں کھا رہے؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”یونہی۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”خیر میں یونہی نہیں کھا رہا۔“

رضوان نے ''اوں'' کر کے ٹرے اور بھی میز کے کنارے پر پہنچا دی۔

''تو تمہیں کیا ضرورت ہے ادھر میس سے کھانے کی، باہر سے کھا لیتے۔'' شہریار نے لاپرواہی سے کہا وہ خود بھی یوں بیٹھا تھا جیسے کھانا کھا کر ہی آیا ہو۔

''باہر سے کھا کھا کر تو یہ حال ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر نے کہا ہے اب مزید باہر کے تیز مرچ مسالے والے چٹ پٹے کھانے کھائے تو جلد ہی لوگ تمہارے قل کے کھانے کھا رہے ہوں گے، اسی لیے اس بار فضلی صاحب کو روم رینٹ کے ساتھ میس الاؤنس بھی دیا اور نتیجہ دیکھو۔''

''تو چلے جانا تھا اپنی آنٹی کے بلوم کاٹیج میں۔'' شہریار نے طنز کیا۔

''جانے دو یار! وہ بھی سب بھری جیب کے مزے ہیں، مہینے کے آخری دن ہیں، آج کل تو میں آنٹی کے کاٹیج کے دربان کو خوش نہیں کرسکتا کجا اس کی کسی کلی یا پھول کو۔'' وہ بیزار سے لہجے میں بولا۔ ''اوپر سے یہ معدہ السر جیسا پھوڑا پالنے چلا ہے۔''

''دیکھا یہ ہوتا ہے نتیجہ بغیر پلاننگ کے چلنے کا، جتنا تیز بھاگو گے اتنی جلدی تھکو گے اور اتنی زور سے گرو گے پھر باقی کی عمر خالی جیب خالی پیٹ بس ان چوٹوں کے زخموں کو ہی سہلاتے رہو گے۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی آخر تمہارے ذہن میں کیا پلاننگ ہیں یار کچھ تو بتاؤ۔ کبھی کسی غریب کا بھلا ہی ہو جائے گا۔''

''معلوم ہے نا تمہیں مجھے غربت سے نہیں، غریب سے نفرت ہے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''یار! بے چارے غریب کا کیا قصور جو پیدا ہی غربت میں ہوا ہو۔''

''پیدا وہ اپنی مرضی سے نہیں ہوا مگر غریب رہنا اس کا مقدر تو نہیں۔ غریب یا امیر ہونا میرے یقین کے مطابق انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔''

اس کی یہ انوکھی بات سن کر رضوان ایک پل کو بھونچکا سا رہ گیا۔

''یار! پہلے ہی میرا خالی معدہ آؤں آؤں، کر رہا ہے اوپر سے تم نے یہ ثقیل باتیں شروع کردی ہیں میں نے تو تجھ سے سیدھا سا سوال پوچھا تھا کہ تیرے ذہن میں کیا پلان ہے اس کسمپرسی کی حالت سے نکلنے کا کچھ نسخہ یا اصول ہو؟ مجھے بھی بتاؤ، یہ مہینے کے آخری دن تنگی اور غربت کے گزرتے ہیں۔ ان سے نجات مل سکے اور تم نہ جانے کدھر کدھر کی مشکل باتیں ہانکنے لگے ہو۔'' رضوان چڑے ہوئے لہجے میں کہتا چلا گیا۔

''یار! تم صرف ایک مثال سے سمجھ جاؤ۔ تمہاری اور میری ذہنیت میں یہ فرق ہے کہ تم صرف سونے کا انڈا دینے والی مرغی کا ایک انڈا لے کر خوش ہو جاتے ہو جبکہ میں...... میں وہ مرغی

حاصل کرنا چاہتا ہوں ویری سمپل۔''

''یعنی وہ سپنوں کی رانی کب آئے گی تو...... وہ یہی تھی سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہے نا۔''

رضوان نے فوراً کہا تو شہریار پھر سے ٹانگیں ٹیبل پر رکھ کر جھلانے لگا، جواب نہیں دیا اس وقت ٹیبل پر پڑا اس کا سیل بج اٹھا اس نے فون اٹھا کر نمبر دیکھا۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے وہ کان سے سیل لگا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

''اس نے ''ہیلو'' کے بعد اپنی ساری حسیات دوسری طرف بات کرنے والے شخص کی گفتگو کی طرف لگا دی تھیں۔

پھر یکایک اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے شروع ہوگئے شکن زدہ بل دار پیشانی فراخ ہوگئی۔

''تھینک یو تھینکس یار۔ شکریہ خدا حافظ۔ بائے۔'' وہ جذباتی انداز میں بار بار متشکرانہ انداز میں بولتا ہوا ست رنگا چہرہ لیے سیل آف کر کے باہر کی طرف بڑھا۔

''یار! یاروں سے ایسی بھی کیا پردہ داری کچھ تو کہو۔ کون سا عقدہ حل ہوا ہے یا خزانے کا نقشہ ہاتھ لگا ہے۔ بتا کر تو جاؤ۔'' رضوان سے صبر نہ ہوسکا تو اس کے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھے چلا گیا۔

''اگر بتاؤں گا سمجھو سارے عقدے حل ہوگئے، بھید کھل گئے اور سارے منتر چھو ہوگئے میری جان! آ کر بتاؤں گا اس وقت مجھے جلدی ہے۔ بے یقینی سی بے یقینی ہے، پہلے خود کو یقین تو دلاؤں پھر تمہیں آ کر بتاؤں۔''

''لگتا ہے اس کے دن پھرنے والے ہیں پارس ہاتھ لگ گیا ہے۔ اپنی اپنی قسمت۔'' وہ خود کو اور قسمت کو کوستے ہوئے کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''ہمیں تم سے پیار کتنا (یہ کیسے بتائیں) ہم نے جانتے۔''

''تم کیا ہو میرے دل پہ ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھو اس کی دھڑکنیں تمہیں بتائیں گی کہ تم میری کیا ہو کون ہو؟''

''تم ساتویں آسمان سے اتری وہ حور ہو، جس کا محض ساتھ ہی مجھے مغرور کر دینے کے لیے کافی ہے۔''

''تم میری محبت کا بے مول سرمایہ ہو۔''

''گلابی شام میں اتری خوشی کی پہلی امنگ ہو۔''

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ فواد، بنٹی، گولڈی، سنی کے ایس ایم ایس پڑھتی جا رہی تھی اور

انہیں ڈیلیٹ کرتی جا رہی تھی۔

یہ وہ تمام محبت بھرے پیغامات تھے جو انہوں نے اس کے پیرنٹس کے انتقال کے بعد شاید اس کی دل جوئی کے لیے بھیجے تھے یا اسے مغرور وخود پسند بنانے کے لیے اور ان پیغامات کا ہی اثر تھا کہ وہ اتنے بڑے سانحے کو یوں پی گئی، جیسے کوئی شربت کا گلاس پیتے پیتے ایک بے ذائقہ کڑوا گھونٹ حلق میں انڈیل لے۔

خالہ بی اس کے کمرے کے کھلے دروازے سے کاریڈور اور لاؤنج کے بیچ تسبیح ہاتھ میں لیے پیر جلی بلی کی طرح پھر رہی تھیں، ان کے ہاتھ میں لٹکی تسبیح دانے تو مسلسل گر رہے تھے مگر لب کسی ورد کو دہرانے میں مصروف نہیں تھے بلکہ ذرا ذرا سی دیر بعد وہ کوئی نہ کوئی جلتا کڑھتا فقرہ لبوں میں بڑبڑاتیں اور تیزی سے پھر گردش کرنے لگتیں۔

وہ ٹہل ٹہل کر تھک گئیں تو پیچھے پڑے کاؤچ پر ڈھیر ہوگئیں۔

اب وہ شاید بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔

''آخر میں ان کا امتحان کیوں لے رہی ہوں، خود فی الحال اپنا سامان باندھ کر کسی دوست کی انیکسی میں شفٹ ہو جاتی ہوں، اس دوران کوئی نہ کوئی مناسب ٹھکانہ مل ہی جائے گا انہیں روانہ کرتی ہوں۔'' وہ سیل کو مٹھی میں دبائے ان کو ایسی قابل رحم حالت میں روتے دیکھ کر دل ہی دل میں فیصلہ کرنے لگی۔

''کس دوست کی طرف بھلا؟ دل نے کسی تماشا دیکھنے والے کی طرح پوچھا تھا۔''

''سویٹی کی طرف۔ شی از ویری نائس اینڈ لونگ اور میرے لیے تو ہمیشہ وہ بہت اسپیشل فیلنگز کا اظہار کرتی ہے۔ پھر اس کی ماما، میری ماما کی بہت اچھی دوست تھیں اور انکل جمیل تو بہت سوفٹ ہیں۔ میں ایک فون کر کے کہوں گی تو وہ گاڑی بھیج دیں گے۔'' اس وقت فیصلہ کیا اور سویٹی کا نمبر ملا ڈالا۔

''سویٹی تو ذرا شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی ہے۔ تم کیسی ہو بیٹا؟'' اس کی ماما محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

''فائن آنٹی...... وہ آنٹی! آپ سے ایک بات کہنا تھی۔'' اس نے بلاتمہید بات کرنے کا ارادہ کیا۔

''ہاں ہاں کہو اور کتنے دنوں سے تم نے چکر نہیں لگایا۔''

''وہ آنٹی! وہ میری آنٹ خالہ بی جا رہی ہیں۔ اپنے گھر تو میں...... کچھ دنوں کے لیے اگر اپنا سامان لے کر آپ کی انیکسی میں شفٹ ہو جاؤں...... بے انگ گیسٹ کے طور پر...... تو؟''

دوسری طرف خاموشی سی چھا گئی تھی۔

''پے انگ گیسٹ کیوں ایما! تم بھی سویٹی کی طرح ہو۔ ہماری طرف آؤ اگر تو یونہی چلی آؤ۔ سویٹی کے ساتھ والا بیڈروم تمہارے لیے سیٹ کروا دیتی ہوں۔''

ان کی بات پر اس کا دل خوشی سے بلیوں پر اچھل پڑا۔

''پر ایک پرابلم ہے بیٹا!'' ان کے اگلے جملے نے اس کے اچھلتے دل کو سنبھالا۔

''تم کچھ دن ویٹ کرو۔ آئی مین ایک ڈیڑھ ماہ۔ اصل میں جمیل کی بھتیجی کی شادی ہے۔ ان کے گلاسکو والے بھائی کی بیٹی کی تو ہم پرسوں مارننگ فلائٹ سے جا رہے ہیں اسی لیے تو سویٹی شاپنگ کے لیے گئی ہوئی ہے۔ تم تھوڑے دن اپنی آنٹ کو ٹھہراؤ۔ او کے ٹیک کیئر بیٹا! آئی لو یو سوچ بائے۔''

پھر اس نے ایک ایک کر کے اپنی ساری فرینڈ کو فون کر لیے، اس کے انیکسی میں رہنے کی بات سن کر سب ہی لمحہ بھر کو چپ ہوتے پھر کوئی نہ کوئی خوب صورت بہانہ گھڑ دیتے کہ وہ اصرار بھی نہ کر پاتی۔

اس کے جسم سے جان سی نکلنے لگی تھی پھر بھی آخری کوشش کے طور پر اس نے گولڈی اور بنٹی کے باری باری نمبر ملائے دونوں میں سے کسی نے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔

پانچویں کوشش کے بعد اس نے تھک کر سیل پرے پھینک دیا اس کے دماغ میں فوری طور پر کوئی فوری حل اس مسئلے کا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خالہ بی کے ساتھ وہ جانا نہیں......

اسی وقت اس کے سیل پر سویٹ گرل لوا زناٹ اے فن کی رنگ ٹون بجنے لگی۔

اس نے جھپٹ کر سیل اٹھایا۔

اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا اس نے لمحہ بھر ذہن پر زور ڈالنے کے بعد کال ریسیو کر لی۔

''سوری میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔'' کچھ شناسا سا، کچھ اجنبی آواز و لہجہ تھا وہ متذبذب سی کچھ بول نہ سکی۔

''لگتا ہے پہچانا نہیں۔ میں شہریار بات کر رہا ہوں۔'' اس کی خاموشی پر ہی اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''میں نے پہچان لیا، کہیے کیسے ہیں آپ؟'' اگرچہ اس وقت اس کا موڈ کسی سے بات کرنے کا نہیں تھا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے لہجے میں نرمی سی اتر آئی تھی۔

''بالکل ٹھیک۔ تم سناؤ۔ کیا ہو رہا تھا؟'' وہ اس کی نرمی کی خوشبو سونگھ کر بے تکلفانہ لہجے میں بولا۔

''کچھ خاص نہیں بلکہ سچ پوچھیں تو بوریت......'' اس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے

بوریت کا واضح اظہار بھی کرڈالا۔

''تو کہیں باہر چلیں۔آجاؤں پک کرنے۔''

وہ فوراً ہی آفر کرتے ہوئے بولا تو وہ اس کے انداز سے کچھ بوجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''اچھا تھا آپ گھر چلے آتے خالہ بی آپ کو یاد کررہی تھیں۔''

اس نے ان ڈائریکٹ انداز میں اس کا ارادہ جاننے کی کوشش کی۔

''ہاں وہ تو مجھے ان سے ملنے آنا ہی ہے۔ بلکہ فون بھی میں نے اسی لیے کیا تھا کہ میں ان سے ملنے آرہا ہوں۔ پہلے ہم کہیں باہر چل کر تھوڑا آؤٹنگ کرتے ہیں پھر خالہ بی سے واپسی پر ملاقات ہو جاتی۔''

وہ یوں بات کررہا تھا جیسے ان کے روزانہ معمولات میں شامل ہو کہ اس طرح آؤٹنگ پر نکلنا اس لیے بے تکلف انداز سے اچھے تو نہیں لگ رہے تھے مگر دل سے جیسے کوئی بوجھ سا ہٹتا جارہا تھا ابھی جو وہ یہاں بیٹھی ہر چیز سے ہر شخص سے مایوس ہو چلی تھی، اس مایوسی کے عالم میں جیسے کسی تنکے کا سہارا ملنے کی امید ہو چلی تھی۔

''نہیں، آپ یوں کریں گھر ہی آجائیں۔ پہلے خالہ بی سے مل لیں پھر اگر موڈ ہوا تو باہر چلے جائیں گے۔''اس نے ذرا سا سوچ کر کہہ ڈالا۔

''اوکے۔ میں آرہا ہوں۔آدھے گھنٹے میں۔ٹیک کیئر۔''اس نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے کہا اور کال ڈراپ ہوگئی۔

وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور خالہ بی کو یہ خوشخبری سنانے چل دی کہ ابھی اسے تیار بھی ہونا تھا۔لوازنات اے فن کی گنگناہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

☆☆☆

وہ مسلسل اس کی نظروں کے حصار میں تھی اور پہلی بار سے پتا چلا تھا۔گہری نظر کا حصار کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ بے نیاز یا لاپروا نظر آنے کی کوشش کرنے کے باوجود ایسا کر نہیں پارہی تھی۔

اور خالہ بی کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔انہوں نے قریشی صاحب کے ملازم سے ریڈی میڈ کھانا منگوایا تھا اور ایک ایک چیز خود اس کی پلیٹ میں ڈالی تھی بیٹا بیٹا کہہ کر ان کا منہ سوکھا جارہا تھا۔ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی پلیٹ خالی ہونے کا انتظار کیے بغیر معاملہ آگے بڑھانے کے لیے بات چیت شروع کردیں۔

''کیا بات چیت آگے بڑھانے کے لیے نظروں سے وار کرنا بہت ضروری ہے اور شاید اسے معلوم ہے کہ نظروں کا وار کیسا کاری ہوتا ہے۔''وہ سرخ چہرہ لیے گھبرا کر اس کے سامنے سے

اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اصل میں میری مجبوری نہ ہوتی جانے کی، چلو یوں بھی میں رکی تو ہوئی تھی چند ہفتے، مہینے بھر اور رک جاتی۔ آخر کو اس کے ماں باپ کو زبان دی تھی۔اب میرے داماد کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں نہ گھبراتی۔ پر ایسا بھی نہیں کہ بچی کو یونہی محض تمہارے کہنے پر میں حوالے کردوں۔تمہاری بہن ہے، تم نے بتایا تھا جا کر اس کو لے آؤ یا فون پر بات کروادو تو میرے دل کی تسلی ہو جائے گی۔'' وہ باہر آکر بھی آگے نہیں جاسکی تھی وہیں دروازے کے پاس رک کر ان کی باتیں سننے لگی تھی۔

''آپا کے ساتھ میرا کوئی رابطہ نہیں سالوں سے، میں دوران تعلیم میں سب سے ناتا توڑ آیا تھا ماں باپ تھے نہیں اور بہن بہنوئی یوں سمجھیں۔ان سے بنتی نہیں تھی اس لیے میں خود ہی سب چھوڑ چھاڑ آیا اور دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔اب تو جو ہوں میں ہی کہوں، ہاں اگر آپ کو کسی شیورٹی آئی مین گارنٹی کی ضرورت ہے تو اپنی کمپنی کے باس کو لا سکتا ہوں، وہ میرے کریکٹر اور جاب کی گارنٹی تو دے ہی سکتے ہیں۔ جو آپ کہیں۔'' اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر واضح الفاظ میں کہا خالہ بی کچھ سوچنے لگیں۔

''چلو ان کو کل بلوالینا پر ایسا ہے بیٹا!'' وہ کہتے کہتے رکیں۔

''جی میں لے آؤں گا۔'' وہ تابع داری سے سر جھکا کر بولا اس کی نیچی نظریں، ڈور فریم سے آگے بائیں کونے سے نظر آتے ایمن کے پاؤں پر تھیں۔

''میں جلد ہی میرا مطلب ہے۔اس ہفتے نکاح رخصتی کرنا چاہ رہی ہوں۔'' وہ اصل مدعا کی طرف آہی گئیں۔

''جی ہفتہ بھر میں۔'' وہ ذرا ہکلا کر بولا۔

''وہی مجبوری جو تمہیں بتا چکی ہوں۔'' انہوں نے فوراً کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔

''چلو باقی تو سب طے ہی سمجھو۔جیسا تم کہو، گھر کا کیا کرو گے۔'' وہ لمحہ بھر بعد بولا۔

''گھر کا؟'' وہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔

''گھر تو تمہیں لینا ہی پڑے گا اب ظاہر ہے بیوی کو ہاسٹل میں تو نہیں رکھو گے نا۔'' وہ ذرا واضح انداز میں بولیں اس وقت باہر فون کی بیل بجنے لگی تو ایمن کو مجبوراً فون سننے جانا پڑا۔

''وہ تو آنٹی جی! میں کرلوں گا مگر اس میں ٹائم لگے گا فوری طور پر تو میں بندوبست نہیں کرسکتا۔ مہینہ دو یا جب تک انتظام نہیں ہو جاتا اگر میں ادھر ہی ایمن کے ساتھ...... ویسے تو میں آج ہی گھر کے لیے کوشش شروع کردیتا ہوں پھر بھی ہفتہ دس دن لگ ہی جائیں گے اس میں۔'' اس کے جواب پر خالہ بی سوچ میں پڑ گئیں۔

"ویسے تو میرا گھر ہے میرا مطلب ہے میرے ماں باپ کا میں نے کرائے پر دے رکھا ہے مگر وہ اتنا پس ماندہ اور خستہ حال ہے کہ میں کم از کم ایمن کو ادھر لے جا کر رکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، ویسے آپ فکر نہ کریں۔ میں جلد ہی بندوبست کرلوں گا۔" وہ کہتا جا رہا تھا اور خالہ بی کے دل میں گہرا اطمینان اترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ آخری پھانس بھی نکل گئی۔ وہ خود ہی سر ہلانے لگیں۔

"آج ہفتہ ہے منگل والے دن شام کو سادگی سے نکاح ہو جائے گا، اسی شام رخصتی ظاہر ہے ادھر ہی ہوگی، اگلے دن دل چاہے ولیمہ رکھ لینا تو ٹھیک، ورنہ جو تم کہو اور جمعرات کی صبح میں روانہ ہو جاؤں گی۔" وہ خود ہی سے سارا شیڈول طے کرتے ہوئے بولیں۔

"ایمن! ایمن بیٹا! ادھر آؤ۔" انہیں فوراً ہی خیال آ گیا کہ انہوں نے خود سے سارا کچھ طے کرلیا ہے اگر ایمن نے بیچ میں آکر انکار کردیا تو پھر وہ اسے کسی طور منا نہیں سکیں گی۔

"میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ تم ایمن کو بتاؤ ذرا۔" اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں اور کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

ایمن اگرچہ ان کی آخری باتیں سن چکی تھی مگر اس کا چہرہ بے تاثر تھا شہریار کو کچھ دیر سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح اسے خالہ بی کے شیڈول سے آگاہ کرے۔

"کس کا فون تھا؟" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا بول کچھ اور گیا۔ "میری فرینڈ کا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"آنٹی ہماری شادی کا کہہ رہی ہیں۔ اگرچہ میں نے کہا ہے کہ یہ جلدی ہے۔"

وہ رُک رُک کر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا تو وہ براہ راست اس کی نگاہوں میں دیکھنے لگی۔

وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی پھر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔

"کچھ کہو گی نہیں؟" وہ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی ہی سمجھا پھر بھی اس کی خاموشی کی وجہ جاننے کو بولا۔

"کیا کہوں۔ میرے اختیار میں کیا ہے۔" اس کی ہنسی میں بے چارگی سی تھی۔

وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے اتنی بے بسی و بے چارگی سے بولی کہ پہلی بار شہریار کو اپنے دل میں اس کے لیے خالص محبت کے جذبے سر اٹھاتے محسوس ہوئے۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اسے کوئی سا ڈھارس بھرا جملہ کوئی ایسی امید بھری تسلی دے کہ اس کی ساری بے بسی، بے چارگی اس خوب صورت سٹنگ روم کی خواب ناک فضا میں تحلیل ہو جائے اور اس کے چہرے پر پہلی ملاقات والا گلابی اعتماد بھرا اجالا جگمگانے لگا۔

"لیکن اس کے باوجود میں بہت ٹینس میں نہیں ہوں کنفیوز تو ہوں مگر پریشان نہیں کیونکہ میں نے کبھی زندگی کے بارے میں بڑے بڑے خواب نہیں دیکھے۔ مجھے بمباسٹک لائف کی کبھی بھی تمنا نہیں رہی میں تو بس ایڈونچر کی قائل ہوں۔ یہ ٹائم مشکل ہے۔ پرابلم کر رہا ہے تو کیا ہوا؟ یہ وقت بھی گزر جائے گا اگر نہیں بھی گزرتا تو کیا ہوا میں اس کے گزر جانے کا انتظار کرتے ہوئے موت سے ہم کنار تو نہیں ہو سکتی نہ کسی بمباسٹک خوشی کے حصول کے لیے اپنی جان لے سکتی ہوں سو جو ہو رہا ہے ہونے دیجیے اچھا کہ برا ہوا اس کا پتا آگے چلے گا کہ وقت کے اسرار میں کیا بھید ہے سو اٹس او کے۔"

شہریار کے تسلی بھرے جملے یا ڈھارس کے بغیر ہی ایک بار پھر وہی گلابی اعتماد بھرا اجالا اس کے کم سن مگر دلکش چہرے پر اپنے حصار میں لے چکا تھا اور شہریار کو لگا وہ اس پوائنٹ پر آکر بغیر کسی منصوبہ بندی کے ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہوگیا ہے۔

وہ اب مزے سے بیٹھی ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہولے ہولے ہلا رہی تھیں ایک مطمئن و پر سکون مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ لمحوں سے خوشیاں کشید کرنے والی ہے اور میں ...... ایک پلانر ایک منصوبہ ساز دل و دماغ رکھنے والا ...... اختلاف تو یہیں ہوگیا مگر اس اختلافی نقطے پر اب دھیان دینے والا کون تھا، ایک دل تھا ایمن کے قدموں پر نچھاور ہو چکا تھا۔" اس نے بے بسی سے سوچا اور کھل کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔" کوکو صاف ستھرا دھلا ہوا مگر بغیر استری کے جگہ جگہ سے پیوند زدہ یونیفارم پہنے آخری سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ نیچے زینوں پر منیا کو بیٹھے دیکھ کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"اوپر اتنی گرمی ہے اور پنکھے کوئی چلانے نہیں دیتا کہ بل آئے گا یہاں ٹھنڈک ہوتی ہے اور ابھی چاچا بشیر ساتھ والی سیڑھیوں سے اتر کر اپنی دکان پر چلا جائے گا تو ان کے بڑے سے اوپر والے زینے پر جا کر لیٹ جاؤں گی، ایمان سے اتنی نیند آرہی ہے کہ کیا بتاؤں ساری رات کھٹملوں، مچھروں اور اس اللہ ماری لوڈشیڈنگ نے سونے نہیں دیا صبح ذرا آنکھ لگی کہ پنکھے پر بین لگ گیا۔" وہ کہتے ہی منہ کھول کھول کر جمائیاں لینے لگی۔

"مگر اسکول نہیں جاؤ گی؟" کوکو نے یونہی پوچھا اگرچہ اس کا جواب اسے معلوم تھا، اس نے منہ ہلائے بغیر ہاتھ ہوا میں پنکھے کی طرح چلایا۔

"تم جاؤ۔ تم نے میڈم وہ کیا نام بتا رہی تھیں اس دن۔ ہاں کیورے نہیں کیوری ہے نا، وہ بننا ہے مجھے یہ آدھا تیتر آدھا بیٹر بن کر کیا کرنا ہے چار جماعتیں فیل یا چھ جماعتیں پاس کے بعد بھی تو اسکول چھوڑنا ہی ہے تو ابھی کیوں نہیں۔" وہ زور زور سے سر کھجاتے ہوئے جمائی لے کر بولی۔

''باجی نسرین تمہارا پوچھ رہی تھیں۔'' کوکو نے اسے آخری لالچ دیا کہ صرف اس ایک نام پہ وہ شاید اسکول جانے پر تیار ہو جائے۔

''بازار سے سودے منگوانے ہوں گے یا رنگ محل جانا ہوگا اور وہ بھلا مجھے کیوں یاد کریں گی کہہ دینا چھٹی کے ٹیم چکر لگا لوں گی۔''

وہ آگے ہو کر ساتھ والی نیم اندھیرے میں ڈوبی سیڑھیوں کی طرف جھانکنے لگی کہ کب چاچا بشیر اترے اور وہ جا کر نیند پوری کرے۔

''تو اوپر جا کر اماں کا ہاتھ بٹا آج تو سلو بھی کام پر نہیں گیا دیہاڑی تو آنی نہیں، شام کو پکے گا کیا؟ اماں کہہ رہی تھی پانچ درجن لفافے بن جائیں تو پچیس روپے تو مل ہی جائیں گے ورنہ رات کو فاقہ ہی ہوگا۔'' کوکو نے اسے خوف سے ڈرانا چاہا جو واقعی اس کے لیے خوف ناک ترین تھا، بھوکا رہنا۔

''تو روز کون سا ہم شاہی ڈنر اور ناشتے کرتے ہیں جو آج انوکھی بات ہو جائے گی اور یہ سلو کمینہ پیٹ درد کا بہانہ کر کے چھٹی مار گیا ہے اسے کوئی کچھ نہیں کہتا پہلے کون سے وہ ڈالر یا پونڈ لاتا ہے، جو آج ان سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے کہاں رہ گیا یہ چاچا بشیر؟'' اس کا نیند کے مارے بدن ٹوٹ رہا تھا۔

''اچھا تم اوپر دفع ہو جاؤ اماں کے ساتھ تھوڑا کام کروا دو۔'' کوکو نے آخری سیڑھی اتر کر ایک بار پھر اس سے کہا اس نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

''نیند پوری ہوئے بغیر تو موت کے فرشتے کا کہا نہیں مان سکتی کہ تمہارا مان لوں۔ اچھا ایک شرط پر اماں کا ہاتھ بٹاؤں گی۔''

''وہ کیا؟'' کوکو رک گئی۔

''وہ جو تمہارے اسکول کے سامنے طیفے کی دکان ہے وہاں سے آتے ہوئے امچور تو لے آنا۔ قسم سے سب سے مزے دار امچور اس کا ہوتا ہے۔'' وہ امچور کی کھٹاس منہ میں محسوس کرتے ہوئے آنکھ دبا کر چٹخارہ سا بھر کر بولی۔

''تم خود لے آؤ تم کیا پردے میں بیٹھی ہو۔'' کوکو سمجھی شاید وہ کسی اسکول کی استانی کے دیکھ لینے کے خوف سے ادھر نہیں جا رہی۔

''کیسے جاؤں کمبخت کے ساڑھے پانچ روپے ادھار ہیں مجھ پر جب جاتی ہوں چھپ چھپ کر بھی گزروں کتنی دکان داری کا رش ہو کانا مجھے تاڑ ہی لیتا ہے۔ قسم سے اماں کا خوف نہ ہوتو کب کے اس کے ساڑھے پانچ روپے اتار چکی ہوتی۔'' وہ ایسے معنی خیز انداز میں بولی کہ کوکو سمجھ کر

بھی انجان بن گئی۔

''تم پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہو۔ میں جا رہی ہوں اور امچور کے لیے میرے پاس چونی نہیں، جو میں تمہیں روپے کا لا دوں اوپر جا کر اماں کے ساتھ کام کرو۔'' کوکو جاتے جاتے اسے تاکید کر گئی اگرچہ جانتی تھی اس تاکید کا فائدہ کوئی نہیں، اس وقت چاچا بشیر کھنکارتا کھوں کھوں کرتا، سیڑھیاں اتر آیا تھا لٹھے کی کڑکڑ کرتی شلوار اور اس کے ساتھ دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، سیاہ کھسہ اور خضاب لگے بالوں کے ساتھ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ خود کو کوئی ''شے'' سمجھتا ہے، منیا بے اختیار اپنی سیڑھیوں کے دو زینے اوپر پھلانگ گئی۔ چاچا بشیر کے جاتے ہی وہ ہرنی کی طرح اچکتی ان کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

وہ خود میں سکڑی سمٹی دوپٹے کے کونوں کو مٹھی میں جکڑے محتاط انداز میں جا رہی تھی جب اسے پھٹے بانس جیسی آواز نے اس کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا پیدا کر ڈالا۔

کن اکھیوں سے بائیں طرف دیکھا۔

سامنے ہی گلزار اور اس کے مسٹنڈے یار کھڑے تھے، ''اوئے بے غیر تو! چلو دفع ہو جاؤ حیا نہیں کمینو!'' نانا دین محمد اپنے جیسے دو سال خوردہ بوڑھے دوستوں کے ساتھ حقے کو لبوں سے لگائے تہبند باندھے اکڑوں بیٹھا تھا اس عمر میں بھی اس کی بصارت اور سماعت خوب کام کرتی تھی خاص طور پر اس طرح کی فلمی سچویشن کو سمجھنے میں نانا ایک لمحہ نہ لگاتا۔

وہ اب باقاعدہ کورس کی شکل میں گاتے ہوئے کوکو کے پیچھے چلنے لگے تھے۔

اس کا دل چاہا پلٹ کر گھر بھاگ جائے۔ دفع کر دے اس پڑھائی کے شوق کو، منیا کی طرح بے فکری سے مزے کرے...... آخر اسے کیا مل جائے گا یہ ساتویں جماعت پاس کر کے...... کون سا وہ کوئی ڈپٹی لگ جائے گی۔

''میرے خیالوں پہ چھائی ہے ایک صورت......'' ان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی اگرچہ اس پختہ گلی میں صبح کے وقت کی گہما گہمی اور شور تھا۔

اکثر نے کوکو کی ڈری سہمی چال اور خوف و ہراس سے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر اس کے پیچھے آتے گلزار اور اس کے دوستوں کی کھلی بدمعاشی کو ملاحظہ بھی کیا، مگر دیکھ کر بھی انجان بن گئے۔

اسی وقت بائیں طرف کی بغلی تنگ ٹیڑھی سی گلی سے کالے رنگ کا خارش زدہ کتا نکلا اور ''بھوؤں بھوؤں'' کرتا ایک دم سے گلزار کے کندھے پر چڑھ گیا۔

''او، اوئے، او......'' اس نے اس اچانک حملے پر بوکھلا کر موٹی موٹی گالیاں بکتے ہوئے کتے کو زور سے نیچے پٹخا مگر کتا یا تو بھوکا تھا یا وہ واقعی کتا تھا جو اپنے بھائی بند کو دیکھ کر اس سے لپٹا جا

رہا تھا۔ اس کے رنگ اڑے ٹراؤزر کے پائنچے کو منہ میں دبائے وہ پورا زور لگا کر کھینچنے لگا۔ کوکو نے انہیں کتے میں مصروف دیکھ کر تقریباً دوڑ لگاتے ہوئے اسکول تک کا بقیہ راستہ طے کیا۔

روز اس کے ساتھ اسکول تک سلو ہوتا تھا اور واپسی پر کلاس کی دوسری لڑکیاں ...... آج سلو کے نہ آنے سے اس لوفر کو موقع مل گیا تھا۔

اسکول کا بھاری سال خوردہ گیٹ آ گیا تھا، وہ اس کی چوکھٹ کو پھلانگتے ہوئے اسکول کی سیلن زدہ اکھڑی اینٹوں والے اونچے نیچے فرش والی ڈیوڑھی میں آ گئی۔ جس کی چھت کسی اونچے گہرے گنبد کی طرح بلند اور تاریک تھی۔

''یہ چار دیواری بھلے بوسیدہ سال خوردہ کسی بھی وقت ڈھے جانے والی ہے مگر ہم جیسی لڑکیوں کے لیے باہر کی دنیا کے مقابلے میں کیسی محفوظ ہے۔'' وہ اپنی کلاس کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''یارا! سب کچھ ایمرجنسی میں ہی سمجھو ہو رہا ہے۔ سو کارڈز وغیرہ چھپوانے کا بھی ٹائم نہیں ہے اور یوں بھی مجھے ان فارمیلٹیز سے چڑ ہے سادگی سے نکاح ہو گا ٹیوز ڈے کی شام، تمہیں اسپیشل انویٹیشن ہے۔'' رضوان باہر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلنے لگا کہ تیزی سے اندر داخل ہوتے شہریار نے اسے روک کر بغیر کسی تمہید کے شروع کیا تو لحہ بھر کو رضوان تو بھونچکا سا رہ گیا منہ کھولے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

''اوں ہوں منہ تو بند کر لو، برسات کا موسم ہے آج کل۔'' شہریار نے خود ہی اس کے کھلے منہ کو دبا کر بند کرنے کی کوشش کی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ ٹھوڑی سے ہٹا کر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

''زبان تو میں نے اردو ہی بولی تھی جو ثقیل بھی نہیں تھی تو تمہیں سمجھ میں نہیں آئی کیا؟'' وہ کہہ کر اندر مڑ گیا اور کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ رضوان گردن موڑے اسے دیکھتا رہا پھر ڈھیلا سا ہو کر اندر آ گیا۔

''تمہاری اس اچانک بریکنگ نیوز میں دو تین نقاط سخت ناقابل ہضم ہیں تم اور اتنا بڑا کام بغیر کسی پلاننگ کے کر ڈالو ...... میرا منہ تو کیا دماغ کا ہلنا بھی ناقابل فہم نہیں ہو سکتا اب بتاؤ۔'' وہ اپنی حیرت کی وجوہات بیان کرتا عین اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''یہ ایمرجنسی تمہیں لگتی ہے ورنہ میری پلاننگ کا حصہ ہے، فارمیلٹیز سے یوں چڑ ہے کہ یہ اسراف میں آ جاتی ہیں اور سادگی ...... ہاں تو میرے بھائی سادگی اچھی بھی ہے۔ سو اس کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔'' وہ ٹانگیں پھیلا کر سر کرسی کی پشت پر کرتے ہوئے بالکل ریلیکس انداز

میں بیٹھ گیا۔

''لگتا ہے کوئی موٹی آسامی پھنس گئی ہے، اتنا تو میں تمہیں جانتا ہی ہوں۔''

''چلو مان لیتے ہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''اب ذرا اس ''موٹی آسامی'' پر روشنی ڈالو گے۔''

''ہرگز نہیں، منگل کو ساتھ چلو گے بارات میں تو دیکھ لینا۔''

''بارات میں۔'' اس نے خوب کھینچ کر کہا۔ ''ماشاء اللہ کیا رفتار ہے بیٹا ترقی کرو گے تم خوب نظر آ رہا ہے مجھے ...... ویسے اس شان دار بارات کے اور باراتی کون ہوں گے اور شہ بالا کون خوش نصیب قرار پائے گا۔'' رضوان کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔

''یوں نہ گھورو۔ قسمت ہر کسی پر زندگی میں ایک بار ضرور مہربان ہوتی ہے تھوڑا انتظار کر لو۔''

''میں ذرا نہا کر فریش ہو لوں پھر ذرا شاپنگ کے لیے نکلنا ہے اپنی فیانسی کے ساتھ۔''

''سبحان اللہ۔'' رضوان سر دھننے لگا۔

''ویسے اطلاع تو ذرا دوسری تھی۔'' اگلے پل کچھ یاد آنے پہ وہ بولا۔

''کیسی اطلاع؟'' شہریار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سامنے لگے کلاک پہ ٹائم دیکھتے ہوئے بے توجہی سے بولا۔

''سنا تھا آفس میں افواہ گردش کر رہی تھی کہ جن پانچ لوگوں کو ماسکو ٹریننگ کے لیے دو سالہ کورس پر بھیجا جا رہا ہے، ان میں تمہارا بھی نام شامل ہے۔ میں سمجھا شاید اس خوشی میں آنجناب لال گلاب ہوئے جا رہے ہیں۔''

''بہت باخبر ہو۔'' شہریار اس کی بات پر قدرے چونکا تھا۔

''اتنا باخبر دار اور چوکنا ہونا تو شہریار صاحب کے روم میٹ کا حق بنتا ہے۔'' وہ لہجے میں مصنوعی عاجزی بھرتے ہوئے بولا۔

''خبر تو درست ہے مگر آفس کے معاملات تمہیں معلوم ہیں ناچیونٹی کی رفتار سے چلتے ہیں میں نے منیر صاحب کے کہنے پر اپلائی تو کر دیا ہے مگر صرف میں ہی اپلائی کرنے والا نہیں، سو میں نے یہ امید ہی نہیں لگائی ہم اپنے آفیسرز کے نہ اتنے چہیتے ہیں اور نہ ہمارے پاس کوئی سفارشیں ہیں سو ان فضول امیدوں کا فائدہ۔'' وہ کندھے اچکاتا ہوا بولا۔

''تو آپ نے اپنی امیدوں کا گلشن کہیں اور مہکانے کا سوچا ہے۔''

''یہی سمجھ لو۔''

"ہاں، اپنی اپنی قسمت۔" وہ سرد آہ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

"اب کہاں چل دیں۔" وہ کندھے پر بیگ ڈال کر گلاسز ہاتھ میں لیے لاؤنج سے نکل رہی تھی، جب پیچھے سے خالہ بی نے آواز دے کر پوچھا۔

"میں......؟" وہ ٹھٹک کر رک گئی الٹا سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تو بی بی! تمہیں ہی کہہ رہی ہوں اور ادھر کون سی روح ہے، جس سے منہ ماری کروں گی میں۔" وہ تنک کر کہتے ہوئے گیلے ہاتھ دوپٹے سے صاف کرتے اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"ابھی وہ آ رہا ہے نا تمہیں شادی کی شاپنگ کروانے اور کھانے کے لیے باہر لے جانے اگرچہ نہ تو مجھے یہ پسند ہے اور نہ ہمارے ہاں ایسی آزادی کی رسم ہے، پر کیا کیا جائے کہ تمہارے ساتھ سبھی کچھ نرالا ہوا ہے تو...... میرے خیال میں یوں دو چار بار شادی سے پہلے ہی اگر تم دونوں مل لو تو ایک دوسرے کی طبیعتوں کو ذرا سمجھ جاؤ گے، یوں تو دن ہی بیچ میں دو ہیں ملو گے کیا آج جا کر کچھ شادی کے جوڑے اور جوتے تھوڑا زیور خرید ڈالو، بس پھر گھر بیٹھ جاؤ تو اچھا ہے ذرا روپ چڑھے گا۔" کہتے کہتے وہ خود ہی رنجیدہ سی ہو گئیں۔

"خالہ بی یہ شادی وادی کے لہنگے غرارے شرارے نہ میں نے خریدنے ہیں نہ پہننے ہیں۔"

"تو کیا یہ موئی لنگی چڑھا کر دلہن بنو گی۔" ان کا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا اس کی رینکل فری جینز کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں۔

"یہ بھی بری نہیں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"اس کی بھی کیا ضرورت ہے۔" وہ بری طرح کلستے ہوئے لبوں میں بڑبڑائیں۔

"آئیڈیا اچھا بھی ہے اور یونیک بھی۔" وہ اسی شوخ انداز میں بولی۔

"پٹ جاؤ گی ایمن مجھ سے۔" وہ تپ کر بولیں تو وہ ہنس پڑی۔

"خالہ بی! جسٹ کمپرومائز کر رہی ہوں ورنہ ابھی میرا دل یہ شادی وادی جیسے جھنجٹ میں پڑنے کو تیار ہی نہیں بس۔" اس نے کہتے ہوئے تیزی سے آنکھیں جھپکائیں۔

"جانتی ہوں میری بیٹی ایسی شادی کو بھلا کس کا دل راضی ہو گا مجھے احساس ہے تیرے جذبات کا پر کیا کروں شاید یہ سب اس طرح ہونا تھا اچھا سنو۔" انہیں کچھ خیال آیا تو اس کے اور قریب ہو گئیں۔

"جی......" اس نے کلائی پر باندھی نازک گھڑی میں وقت دیکھا۔

"تمہیں شہریار پسند تو ہے نا؟"

"بڑی جلدی خیال آ گیا آپ کو یہ پوچھنے کا۔" وہ طنز سے بولی تو وہ لمحہ بھر کو پریشان سی ہو گئیں۔

"ممیں میں نے پوچھا تو تھا شاید......" وہ ہڑبڑا کر بولیں۔ ایمن انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"لڑکا تو اچھا ہے نیک، شریف، پڑھا لکھا۔ اگرچہ پیسے والا نہیں لگتا پر اس موئی دولت کا کوئی کیا بھروسا کرے، کب کس کا ساتھ دیتی ہے تمہارے سامنے ہے سب۔"

وہ جواب میں پھر چپ رہی۔

"کچھ بولتیں کیوں نہیں؟" وہ اس کی خاموشی سے ہراساں سی ہو کر بولیں۔

"کیا بولوں؟" اس نے گہرا سانس لیا۔

"گھر کی بات کر چکی ہیں نا آپ اس سے۔"

"ہوں۔" انہوں نے چار پانچ چھالیہ اکٹھی منہ میں ڈالیں۔

"خالہ بی ہوں کیا ٹھیک سے بتائیں نا!" وہ ان کے مبہم سے جواب سے چڑ کر بولی۔

"دیکھو جہاں تک تہذیب و روایت اجازت دیتی تھی میں نے پوچھ ڈالا۔ کچھ تسلی بخش جواب اس نے نہیں دیا۔ میں کیوں تمہیں اندھیرے میں رکھوں۔" انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ ڈالا۔ یہ گرہ تو ان کے دل میں بھی تھی۔

"تم اس موئے انکل کو فون کرو۔ دو چار مہینے کا ٹائم لے لو ایسی بھی کیا بے صبری و بے اعتباری۔ ذرا یہیں رہ کر ایک دوسرے کو جان سمجھ لو ایک دوسرے کی مالی حالت کا علم ہو جائے تو پھر مل کر کوئی فیصلہ کر لینا۔"

"صبح ان کے سیکرٹری کا فون آیا تھا کہ گھر ہمیں پانچ دن بعد خالی کرنا ہے کیونکہ وہ گھر سیل کر چکے ہیں لیکن اگر میں کہوں تو انکل راشد ان سے دو ماہ کا ٹائم لے کر دے سکتے ہیں۔" وہ آہستہ سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی تو خالہ بی کے دل کو ڈھارس بندھی۔

"تو کیا بولا تم نے کہہ دیا ہو گا دو مہینے کے وقت کا۔"

"نہیں میں نے کہہ دیا کہ گھر کی چابیاں پانچ دن بعد ساتھ والے انکل قریشی کے گھر سے آ کر لے لیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"ایں، لڑکی تیرا بھیجا تو خراب نہیں، حد ہو گئی پاگل پن کی بھی چولہے میں ڈالتیں ایسی خودداری و غیرت کو۔ آدمی کا کٹھن وقت نہ نکال سکے۔" انہیں تو سنتے ہی جیسے آگ لگ گئی۔

"خالہ بی! پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کے گلے کا ہار نہیں بنوں گی۔ کئی بار پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ میری پروا مت کریں آپ کو جانا ہے تو بلا خوف و تردد چلی جائیں، میں اپنا خیال رکھ سکتی

ہوں مگر پھر بھی آپ کو......"

اس کی آواز رندھ گئی اسی وقت باہر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو وہ کوئی بھی اگلی بات کیے بغیر تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ خالہ بی ہونہہ کہہ کر صوفے پر بیٹھ گئیں اور تیزی سے چھالیہ چبانے لگیں۔

☆☆☆

"آپ نے گھر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" شہریار اسے لمبی چوڑی شاپنگ کروانا چاہتا تھا مگر اس نے صرف تین جوڑے خریدے تھے، دو ہلکے کامدانی والے اور ایک فینسی سوٹ۔

"مجھے اس طرح کے کپڑے پسند نہیں نہ میں نے کبھی یہ پہنے ہیں۔" اس نے مزید اس طرح کی شاپنگ سے انکار کر دیا۔

میچنگ جوتے بھی دو ہی ہے اور شہریار کا خیال تھا شاید وہ اپنی طرف سے بھی اس کے لیے اور اپنے لیے شاپنگ کرنا چاہے گی، مگر جب ایمن نے ایسا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا تو اس نے ڈھیٹ بنتے ہوئے خود ہی اپنے لیے ایک سوٹ خرید لیا۔

"میں اس کی پے منٹ کر دوں گی۔" اسے کیش کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے خیال آ ہی گیا۔

بس یہی احساس شہریار کو اسے دلاتا تھا۔

"تم اور میں الگ تو نہیں۔ میں یہ سمجھوں گا، تم نے ہی خرید کر گفٹ کیا ہے مجھے۔ ٹائم کم ہے ورنہ میرا دل تو تمہیں ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کروانے کا تھا اور مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔ عام لڑکیوں کی طرح تمہیں شاپنگ کا ذرا بھی شوق نہیں ورنہ لڑکیاں انہیں ذرا موقع ملے، آفر کر دو تو بس......"

وہ واقعتاً حیران ہوا تھا بہر حال وہ ایمن کو اتنا سادہ یا درویش ٹائپ نہیں سمجھتا تھا۔

شہریار نے ایک بار سرسری سا جیولری شاپنگ پر چلنے کو کہا تو ایمن نے فوراً انکار کر دیا۔

"ماما کی کچھ جیولری پڑی ہے، فی الحال اسی سے کام چل جائے گا۔"

اور شہریار کو تو اس میں دل سے خوش ہونے کی کوئی رمق بھی اس کی چہرے انداز یا کیفیات میں جھلکتی دکھائی نہیں دی تھی کئی بار اس کا دل چاہا، وہ ایمن سے پوچھے کیا وہ اس بندھن کے بندھنے سے خوش نہیں یا اس کی کوئی اور مرضی تھی؟

اگر وہ ہاں کہہ دیتی دونوں سوالوں کے جواب میں تو؟ بس اسی ہر اس نے شہریار کو ان دونوں سوالوں کو لبوں تک آنے سے روکے رکھا۔

اتنی تھوڑی سی شاپنگ میں بھی انہیں چار پانچ گھنٹے لگ گئے، اب شہریار اسے کھانے کی

آفر نہ بھی کرتا تو وہ خود اسے کھانا کھانے کے لیے چلنے کو کہہ دیتی کیونکہ اب اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔

مینیو آرڈر کرتے ہی اس نے شہریار سے گھر کے بارے میں وہ مچلتا ہوا سوال کر ڈالا تھا جو کسی آکٹوپس کی طرح اس کے دل و دماغ سے جکڑا ہوا تھا۔

"شادی تو ہو جانے دو میری جان!" وہ اس کے چہرے کو فوکس کرتے ہوئے ذرا رومانٹک سے لہجے میں بولا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ چپ سی ہو گئی۔

اس کا دل اس گہری نظر پر پریشان سا ہو کر دھڑکا تھا۔

"کیا ایموشنل انوالومنٹ اس سارے قصے میں...... جو محض ایک مضبوط سہارے کی تلاش کے لیے شروع کیا گیا ہے، شامل ہو گئی ہے۔" اس نے پہلے دل کی پریشان ہوتی دھڑکنوں سے پوچھا تھا۔

جواب مبہم سا تھا نہ صاف انکار نہ سیدھا اقرار!

"آپ کے پیرنٹس کا جو گھر ہے، آپ نے رینٹ پر دے رکھا ہے۔ وہ خالی کروا لیں نا۔"

چند لمحوں بعد اپنے ذہنی خلفشار پر قابو پاتے ہوئے اس نے قدرے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ڈیئر۔" شہریار نے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے گہرا سانس لے کر کرسی سے کمر ٹکالی اور اسے براہ راست دیکھنے لگا۔

"کیوں فائدہ نہیں؟" وہ اس "مسئلے" کو آج حل کر ہی لینا چاہتی تھی۔

"بھئی وہ گھر تو نرا کھنڈر سمجھو۔" وہ اب کے کچھ بیزار سا ہو کر بولا۔

"گھر تو ہے نا!" وہ آہستگی سے بولی تو شہریار نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کم سے کم میری نظر میں نہیں اور پھر تمہارے لیے...... ہرگز نہیں۔" وہ پُرزور نفی کرتے ہوئے بولا۔

"فی الحال......" وہ اسے قائل کرنے کو بولی۔

"فی الحال یہیں ٹھیک ہیں ہم۔ ویسے میں نے ڈیلر سے بھی بات کر لی ہے۔ دو چار دنوں میں انتظام ہو جائے گا۔" اس نے بات ختم کرنے کو کہا۔

اور ایمن "یہیں" کے بارے میں استفسار نہ کر سکی۔

"مجھے اسے صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ میں اس گھر کو محض پانچ دن بعد خالی کرنے کا وعدہ کر چکی ہوں۔" اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب اس سے بڑھ کر اور کیا صاف لفظوں میں بتاؤں؟ محترم معصوم و لاپروا بنے جا رہے ہیں۔" وہ اسے یوں ریلیکس انداز میں مسکراتی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر بل کھا کر رہ گئی۔

"یہ کھانا کدھر رہ گیا۔ ایمان سے بھوک کی وجہ سے تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی اور یہ ہماری شادی سے پہلے شاید آخری ایسی رومانٹک ملاقات ہے جسے تم مسلسل پریشان کن اور خوفناک بنانے کی کوشش کیے جا رہی ہو میری جان! شادی کے بعد یہ سارے مسائل خود بخود ہمارے سروں پر ڈف بجانے لگیں گے نہ تمہیں کہنے کی ضرورت ہوگی نہ مجھے جتانے کی۔ ہم دونوں ان مسائل پر توجہ دینے پر مجبور ہوں گے۔ سو یہ لمحہ غنیمت، پیار کی چند گھڑیاں، مہلت کے یہ تھوڑے سے پل اس ڈنر کے بعد دوبارہ نہ جانے کب آئیں۔ آئیں بھی یا نہیں تو تم انہیں فضول خدشوں کے باعث کیوں برباد کرنے پر تلی ہو۔ یہ ساری باتیں سوچ لیں گے۔ مگر چند دن بعد۔ ابھی تو تھوڑا انجوائے کرنے دو۔" اس نے بے اختیار آگے کی طرف جھکتے ہوئے ٹیبل پر پڑے اس کے ہاتھ پر بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ زور سے جماتے ہوئے یہ سب کہا تھا۔

ایمن نے اس کی کتنی باتیں سنیں اور سمجھیں۔ اسے پتا نہیں چلا اس کا سارا دھیان تو شہریار کے مضبوط توانا ہاتھ کے نیچے دبے اپنے نازک سے ہاتھ کی طرف تھا جس سے برقی لہریں نکل نکل کر اس کے پورے بدن میں انتشار برپا کر رہی تھیں۔

"پلیز......" اس نے کسمسا کر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنا چاہا۔

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔" اس کے چہرے پر چمکتی شوخ سی مسکراہٹ اور...... گہری ہوگئی اور ہاتھ کا دباؤ کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

"شہریار پلیز۔ سب لوگ بیٹھے ہیں۔" اب کے اس نے پورا زور لگاتے ہوئے ہاتھ نکالنا چاہا اور بھینچتی ہوئی آواز میں فریاد کی۔

"بیٹھے ہیں تو کیا کھڑے ہو جائیں اور میں تو اس موقع کی تلاش میں بہت دنوں سے تھا۔" کہتے ہوئے اس نے ایمن کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

"یہ تمہارا گفٹ تین دِنوں سے میری پاکٹ میں پڑا تھا اور مجھے اسے دینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ پہلے سوچا تھا۔" اس نے دوسرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کچھ باہر نکالا۔ بلیک کلر کی مخملیں ڈبیا تھی۔

"پہلے شادی کی رات دینے کا سوچا تھا پھر سوچا۔ اس رات تو سب ہی کچھ نہ کچھ دیتے ہیں، ہماری شادی ایک ہی بار ہونا ہے اور تمہاری خالہ بی نے وہ ایمرجنسی نافذ کی ہے کہ معصوم حسرتیں تڑپ کر رہ گئی ہیں۔ اپنے ملن میں رومانس کے پل کتنے محدود ہیں بلکہ سمجھو ہیں ہی نہیں کہ منگنی تک نہیں ہو سکی اور میرا معصوم و بے قرار دل اس پر احتجاج نہ کرے تو اور کیا کرے کہ وہ تو لو ایٹ فرسٹ سائٹ میں خود کو قربان کر چکا ہے۔ اس کی قربانی کا کہیں نام ہی نہیں، سو اس محبت کے اقرار

کے ٹوکن کے طور پر مائی فرسٹ گفٹ ٹو مائی لو۔" کہتے ہوئے اس نے مخملیں ڈبیا سے نازک سی انگوٹھی نکال کر ایمن کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دی۔

"دیکھ لو۔ میری نظروں کی پیمائش کیسی فٹ آئی ہے میں اندازے سے خرید کر لایا تھا۔" رنگ واقعی اس کی انگلی میں ٹھیک تھی۔

ایمن نے اپنے یخ ہاتھ کی لرزاہٹ پر قابو پاتے ہوئے ایک جھینپتی ہوئی سی نگاہ اپنی سجی ہوئی انگلی پر ڈالی اور ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا۔

"تھینکس۔" اس کے کانپتے لبوں سے بدقت نکلا تھا، کیوپڈ کا تیر چل چکا تھا۔

اب کے اسے اپنے دل سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"خالی تھینکس سے کام نہیں چلے گا۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے اس کے گلابی شرمگیں چہرے کے رنگوں کو بڑے اشتیاق سے تکتے ہوئے متقاضی لہجے میں بولا تو ایمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

لمحہ بھر کو ہی اس کی نظروں کی طرف دیکھ سکی، دوسرے پل ان بولتی نگاہوں کا تقاضا جان کر اس نے بے اختیار نگاہیں جھکا لیں۔

"صرف تھینکس سے کام نہیں چلے گا۔ اس وقت سب کچھ بھلا کر صرف اس طرف توجہ کرو ...... کھانا آگیا ہے۔" وہ کرسی پر پہلے والی پوزیشن میں بیٹھتے ہوئے بے تکلف سے انداز میں بولا تو ایمن نے مسکراتے ہوئے نگاہیں اٹھائیں۔

دو بیرے گرما گرم کھانے کے خوان اٹھائے انہیں ٹیبل پر سیٹ کر رہے تھے۔

"بل میں پے کروں گی۔" شہریار نے اپنے لیے قہوہ منگوایا تھا جبکہ ایمن نے آئس کریم۔ آخری چمچہ منہ میں ڈالتے ہی نیم گرم نم نیپکن سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ضروری نہیں لیڈیز فرسٹ والا کلیہ ہر جگہ استعمال کیا جائے بل کے لیے۔"

"اوہ گولڈی۔" ایمن کی نگاہ بالکل اپنے سامنے آتے گولڈی اور عینی پر پڑی۔

وہ دونوں بھی اسے دیکھ چکے تھے۔

"ہائے۔" وہ اس کے پاس آکر بے تکلفی سے بولا۔

"ہائے۔" وہ آہستگی سے بولی، اس کی نگاہ لمحہ بھر کو دونوں کے آپس میں جکڑے ہاتھوں پر پڑی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے۔" گولڈی نے ایک سرسری سی نگاہ شہریار پر ڈالی تھی۔

"ہو نہیں رہا بلکہ ہو چکا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"مطلب!" اس نے آنکھیں سکوڑ کر ایک بار پھر شہریار کو دیکھا۔

"بھئی۔ کھانا ہو چکا اور کیا مطلب؟" ایمن کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"تمہارا سیل آف ہے، بنٹی شام سے ٹرائی کر رہی تھی۔"

پتا نہیں کیوں ایمن کو لگا گولڈی کا موڈ آف سا ہو گیا ہے۔

"وہ تو آج کل تم دونوں کا رہتا ہے، شاید میرا نمبر دیکھ کر آف ہو جاتا ہے۔" وہ جتانے والے انداز میں بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں، تمہیں البتہ "نئی روشنیوں" نے مصروف کر دیا ہے۔" وہ بھی اسی لہجے میں بولا۔

"نئی روشنیاں؟" اس نے معصوم بننے کی ایکٹنگ کی۔ "اوہ یو مین شہریار! ان سے ملو یہ شہریار ہیں اور شہری! یہ گولڈی میرا بچپن کا دوست۔" وہ پرجوش انداز میں بولی جبکہ شہریار کا دل اس کے "شہری" کہنے پر ہی خوشی سے اچھل کر باہر آنے لگا تھا۔

شہریار نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ آگے بڑھایا جسے گولڈی نے محض انگلیوں سے چھوا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"اوہ یار! میں مکمل تعارف تو کروانا بھول ہی گئی۔ شہریار از مائی فیانسی۔" اسے گولڈی کے چہرے کے سخت پڑتے نقوش عجب سی خوشی دے رہے تھے۔

"فیانسی۔" اس کے لب سکڑے اور آنکھیں بھی۔ ایمن نے کندھے اچکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہاری یہ بچکانہ عادت گئی نہیں جوش میں آکر نئے دوست بنانے اور چند ہی دنوں میں ان سے بیزار ہو کر دوستی پر لات مار کر آگے بڑھ جانے کی۔" گولڈی اپنے دلی جذبات کو زیادہ دیر چھپا نہ سکا۔

"یہ عادت بھی تم سے ہی ہائر کی ہے میں نے۔ یاد ہے نا تمہیں۔" وہ مزے سے بولی۔

"اوکے تو دو دن بعد فنکشن میں تو آ رہی ہو نا۔ میری اور عینی کی انگیج منٹ کے فنکشن میں اور پلیز، شہریار کو بھی ضرور ساتھ لانا۔ انہیں بھی ضرور پتا چلے۔ "انگیج منٹ" کس چڑیا کا نام ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"سوری یار! ہم شاید تمہارے فنکشن میں شامل نہ ہو سکیں۔ ہمیں ایک اور فنکشن میں شرکت کرنا ہے جس میں ہم پہلے سے انوائیٹڈ ہیں۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا مطلب؟ کون سا فنکشن؟" نجانے گولڈی کو کیوں اتنا غصہ آئے جا رہا تھا۔

"دو دن بعد ٹھیک تمہارے فنکشن والے دن میری اور شہریار کی شادی کا فنکشن ہے۔ اسی لیے تمہارا اور بنٹی کا فون ٹرائی کر رہی تھی اور تم دونوں نجانے کیا سمجھے کہ ایسا کیوں تم دونوں کو بار بار فون کیے جا رہی ہے، اس لیے میرا نمبر دیکھ کر تم دونوں ...... اٹس اوکے...... اب بھولنا نہیں۔ ٹیوزڈے کی شام کو تم دونوں نے آنا ہے بلکہ عینی کو بھی لے کر آنا تاکہ اسے بھی پتا چلے، زیادہ پائیدار رشتہ کون سا ہوتا ہے وہ جو منگنی کے بعد جڑتا ہے یا وہ جو شادی کے بعد...... اوکے بائے میں ویٹ کروں گی۔ تم دونوں کا...... سوری تینوں کا۔ سی یو۔"

وہ ہاتھ ہلاتی اس کا کندھا تھپکتی اس کے پاس سے نکل آئی تو شہریار بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

"یہ تو بہت اوورسی ہو رہی ہے، تمہاری خاص الخاص فرینڈ۔" عینی نے گولڈی کے جلتے دل پر پھایا سا رکھا۔ یہ الگ بات کہ گولڈی کے جلتے دل پر اس وقت برف کا پورا بلاک بھی رکھ دیا جاتا تو جلن میں کمی واقع نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے کانوں میں ابھی تک ایمن کی کھنکتی ہنسی کی آواز گونج رہی تھی۔

شاید اس دوستی پر ہنس کر گئی تھی جو کبھی ان کے درمیان تھی۔

گولڈی نے ایک بے زاری نظر عینی پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

اسے خود اپنی حالت کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

وینس شہر جس کی گلیوں میں نہریں بہتی تھیں اور اس کی سیر کشتی میں بیٹھ کر کی جاتی تھی۔ ان گلیوں میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی تھا۔ گلیوں کے دونوں جانب پتھر کے قدیم مکانات تھے۔ ان کی سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور گیلریاں اوپر کو جھکی ہوئی تھیں۔ سمندر کا پانی مکانوں کی دیواروں اور سیڑھیوں سے ٹکرا کر ہچکولے کھاتا تھا تو ان پانیوں میں چلتی کشتیاں ڈولنے لگتیں۔

وہ ایک قدیم دو منزلہ مکان تھا جس کی دیواریں سیاہ موٹے پتھروں کی تھیں۔ ان کی کشتی اسی مکان کے آگے آ کر رکی تھی۔

پہلی نظر میں خوف ناک پراسرار سادہ قدیم گھر جیسے انہیں دبوچنے کو آگے بڑھا تھا، اسے بہت ڈر لگتا تھا۔

وہ اس گھر کے ادھ کھلے بھاری لکڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اندر ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے آگے بھی محرابی دروازہ تھا جو آدھا ہی کھلا ہوا تھا۔ انہیں دعوت نظارہ

دیتا ہوا اور گھبرا گھبرا کر اپنے ساتھ چلنے والوں کو دیکھتی دروازے کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے وسط میں ایک فوارہ تھا (یا کبھی رہا ہوگا)۔

فوارہ ایک دیوہیکل مجسمے کی شکل میں تھا جس کا رنگ گہرا براؤن ہو چکا تھا۔ حوض بھی خشک تھا اور کہیں کہیں خود رو پودے اور گھاس اُگ رہی تھی اور کہیں محض ہری کائی سوکھ کر سبز مٹی کی شکل دھار چکی تھی۔

اس دیوہیکل مجسمے کی شکل والے فوارے اور حوض کے عین سامنے ایک ستونوں والا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں دن کے اجالے میں مٹیالا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسے برآمدے میں جاتے خوف سا آیا جیسے...... جیسے اس اندھیارے برآمدے میں کوئی سات سروں والا بھوت یا ان گنت پیروں اور بازوؤں والی بلا چھپی بیٹھی ہے اور جیسے ہی وہ اس برآمدے میں قدم رکھیں گے۔ وہ انہیں اپنے بازوؤں میں دبوچ کر خون چوس لے گی۔ وہ اسی خوف کے مارے سب کے پیچھے پیچھے تھی۔

اس اندھیارے برآمدے کے آگے ڈھیر ساری کوٹھڑیاں تھیں جو بغور دیکھنے پر ہی معلوم پڑتی تھیں اگر اس برآمدے میں دن کے اس پہر ایسا اندھیرا تھا تو ان کوٹھڑیوں میں کیسی دہشت بھری تاریکی پھن پھیلائے بیٹھی ہوگی وہ اندازہ کر سکتے تھے۔ (وہ تو چپکے سے پیچھے سے ہی واپس پلٹ آئی)

جب اتحادی فوجیں اٹلی میں داخل ہوئیں تو ہر طرف قتل و خون ریزی کا بازار گرم ہو گیا مسولینی کو گولی مار کر چوراہے میں کھمبے پر لٹکا دیا گیا۔ نشانِ عبرت بنانے کے لیے...... مسولینی جو شہنشاہیت کا حامی تھا۔ اس کے حامیوں کو اتحادی فوجیں پکڑ پکڑ کر ان ہیبت ناک مکانوں میں لاتیں اور بدترین تشدد کے ذریعے ہلاک کر ڈالتیں۔ اس نے یہیں تک پڑھ کر وہ سیاہ رنگ کی ضخیم ڈائری بند کر دی۔

''پیٹہ کولمبو کا کاروباری علاقہ اور لاہور کی اکبری منڈی کی طرح گنجان آباد اور گندہ تھا۔ کہتے ہیں یہ کولمبو کا پرانا شہر تھا۔ اس جگہ راون کے زمانے کے بت اور کھنڈرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں بوسیدہ اور تنگ و تاریک عمارتیں ہیں جن کے ایک ایک فلیٹ میں چار چار کنبے آباد ہیں، یہ کاروباری علاقہ ہے اور شہر کے سارے غلے اور اجناس کا کاروبار یہیں ہوتا ہے یہاں سبزی منڈی تھی، گھاس منڈی تھی، غلہ منڈی تھی صرف ہیرا منڈی نہیں تھی۔''

ساری رات بارش ہوتی رہی۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر وہ براؤن موٹی سی ڈائری بند کر دی۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

''اب اس کو بھی دیکھ لیتے ہیں اس میں کیا ہے۔'' اس نے چند لمحوں بعد ہاتھ بڑھا کر

تیسری سرخ رنگ کی نسبتاً پتلی ڈائری ہاتھ میں لی اور درمیان سے کھولی۔

''جنیوا سے آخری اسٹاپ کے آگے بل کھاتی سڑک ہے اور سڑک کے دونوں جانب آبادی۔ دائیں ہاتھ پر ڈھلوان تھی اور مکان تھے اور کبھی کبھی نیچے اترتے راستوں کے آخر میں جھیل کے پانی نظر آجاتے تھے یہاں سے اس جھیل کا نام جھیل جنیوا کی بجائے لاک لامن ہو چکا تھا اور یہاں بے جھیل کے ایک بڑے حصے کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے جو دھوپ میں سفید ہو رہا تھا اور دوسرے کنارے پر وہ پہاڑیاں بھی دھندلا رہی تھیں جو فرانس میں واقع ہیں۔ بائیں ہاتھ پر انگوروں کے کھیت بلند ہو رہے تھے اور ان میں چھوٹے چھوٹے فارم ہاؤس چھپے ہوئے تھے یہ منظر کیلنڈروں اور پوسٹ کارڈوں پر منتقل ہونے کے لائق ہے اور شاید ایسا کوئی کیلنڈر اور پوسٹ کارڈ نظروں سے گزرا بھی ہو۔''

اس نے ورق ادھورا چھوڑ کر دس پندرہ صفحات سے آگے پڑھنا شروع کیا۔

''انٹرلاکن کے نواحی علاقوں میں میورن بھی ہے جو ینگ فرو یعنی نوجوان دلہن کی سفید چوٹی کے بالکل دامن میں ہے اور اس کی ڈھلوانوں پر اسپائن پھولوں کی چادریں بچھی رہتی ہیں۔''

اس کے مکان، ریستوران، پارک بے حد نفیس ہیں ایک بڑے پارک میں ایک بہت بڑی گھڑی ہے جو پھولوں سے بنی ہوئی ہے اس بے پناہ دلکشی کے باوجود یہاں ایک اداسی کا احساس ہوتا ہے جو صرف مرگ میں ہوتا ہے، اور یہ اداسی سوئٹزرلینڈ کے اکثر شہروں میں ہے۔

ایک انتہائی بلند چٹان میں سے ایک درمیانے درجے کی آبشار نیچے سڑک تک آرہی تھی۔ آبشار کے آس پاس چٹان میں سیڑھیاں ہیں تاکہ آپ اس آبشار کے ''قریب'' ہو سکیں اور اس قربت کے لیے ایک مناسب رقم کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ یورپ میں سوائے کچھ آرٹ گیلریز کے، آپ کچھ بھی دیکھیں آپ کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ جیب سے نکالنا پڑتا ہے...... یہ چاہے کسی سینٹ کی قبر ہو۔ کوئی مشہور گرجا ہو۔ پرانا محل ہو۔ پارک ہو۔ آپ ٹکٹ خریدیے اور جائیے کئی مرتبہ آپ کو ٹکٹ اور ٹکٹ بھی خریدنا پڑتا ہے مثلاً آپ ایک گرجے میں ٹکٹ خرید کر داخل ہو گئے۔ اب اسی گرجے کے اندر ایک چیپل (Chapple) ہے جس میں کوئی شاہکار قسم کی منقش چادریں ٹنگی ہوئی ہیں تو ان کے لیے الگ ٹکٹ ہوگا اور اگر آپ فلاں سینٹ کے نوادرات دیکھنا چاہتے ہیں تو الگ ٹکٹ ......گرنڈل والڈ خاصی بلندی پر واقع ہے۔ اس لیے یہاں موسم انٹرلاکن کی نسبت کافی شدید ہے۔

یہاں کی آبادی بہت جلد سونے کی عادی ہے اور بازار سرِ شام ویران ہو جاتے ہیں۔ آس پاس پہاڑوں سے دھند اور بارش نیچے اترتی رہتی ہے، اور آپ کو مبہوت کرتی رہتی ہے جیسے آدمی اپنی جنت گم گشتہ کے راستے پر گناہ کے وسوسے سے بے خبر محوِ سفر ہو......''

اس نے ایک بار پھر ایک طویل سانس لے کر یہ ڈائری بھی بند کردی اس وقت ڈائری کی آغوش سے کوئی کاغذ پھسل کر نیچے گرا۔

آداب۔

منور حسین صاحب! آپ کا پُر جوش ویلکم مجھے مجبور کر گیا کہ میں ان سفرناموں کی پبلشنگ کے سلسلے میں آپ سے رابطہ کروں حالانکہ میں نے آپ کے علاوہ دو اور بڑے پبلشرز کو بھی ان کے مسودے کا کچھ حصہ بھیجا تھا۔ بہرحال مجھے آپ کی دی گئیں تمام شرائط قبول ہیں۔ میں اس ہفتے اپنے ہسبنڈ کے ساتھ آپ کے پبلشنگ ہاؤس آؤں گی اور ان چاروں کتابوں کے مسودے آپ کو دے جاؤں گی۔ امید ہے آپ معاہدے کی تمام شرائط کی پاس داری کریں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

شائلہ طاہر

خط پر جو تاریخ درج تھی ان کے باہر جانے سے تقریباً ایک ہفتہ قبل کی تھی۔

شاید ماما اس پبلشر سے مل کر گئی ہوں اور ان سفرناموں کے مسودے اگر اسے دے آئی ہوں تو یہ ڈائریاں۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

یہ ڈائریاں اس نے اکثر ماما کے پاس دیکھی تھی۔ بیرون ملک سفروں کے دوران بھی اور اکثر اپنے بیڈروم اور اسٹڈی میں بھی۔

اس کی ماما ایک اچھی قلم کار تھیں اگرچہ اسے لٹریچر یا سفرناموں جیسی صنف کو کبھی ذوق و شوق سے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی ان چند اوراق کو پڑھنے کے بعد اسے محسوس ہو رہا تھا، یہ سفرنامے خاصے کی چیز نہ بھی سہی مگر ان میں کوئی خاص اٹریکشن دلکشی ضرور ہے جو اس طرح کی چیزیں پڑھنے کے شائق لوگوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ تو گویا ان یادداشتوں کو چھپنا چاہیے اور کچھ نہیں تو ماما کی یاد کے طور پر ہی سہی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت سے پہلو مجھ سے پوشیدہ ہی رکھے جیسے ان کا لکھنے کا ہنر اور مجھ سے محبت کا جذبہ۔ اپنی بیماری کی نوعیت اور جاتے ہوئے مجھے یہ کنگال پن کا آخری تحفہ دینا۔ شاید ان سفرناموں کے شائع ہونے کے بعد مجھ پر ان کی شخصیت کے کچھ اور بھید بھی کھلیں۔

تو مجھے ان منور حسین صاحب سے جا کر ملنا چاہیے۔ وہ چاروں ڈائریاں ترتیب سے رکھتے ہوئے خود سے بولی۔

یہ یقیناً ایک نیا کام ہوگا نئی چیز کم از کم اور پاپا کے حلقہ احباب کے لیے ان کا ایک نیا تعارف......

وہ مجھے جاتے ہوئے کیا دے گئے، اس سے قطع نظر میں انہیں کیا تحفہ بھیج رہی ہوں۔ اس پر غور کرنا چاہیے۔

وہ چاروں ڈائریاں اس نے ایک طرف رکھیں اور الماریوں کے کھلے پٹ دیکھنے لگی۔

وارڈروبس میں کچھ خاص کپڑے نہیں تھے بس دو چار ہی قیمتی جوڑے ہوں گے جو اس نے پہلے ہی اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے باقی اس کے لیے بے کار تھے، وہ اس نے قریشی انکل کی مسز کو دینے کے لیے علیحدہ کر لیے وہ خود ہی جسے چاہے گی دے دیں گی۔

پاپا کے تین چار اچھے قیمتی ڈریسز اس نے شہریار کے لیے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیے۔

باقی کمروں سے اس کا کچھ بھی اٹھانے کو جی نہیں چاہا تھا۔ صرف ماما کے دو انتہائی نازک اور ہلکے سے سیٹ تھے جن میں ایک نیلم کا تھا دوسرا روبیز کا مگر وہ اتنے ہلکے وزن کے تھے کہ شاید ان کی ویلیو اس کے تصور سے بھی خاصی کم نکلتی۔

وہ اپنی بیماری کی وجہ سے جیولری بہت کم بلکہ شاذ و نادر ہی استعمال کرتی تھیں۔ ان کی شاپنگ زیادہ تر سادہ ملبوسات کی خریداری اور کتابوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ باقی پورے لاکر کے تمام خانے خالی تھے۔

اس نے ایک آخری نظر کمرے میں ڈالی۔

کیسے اجنبی پرائے پرائے سے در و دیوار لگ رہے تھے جیسے اس کے وجود سے بھی بیزار ہوں کہ یہ کب یہاں سے نکلے گی۔

خالہ بی نے اس سے کہا تھا جو ضروری سامان سمیٹنا ہو، آج اکٹھا کر لو پھر کل کا دن ہے بیچ میں اور پرسوں شادی؟

شادی! وہ دیوار گیر آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر چونکی تھیں۔

میری شادی! اس نے کالر والی پنک کلر کی شرٹ کے ساتھ ہم رنگ ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔

ابھی اسے اگلے ماہ انیسواں سال لگنا تھا۔

اگلے ماہ میری اٹھارویں سالگرہ ہے اور یہ شادی۔ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی۔ مس جوزفین کہا کرتی تھیں میرج ازائے کیج اور میرے تو ابھی پر پھیلانے کے، لمبی اڑان بھرنے کے دن ہیں تو میں یہ خوامخواہ پنجرے کا انتخاب کیوں کر رہی ہوں؟

اسے اپنے ہی عکس نے نئی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے سیدھا سا حل ہے۔ انکل راشد سے کہہ کر سال چھ مہینے کی مہلت لے لیتی۔ خالہ بی جاتی ہیں تو جائیں۔ میں اپنی اسٹڈیز دوبارہ اسٹارٹ کرتی۔ اس دوران کوئی پارٹ

ٹائم جاب......

''اوہ ایبا! یہ سارے بوگس آپشنز پہلے بھی کئی بار سوچ چکی ہو، ان میں سے ایک بھی قابل عمل نہیں اور قابل قبول بھی نہیں۔ میں اس چیٹ کھوسٹ انکل کی منت کیوں کروں بھلا؟ مائی فٹ۔''
اسے ایک دم سے پھر انکل راشد کا پرپوزل یاد آ گیا تو دماغ میں ابال سے اٹھنے لگے۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی رنگ ٹون بجنے لگی۔

شہریار از کالنگ! چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی وہ اس کے سست سے ہیلو کے جواب میں خاصا پرجوش تھا۔

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیل کان سے لگایا اور بیڈ پر اوندھا لیٹ کر فضا میں ٹانگیں ہلاتے ہوئے شہریار سے باتیں کرنے لگی۔

کبھی وہ اسی اسٹائل میں لیٹ کر گولڈی اور بنٹی سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی اور اب شہریار۔ انسان کے حالات و ترجیحات موسم کی کروٹ سے بھی پہلے بدلتے ہیں۔

☆☆☆

''یہ سوٹ کیس اور بیگ کس کا ہے خالہ بی؟'' وہ صبح ناشتے کے بعد تیار ہو کر باہر نکل رہی تھی جب لاؤنج میں رکھے اجنبی سے سوٹ کیس اور خوب پھولے ہوئے بیگ پر نظر پڑی۔

''شہریار کا سامان ہے۔'' خالہ بی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''شہریار کا مگر کیوں؟'' اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

''بھئی جب تک اسے گھر نہیں ملتا تو فی الحال اسے کہیں تو رہنا ہے۔'' وہ اسی بے خبری کے سے عالم میں شہریار کی ہمدردی میں بولیں۔

''کہیں کا کیا مطلب خالہ بی! آپ کو بھی معلوم ہے یہ گھر ہمارے پاس فقط تین دنوں کے لیے ہے تو......'' وہ ایک دم چیخ کر بولی۔

''اے بی بی! کوئی قیامت نہیں آ جائے گی جو تین سے تیرہ پندرہ ہو گئے۔ اب گھر ملے گا تو کہیں جائیں گے یا سامان اٹھا کر سڑک پر جا بیٹھیں۔'' وہ یوں چہک کر بولیں جیسے سڑک پر بیٹھنے میں وہ ان کا مکمل ساتھ دیں گی۔

''خالہ بی! اس بات کو آپ ڈن سمجھیں۔ ہمیں ادھر تین ہی دن رہنا ہے۔ میں ان شہریار صاحب کو بتا چکی ہوں اگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تو آپ پلیز۔ انہیں آسان لینگویج میں سمجھا دیں میں تین سے اوپر چوتھا دن بھیک میں بھی نہیں لوں گی اٹس۔''

وہ ایک ایک لفظ یوں چبا چبا کر بولی تھی جیسے تین دن ابھی پورے ہو رہے ہیں اور چوتھا

دن بس طلوع ہی ہوا چاہتا ہے۔

''میں تو اسے دبے دبے لفظوں میں کئی بار بتلا چکی ہوں۔ اب اگر وہ انجان بنتا ہے۔ پر بات انجان بننے کی بھی نہیں ہے۔ اب غریب راتوں رات کہاں سے الٰہ دین کا چراغ حاصل کر کے کسی جن کی خدمات لے۔ تم جانو اس مہنگے شہر میں اچھی رہائش کا فوری انتظام کسی جن کے ہی بس کی بات ہو سکتی ہے۔ کسی انسان کے نہیں۔''

خالہ بی نے جس طرح آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ صرف یہ اڑتالیس بہتر گھنٹے نمٹانے کے چکر میں ہیں اور بس ان کا ہیڈک ختم!

اس نے ایک دکھ بھری نظر ان پر ڈالی اور خاموشی سے باہر جانے لگی۔

''اب تم کہاں چل دیں؟'' انہیں ایک دم سے کچھ یاد آیا تو اس کے پیچھے لپکیں۔

''اک ضروری کام سے جا رہی ہوں۔'' وہ رکے بغیر بولی۔

''اے بی بی! کچھ خوف خدا کرو۔ آج تمہاری مہندی ہے۔ اپنی دوستوں کو بلا لینا تھا۔ کم بخت مفت خوروں کے ٹولے کو۔ اچھے دنوں میں گلچھرے اڑانے تو صبح و شام اس گھر کی دہلیز اکھیڑے ڈالتے تھے اور اب یوں غائب جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔'' وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔

''سوری خالہ بی! مجھے نہیں مہندی وہندی کا شوق اور نہ اب کوئی جھمگھٹا اچھا لگتا ہے۔'' وہ بیزار سی رک کر بولی۔

''اے لو مہندی تو ہماری روایت ہے۔ صدیوں کی سمجھو رسم جس سے انکار بدشگونی سمجھا جاتا ہے اور تم......'' وہ ہونٹ پر انگلی رکھ کر حیرت سے بولیں۔

''پلیز خالہ بی! مجھے ان کسٹمز سے کوئی مطلب نہیں۔ صدیوں پرانی ہیں یا منٹوں پرانی۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''اے یہ مہندی پر کسٹم کب سے لگنے لگا۔ توبہ توبہ یہ زمانہ بھی آنا تھا ایسی معمولی چیز پر بھی کسٹم والوں نے نظریں ڈالیں پر ان پر خدا کی مار، یہ کوئی باہر کے ملک سے آئی ہے۔ یہ تو ہمارے ملک کے ہر کونے، ہر باغ باغیچے میں اُگتی ہے مہندی کی باڑ اس کے پتے اور پتوں کو خشک کر کے......''

''افوہ خالہ بی! آپ بھی کیا عجیب بے تکی سی باتیں کر رہی ہیں کسٹم سے میرا مطلب روایت رسم تھا۔ میں ان رسومات کو نہیں مانتی۔ اس لیے لگانا ضروری نہیں سمجھتی اور اب پلیز مجھے جانے دیں۔ پہلے میں خاصی لیٹ ہو چکی ہوں۔'' وہ جھلا کر کہتی ہوئی تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"جی ہماری ان سے بات بھی ہوگئی تھی ایک کتاب کا مسودہ تو انہوں نے ہمیں بھجوا بھی دیا تھا۔آپ کے پاس چار کتابوں کا ہے جبکہ پانچویں کتاب کا مسودہ ہمارے پاس ہے پھر انہوں نے باقی کے مسودے لانے اور کنٹریکٹ سائن کرنے کا وعدہ کیا مگر اس کے بعد آخری بار ان کا فون آیا کہ وہ ملک سے باہر جارہی ہیں ہم یہی سمجھے......" وہ آدمی نظریں جھکاتے اٹھاتے کچھ رُک رُک کر بولتے لمحہ بھر کو خاموش ہوا۔خوبصورت فریم والی عینک اتار کر اپنے آگے پڑے میز کی گلاس ٹاپ پر رکھا۔

یہ اس پبلشنگ ہاؤس کا ڈس پلے سینٹر تھا اور اندر ان کا شان دار آفس، اور منور حسین صاحب اسے آفس میں ہی مل گئے۔اسے آدھا گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔وہ اپنے کسی کلائنٹ سے میٹنگ میں مصروف تھے۔

اورس دوران وہ ان کے آفس اور ڈس پلے ونڈوز میں پڑی انگلش اردو کی خوبصورت آؤٹ لک والی کتابیں اور کتابچے دیکھتی اور پڑھتی رہی سینٹر اور آفس دونوں کا ماحول خاصا متاثر کن تھا۔ملک کے مشہور ترین مصنفین کی کتابیں ایسی بک ہاؤس سے کئی سالوں سے مسلسل پبلش ہورہی تھیں۔

"بلکہ لاسٹ ویک ہمارے سیکرٹری نے آپ کے گھر فون بھی کیا تھا۔کوئی ملازمہ خاتون تھیں شاید وہ بات کو سمجھ نہیں سکیں۔انہوں نے پوری بات سنے بغیر فون رکھ دیا تو ہم نے یہی سوچا کہ کچھ دن اور انتظار کر کے پھر رابطے کی کوشش کریں گے، اور اب آپ ان کی موت کی خبر سنا رہی ہیں۔بہت دکھ ہوا سن کر، بہت زیادہ......"

اس نے سب سے پہلے منور حسین صاحب کے سامنے ان کے ہاتھ کا لکھا خط ہی رکھا تھا۔

انہوں نے کولڈ ڈرنک یا چائے کا پوچھا، اس نے منع کردیا۔

"اب پھر آگے کیا ارادے ہیں؟" تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد وہ اصل مقصد کی طرف آئی۔

"دیکھ چکا ہوں میں ان کا پہلا مسودہ۔ٹھیک ہے۔دلچسپ بھی ہے پر ایسا ہے کہ آج کل مارکیٹ میں یوں بھی بے تحاشا سفرنامے آچکے ہیں ہر ملک ہر شہر سے متعلق جو شخص آ گرے، بھی پھر آتا ہے آکر ایک مبالغے سے بھرپور سفرنامہ لکھ مارتا ہے اور پبلشرز نے بھی روزی کمانی ہے وہ بھی شائع کردیتے ہیں۔

یہ سفرنامے بھی نئے ہیں نہ ان کا کوئی اچھوتا انداز تحریر ہے مگر ایک عورت کے پوائنٹ آف ویو سے کہ کس طرح اس کی Asesthetcsense (حسن جمال) مناظر کو دیکھتی اور Conceive (اخذ) کرتی ہے پھر ایک عورت ہونے کے باعث ہر ملک کے کھانوں اور ان کے کچن سے متعلقہ کٹلری میں دلچسپی اور ان کا ذکر بڑے دلچسپ اور واضح انداز میں کرنا یقیناً نیا پن ہے

اس میں اور دوسرے روایتی سفرناموں سے ذرا ہٹ کے بھی۔مگر اس کے باوجود کہ میں ایک زمانے سے اس فیلڈ میں ہوں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں معمولی اور عام سی لگتی ہیں جبکہ ریڈر کو وہ غیر معمولی اور خاص لگتی ہیں۔کچھ کتابیں ہم اتنے جوش اور ولولے سے شائع کرتے ہیں کہ مارکیٹ میں آتے ہی یہ ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی لیکن ہماری امیدوں کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔" وہ رکے چشمہ ہاتھ میں لے کر گھمانے لگے۔

"اور جن چیزوں کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں شاید شائع کر کے ہم رسک لے رہے ہیں، وہ یا تو فوراً یا پھر کچھ ٹائم ٹیکنگ ثابت ہوتی ہیں کہ رفتہ رفتہ مقبول عام ہوتی جاتی ہیں یا پھر بالکل ہی بیٹھ جاتی ہیں سو ان سفرناموں کے متعلق بھی میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا مارکیٹ رسپانس کیسا ہوگا۔" اس کا جی چاہا جملہ ختم ہونے سے بیشتر اٹھ کر بھاگ جائے۔وہ کس فضول بک بک میں پڑ گئی ہے۔اسے یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے آخر؟ وہ دل میں جھلاتے ہوئے اٹھنے کو تھی۔

"پھر بھی چونکہ میں آپ کی مرحومہ والدہ سے وعدہ کر چکا ہوں تو کم از کم ایک بار ان کتابوں کو ضرور شائع کروں گا۔پہلے ایک کتاب اور اس کے بعد ذرا وقفے سے دو اور پھر باقی کی دو اس میں آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا، دو چار ماہ بھی لگ سکتے ہیں اور سال بھر سے کچھ زیادہ بھی اور ان شاء اللہ ہم آپ کو ان کی پے منٹ ان کی پرائس کے حساب سے ٹھیک ٹھاک کریں گے۔کم از کم مارکیٹ ریٹ سے زیادہ۔چاہیں تو آپ مارکیٹ جا کر چیک کرلیں۔"

وہ اب خالصتاً کاروباری انداز میں کہہ رہے تھے۔

"اب مجھے کب آنا ہوگا" وہ قدرے اکتاہٹ بھرے انداز میں بولی۔

"میں ہفتہ دس دن میں آپ کو کال کروں گا، ان کا مطالعہ کر کے پھر آپ کو آکر ایک کنٹریکٹ سائن کرنا پڑے گا کہ ہم کتنے عرصے کے لیے ان کتابوں کے رائٹس لینا چاہتے ہیں۔"

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اوکے۔میں آپ کی کال کا ویٹ کروں گی۔گڈ بائے۔" اگلی کوئی بھی بات کہے بغیر وہ چاروں ڈائریاں اسی ٹیبل پر چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

"یہ زندگی بھی کیا گورکھ دھندا ہے اور اس کے اسباب کی خاطر کیا دوڑ دھوپ لگی ہے۔"

گلاسز کے پیچھے سے چندھیانے والی روشنی اور سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک اور لوگوں کو دیکھ کر اس نے سوچا۔

اور ایسے کیوں ہوتا ہے ہم زندگی کو اس عینک سے دیکھتے ہیں جو ہماری اپنی آنکھوں پر چڑھی ہے۔

ہمیں دکھ ملے تو ہمیں دوسروں کے درد کا احساس ہوتا ہے اور اگر ہمیں ساری زندگی ایک بھی کانٹا نہ چبھے تو ہم یونہی دوسروں کی تکلیفوں سے انجان اس دنیا سے گزر جائیں۔ اندھے اور بہرے بن کر، وہ بالکل غائب دماغی کے عالم میں تھی۔ اس شور میں اسے سیل فون کی مسلسل بجتی ٹون بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

''ہائے!'' وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی، سامنے بیٹھے گولڈی، بنٹی، للی اور فواد نے ایک ساتھ کہا۔ عینی اس کے عقب میں پڑے تنہا صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس لیے فوری طور پر اس کے نوٹس میں نہ آسکی۔

''ہائے۔'' اس نے دانت کچکچائے ہوئے لبوں میں کہا۔

''اب ان لوگوں سے فضول کی کرٹسی نبھاؤ۔'' اسے کوفت نے آن گھیرا۔

''تمہاری آنٹ تو فرما رہی ہیں۔ آج تمہاری مہندی ہے اور تم تو ٹام بوائے بنی پھر رہی ہو۔ یہ چکر کیا ہے اور تمہاری دم کہاں ہے؟'' بنٹی آنکھوں میں تمسخرانہ شوخی اور لہجے میں طنز لیے بظاہر بڑے اخلاق سے بولی تھی۔

''میری دمیں۔'' وہ رکی ایک جتاتی نگاہ ان چاروں پر ڈالی۔

''وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ تم کس دم کی بات کر رہی ہو؟'' وہ عین بنٹی کے سامنے اور عینی کے ساتھ پڑے صوفے پر جا بیٹھی۔

''طنز کر رہی ہو۔'' فواد نے قدرے دکھی سا ہو کر کہا۔

''نہیں۔ حقیقت بیان کر رہی ہوں اور فواد ڈیئر! ہم نے پڑھ تو رکھا ہے کہ حقیقت ہمیشہ دکھ دیتی ہے اور اس کسوٹی کو پرکھا اب جا رہا ہے۔''

''تمہیں ہوا کیا ہے؟ کسی نے تمہیں ہرٹ کیا ہے؟'' للی بے ساختہ اس کی ہمدردی میں بولی۔

''نہیں کسی نے مجھے ہرٹ نہیں کیا۔ ڈیئر! میں خود ہرٹ ہوئی ہوں۔'' اسے للی کی بات پر رونا سا آنے لگا تھا۔

''اچھا فضول باتیں نہیں ہم تو سمجھے تم اپنے فیانسی کے ساتھ لمبی چوڑی شاپنگ پر نکلی ہو گی اور ہم یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو جائیں گے۔'' گولڈی چمکتی نگاہوں اور اس بے نیازی سی ٹون میں بولا جس میں وہ آج کل اس سے بات کر رہا تھا۔

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' وہ بے چین سے لہجے میں بے اختیار بولی۔

''کیا شاپنگ یا ہمارا بوڑھا ہونا؟'' بنٹی نے فوراً اس کی بے چینی پر کہا۔

''دونوں باتیں۔ ہے نا ایما!'' فواد نے جلدی سے اپنے طور پر جواب دیا۔ ''یار میں ان سب کو تمہارے اس شاہکار سے ملوانے کے لیے لایا ہوں اور تم نخرے دکھا رہی ہو۔ بلواؤ اسے کال کر کے۔'' گولڈی اس کے ست سے انداز پر قدرے جھلا کر بولا۔ یوں بھی اسے ہر کام کی جلدی ہوتی تھی۔

''بھئی شاہکار یونہی تو منظر عام پر نہیں آتے محض ایک کال کر دینے سے یونو شاہکار کا تو سالوں بلکہ صدیوں تک انتظار کیا جاتا ہے۔ کیوں عینی ڈیئر۔'' اسے بیزار سی عینی کو مخاطب کر کے اس لاحاصل بحث میں گھسیٹنے پر انوکھا سا لطف آیا۔

عینی نے فقط ناک چڑھا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔

''ماشاءاللہ ایسی بھی توپ چیز نہیں ہے یونہی سے تھے حضرت، جیسے عام سے نوجوان آج کل سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ بھی کسی سستی کمپنی کی پراڈکٹ متعارف کرانے لوگوں کے آگے پیچھے پھرتے منتیں کرتے سر سر پلیز ایک بار آزما کر دیکھیں۔''

اسے یاد نہیں تھا کہ اس کے اور گولڈی کے درمیان کبھی حسد و رقابت یا کسی قسم کے مفاد کا رشتہ رہا ہو مگر ان چار ہفتوں میں کس طرح دونوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب جب بھی بولنا ہے ایک دوسرے کے خلاف ہی بولنا ہے۔

''سچ کہا تم نے ......'' ایما ایک گہرا سانس لے کر سیدھی ہوئی تو گولڈی کے عام سے چہرے پر کیسی چمکتی فاتحانہ سی خاص مسکراہٹ ابھری تھی۔ ''میں بھی پہلی نظر میں عینی کو دیکھ کر یہی سمجھی تھی جو ڈور ٹو ڈور اینڈ شاپ ٹو شاپ سرف صابن، گرم مسالوں کے پیکٹوں کی ایڈورٹائز کرتی۔ بے چاری سی لڑکیاں ہوتی ہیں، ان ہی میں سے تمہاری یہ کزن ہے۔'' وہ ٹانگ جھلاتے مزے لے کر بولی۔ اس کا وار اتنا سخت تھا کہ عینی تو عینی گولڈی اور بنٹی بھی اپنی نشستوں سے یوں اچھلے جیسے ان کے نیچے اسپرنگ لگے ہوں۔

''اسی لیے تو تم اسے اپنی دم بنائے ہر جگہ ساتھ لیے پھرتے ہو کہیں لوگ سچ مچ رُک کر اس بے چاری عام سی صورت والی تمہاری فیانسی سے کسی عام سی کمپنی کی گھٹیا پروڈکٹ کی پرائس اور کوالٹی نہ پوچھ بیٹھیں۔''

انہیں یوں اچھلتے دیکھ کر اور تبھی محظوظ ہوتے ہوئے وہ بولتی گئی۔

''شپ اَپ یو شٹ اَپ! یو بچ۔'' عینی کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح بھڑک اٹھا تھا اور عینی کے چہرے سے نکلتی اس انگارے کی شعاعیں لیزر کی سی رفتار کے ساتھ گولڈی اور بنٹی میں منتقل ہوئی تھیں۔

"مائنڈ یور لینگویج۔تم میرے گھر میں کھڑی ہو۔" اس کے دانت بھینچ کر گالی دینے پر ایمن غراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہارے گھر۔" گولڈی غصیلے چہرہ سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"On your home and on you Curse"

(لعنت ہو تم پر اور تمہارے گھر پر) چلو عینی!" اس نے ایک جھٹکے سے عینی کا ہاتھ تھاما اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ باقی تینوں نے بھی اس کی تقلید کرنے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں کی۔

"ایما! یہ تم ہو! مجھے افسوس ہوا ہے۔" فواد اس کے پاس سے گزرتے ہوئے قدرے دکھی لہجے میں کہہ گیا۔ "ذرا تنہائی میں خود کو فیس کرنا۔"

لمحہ بھر میں لاؤنج خالی ہو چکا تھا۔

ان کے قیمتی ملبوسات سے اٹھتی مختلف مسحور کن خوشبوئیں ان کے جانے کے کچھ دیر بعد تک لاؤنج میں اس کے اردگرد چکراتی رہیں اور پھر جیسے مایوس ہو کر وہ بھی رخصت ہو گئیں۔

"اس، یہ کہاں گئے۔ گھنٹے میں تو صابر پیپسی کی بوتلیں لایا اور یہ لوگ۔ کیا اندر گئے۔" خالہ بی کھنکتے گلاسوں اور دو جگوں میں پیپسی کی بوتلیں اور ڈھیروں برف کی ٹکڑیاں ڈالے اندر آتے ہوئے رک گئیں۔

"جی نہیں۔" وہ مڑ کر جانے لگی۔

"تو کہاں گئے؟"

"جہنم میں۔" وہ حلق کے بل چلائی اور اندر کمرے میں بھاگ گئی۔

پھر وہ تین گھنٹے یونہی کمرہ بند کیے پڑی رہی۔

باہر خالہ بی دروازہ پیٹ پیٹ پریشان ہوتی رہیں۔

"اے کہیں کچھ کھا کر تو نہیں پڑ رہیں۔ کون سا اس انہونی شادی سے خوش تھی۔ بلاؤں ساتھ والوں کے نوکروں کو، آ کر دروازہ توڑیں۔ میری اس عمر میں اچھی پریڈ ہو رہی ہے کس آفت میں پھنس گئی۔"

خالہ بی کے اس آخری ارادے نے اسے اٹھ کر دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ وہ اب ذرا بھی سستی کرتی وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا ہی ڈالتیں۔

"اے کیا آفت ٹوٹی ہے جو اس خوشی کے موقع پر اٹوائی کھٹوائی لیے کمرہ بندہ کیے پڑ گئیں۔ کچھ برا لگا؟ کسی نے برا بھلا کہا؟ بندہ منہ سے تو پھوٹے۔ یوں کمرہ بند کر کے پڑ رہنا۔ کیا آدمی دیواروں سے سر پھوڑے اور کتنا ستاؤ گی مجھے۔"

خالہ بی اندر آ کر پھٹتے ہوئے رو ہی پڑیں۔

"پلیز خالہ بی! مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میرے سر میں درد ہے پلیز۔" اس نے بے اختیار منت بھرے انداز میں ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ اس کی شکل دیکھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

اس نے سیٹی پر پڑا اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر اس میں سے سیل فون نکالا۔

اکیس مسڈ کالز تھیں، اور اکیس کی اکیس شہریار کی۔ وہ حلق تک بیزار ہو گئی۔

یوں اپنی کم نصیبی کا بدلہ دوستوں سے لینا درست ہے بھلا۔ جو میں نے کیا اور عینی سے بھلا مجھے کیا کدورت ہے؟ اور گولڈی ...... کیا واقعی میں اس سے کسی اہم رشتہ جوڑنے کی متمنی تھی؟

اس نے اپنے دل میں جھانکتے ہوئے خود سے پوچھا۔

دل کا جواب بھرپور نفی میں تھا۔

پھر میں ان لوگوں سے کیوں خفا ہوں! بات بات پر انہیں ٹیز کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنی پرابلمز کا ذمہ دار کیا میں انہیں سمجھتی ہوں؟

دل کا دوسرا جواب بھی بھرپور نفی میں تھا۔

کیونکہ وہ میرے ساتھ ایسے کر رہے ہیں۔ اس کے بجھے ہوئے دل سے تھکی آواز آئی۔

"وہ میرے ساتھ جو بھی کریں، مجھے کسی کو ہرٹ کرنے کا حق نہیں۔ خامشی سے الگ ہٹ جانا اور بات ہے یوں ناراض کر کے کسی کو نکال دینا اور بات!"

وہ خود کو سمجھاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

مجھے یوں ان کو ناراض نہیں کرنا چاہیے تھا خاص طور پر گولڈی اور عینی کو، اور گولڈی تو ...... اس نے ہر قدم، ہر ٹینشن میں میرا ساتھ دیا ہے اور میں اس کی منگنی عینی سے ہوتے ہی خواہ مخواہ کی دشمنی پال کر بیٹھ گئی ہوں۔

اس نے بے اختیار (سوری) لکھا اور گولڈی کے نمبر پر سینڈ کر دیا۔

کتنی دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے وقفے وقفے سے تین بار اور یہ مختصر سا میسج سینڈ کیا۔

"سوری ایکسیپٹڈ ...... اپنے اس خفیہ گوشے میں پہنچو میں وہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ایگزیکٹ سکس او کلاک گولڈی۔"

"ہرا!" وہ بلند آواز میں نعرہ لگاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے پاس تیار ہونے کے لیے اور اس گوشہ عافیت میں پہنچنے کے لیے فقط پچپن منٹ تھے۔

مغرب میں ڈوبتا سورج کا گول تھال ان کی حالت پر کھلکھلا کر ہنستا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں یاد رہا کہ مجھے یہ پسند ہے۔" وہ حیرت آمیز خوشی اور بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولی۔

"لو یہ سب مجھے نہیں یاد ہوگا تو، کیا تمہارے اس جمعہ جمعہ آٹھ دن کے منگیتر کو یاد ہوگا۔" گولڈی مزے سے ہرے ہرے گچھوں میں لگے موٹے موٹے لیچی کے دانے توڑ کر اسے تھماتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں واہگہ بارڈر کے راستے میں آنے والی نہر بی آر بی کے اس تنہا اکیلے درختوں میں چھپے قدرے الگ تھلگ سے گوشے میں جینز کے پائنچے پنڈلیوں تک فولڈ کیے ٹھنڈے ٹھار پانیوں میں پیر ڈبوئے بیٹھے تھے۔

یہ گوشہ ان دونوں کی مشترکہ دریافت تھا اگرچہ اس دریافت کا سہرا ان کی گاڑی کی خرابی کے سر بندھتا تھا جو عین درختوں کے اس جھنڈ سے پرے سڑک سے اتر کر کچے میں خراب ہوئی تھی۔

پھر تو جب بھی ان دونوں کا فقط ایک دوسرے کی کمپنی میں انجوائے کرنے کا موڈ ہوتا تو چپکے سے ادھر آنکلتے۔

نہر کا منہ یہاں سے کھلا تھا اور نہر کی طرف اترتی ڈھلوان خوب پھسلنے والی Curve Shape میں تھی جس کی وجہ سے اس جگہ من چلے بھی کم ہی رخ کرتے تھے۔ خود وہ دونوں بھی خوب دھیان سے قدم جماتے اترتے تھے ایک دوسرے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے اور پھسلنے کے بعد ڈوب جانے کا خوف دونوں کو یوں بھی نہیں تھا کہ دونوں ہی بہترین تیراک تھے، سوئمنگ میں میڈل ہولڈر۔

"اور پتا ہے میں نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔" گولڈی نے باہر سے ہری اندر سے خوب پکی رسیلی لیچی کا چھلکا اتار کر گٹھلی سمیت اس کے کھلے منہ میں ڈال دی تو تیز تیز منہ چلاتے ہوئے گٹھلی پانی میں پھینک کر اس نے گویا اطلاع دی۔

"تم جیسی بد اخلاق ال مینرڈ لڑکی کے ساتھ یہی ہونا چاہیے اور یہ میری بیڈ لک اور تمہاری گڈ لک ہے جو تمہیں مجھ جیسا اچھا دوست ملا۔" اس نے دوسری لیچی چھیل کر اس کے منہ میں رکھ دی اور پانی میں اپنی دودھیا تنی پنڈلیاں ہلاتے ہوئے خوب مزے لے کر کھانے لگی۔

"یو آر رائٹ بلکہ اس وقت تم جو بھی کہو گے۔ تم حق پر ہو گے۔" وہ سر دھننے والے انداز میں بولی تو گولڈی نے اس کے کندھے پر دھپ لگا دی اور سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ کتنا آگے تک پھسلتی چلی گئی اور اس کے منہ سے نکلنے والی۔ بے اختیار چیخ نے سڑک سے گزرتی سست رفتار گاڑی کو بے اختیار رکنے اور درختوں کے اس جھنڈ کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔

"بہت کمینے ہو تم۔ گھٹیا بے ہودہ۔ ابھی گر جاتی میں۔ اپنی کمینگی دکھا دی نا تم نے۔" اسے یہ دقت گولڈی نے پوری قوت سے کھینچ کر اوپر کیا تھا اس کے اپنے گرد جکڑے بازوؤں کے حلقے سے نکلتے ہوئے اڑے اڑے حواس کو بحال کرتے ہوئے وہ بلند آواز میں بولتی گئی۔

"ابھی تم نے میری کمینگی دیکھی کہاں ہے۔ کہو تو دکھا دوں۔" گولڈی نے جھٹکے سے اسے بازوؤں میں لے کر ایک دم سے چھوڑ دیا اور وہ جو سنبھلنے جا رہی تھی، بے اختیار اس کی شرٹ کے کالر کو کھینچتی اس سے لپٹ گئی۔

اور درختوں کے پیچھے آتے شہریار کے قدم وہیں پتھر ہو کر رہ گئے اس کی آنکھیں یہ کون سا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اس نے بے یقینی سے آنکھیں جھپکائیں۔ منظر اسی طرح موجود تھا!

☆☆☆

"کیا میں یہ درست کر رہا ہوں جو کرنے جا رہا ہوں؟

اسے جو کئی راتوں سے اس رات کے خیال سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں آنے والی یہ رات کیسی خوشیوں بھری ہوگی۔ کیسے اس کے دل کی مرادوں کو پورا کرنے والے دن کا سورج اپنے دامن میں چھپا کر لائے گی اور اسے اس رات تو کم از کم نیند نہیں آئے گی۔"

اور نیند اسے واقعی نہیں آ رہی تھی۔ خوشی کی وجہ سے نہیں شام کے ان آخری لمحات میں دیکھے جانے والے اس منظر کے نتیجے میں جنم لینے والے خدشوں اور وسوسوں کے باعث معلوم نہیں کیسی خطرے کی گھنٹی اس کے اندر شام سے بجے جا رہی تھی۔ اس کے اندر شور کرتی وہ گھنٹی بار بار آخری کوشش کے طور پر اسے بھاگ جانے فرار ہو جانے پر اکسائے جا رہی تھی۔

آخری موقع آخری لمحے تک موجود ہوتا ہے اور وہ آخری لمحہ ...... شاید یہی تو ہے۔

اسے بے اختیار لاطینی کے یہ دو الفاظ یاد آئے جو Marlow کے تھے۔ Home fuge Dr.fastis میں ڈاکٹر فاسٹس بالکل آخری لمحات میں اپنی روح شیطان کے ہاتھوں بیچنے سے پہلے خود سے کہتا ہے۔ Home fuge (بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ!)

"کیا اب بھاگنا ممکن ہے؟" اس نے تھک کر وحشت بھرے انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

اسے ان لمحات میں ڈاکٹر فاسٹس کی یاد نے ایک دم سے اپنی حالت کو عین اس جیسا محسوس کرنا شروع کر دیا جیسے گم ہوئی صدیوں کا وہی ڈاکٹر فاسٹس ہے جو چوبیس سال نہ ختم ہونے والے عیش و عشرت، خواہشات کے حصول ناممکنات کو ممکن بنانے کی خاطر اپنا آپ، اپنی روح جسے اس نے علم کی روشنی سے بالیدہ کیا تھا خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خون سے لکھ کر شیطان کے ہاتھوں

بیچ رہا ہے۔

مگر۔ میں تو کوئی اتنا سنگین سودا نہیں کر رہا خدانخواستہ خود کو۔ اپنی روح کو اپنے ایمان کو تو فروخت نہیں کر رہا، صرف تھوڑی سی خوشی، تھوڑی سی دولت، تھوڑی سی آسائش ...... اگر آپ کو کسی شارٹ کٹ کے ذریعے مل رہی ہے تو اسے پا لینے میں کوئی حرج بھی نہیں اور آج کل۔ آج کل یہی سب تو ہو رہا ہے اردگرد ہر طرف۔ تو کیا وہ سب امیر لڑکیوں سے شادی کرنے والے ڈاکٹر فاسٹس بن جاتے ہیں لاحول ولا قوۃ۔ اس نے لبوں میں بڑبڑا کر جیسے خود اپنے خیالات کی تردید کی۔

اس کے اندر چھائی دھند چھٹنے لگی۔

اصل خطرہ یہ نہیں تھا۔ چھٹتی ہوئی دھند اٹھلا کر مسکرائی اور ہاتھ اٹھا کر اسے ایک بار پھر متنبہ کرنے لگی۔

اگر یہ رسک لے کر بھی وہ تھوڑی سی خوشی، وہ ذرا سا عیش، وہ معمولی سی برتری نہ مل سکی تو......

اور جس طرح وہ اپنے دوست کے ساتھ ...... اور یہ تو اس کلاس میں معمول کی باتیں ہیں۔ معیوب نہیں ...... مجھے میرا مقصد بھی نہ مل سکے اور یہ مفت کی اذیت میری جان کو لگ جائے تو ......تو بھی اس کا حل موجود ہے۔

تھوڑا بہت فائدہ جتنا ممکن ہو سکا حاصل کریں گے اور لات مار دیں گے اللہ اللہ خیر صلا۔

ادھر کون سا دل وجگر ٹکٹکی پر باندھ رکھا ہے محبت ہی تو ہے‘ یوں یوں فارغ کر دیں گے اس محبت کو‘ اس نے زور زور سے دو چٹکیاں بجائیں۔

اور اس کے اندر چھایا سارا غبار کہیں نامعلوم سمتوں میں روپوش ہو گیا اور ٹناٹن خطرے کا گھنٹا بھی کہیں سر نیہوڑا کر پڑ گیا۔

میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایسا ایک منظر تو کیا ہزاروں مناظر دیکھ کر باآسانی آنکھیں بند کر سکتا ہوں۔ سو شہریار میاں! دل کو سینے سے نکال کر کسی لاکر میں رکھ دو۔ نہ یہ سینے میں ہوگا نہ خواہ مخواہ کی ڈسٹربنس پیدا کرے گا۔

اور جو ایمن بی بی کو ہم جیسے ہینڈسم ہم سفر کا ساتھ مل گیا تو یہ گولڈی جیسے خواجہ سرا خود ہی دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ اس معاملے میں مجھے خواہ مخواہ پوزیسو ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج کی رات کے حوالے سے خوشیوں کے جتنے بھی سہانے سپنے سوچ رکھے تھے۔ ان کو یاد کرنے کا وقت ہے ایسی رات دوبارہ نہیں آئے گی اور یہ خالہ بی نے تو مجھے آفر کی تھی کہ آ کر رات یہیں گزار دوں مجھے ہی اکڑ آئی ہوئی تھی۔ شام کو ان دونوں کو یوں ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر۔ ورنہ اب اچھا بھلا ائیر

کنڈیشنڈ کمرے میں خواب وخرگوش کے مزے لے رہا ہوتا۔ کم سے کم ان منحوس پلے ہوئے مچھروں سے تو جنگ نہ کرنا پڑتی۔ آج سے اس غیرت‘ خودداری اور شرم لحاظ پر بین۔ جو ملتا ہے کھینچ لو۔ بس ایک ہی مقصد۔ وہ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بستر پر لیٹ کر آنے والے دن کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆☆☆

”کہاں سے آ رہی ہو اس وقت؟ ٹائم دیکھا ہے تم نے؟“ وہ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئی خالہ بی جیسے پھٹ پڑیں۔

”خالہ بی کیا ہو گیا ہے۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ شادی تو قید ہے۔ میں نے سوچا آخری شام خوب آزادی سے مزے کر لیے جائیں۔“ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سامنے صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

”تمہیں اس شام‘ اس رات کی اہمیت کا احساس ہے پر کہاں ہوگا اماں باوا نے کچھ بھی تو نہیں بتایا۔ پتا نہیں کس جنگل میں پلی بڑھی ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

وہ نہ جانے کیوں چبھی ہوئی نگاہوں سے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایمن کو خاصا ناگوار سا گزرا۔

”پلیز خالہ بی! آپ سے اس بار کہہ چکی ہوں۔ ماما پاپا کے بارے میں اس طرح مت کہا کریں۔ میں جو ہوں جیسی ہوں بس ٹھیک ہوں۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ روکھے پن سے بولی۔

”ہاں مجھے ضرورت کیا ہے فکر کرنے کی۔ بیچ کی رات ہی تو ہے۔ وہ ایک قدم سر جھٹک کر بولیں۔ ”ویسے پوچھ سکتی ہوں آ کہاں سے رہی ہو۔ اپنا فون بھی شاید تم نے بند کر رکھا تھا۔ پہلے شہریار کا فون آیا کہ وہ آ رہا ہے میں نے کہا کہ تم گھر میں نہیں ہو۔ تمہیں فون کر کے ساتھ لے آئے تو وہ تمہارا نمبر ملاتا رہا کئی بار۔ آخر تھک کر اس نے کہہ دیا کہ تم سے تو بات نہیں ہو سکی۔ وہ نہیں آ سکے گا۔ کیسا بجھا ہوا انداز تھا اس کا میرا تو دل ہی ڈوب گیا اوپر سے تم غائب۔ بی بی! ......کچھ مجھے بھی بتا کے جایا کرو۔ کس چکر میں کہاں جاتی ہو۔ میں بھی ذرا اپنے جی کو سنبھالے رکھوں۔“

وہ بولیں تو بولتی چلی گئیں ان کے انداز بھی اچھے خاصے اکھڑے ہوئے تھے جیسے بات ختم کرتے ہی چل دیں گی۔ ایمن کو احساس ہوا کہ ان کی ”آج تمہاری مہندی ہے“ کی رٹ میں ان کی کیسی خوشی تھی جو اس نے فضول اِدھر اُدھر پھر کر ان سے چھین لی تو ان کے یہ اکھڑے انداز بےجا تو نہیں۔

”وہ خفا ہو کر گئے تھے انہیں کو منانے گئی تھی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

کون وہ موا گولڈی؟“ وہ ایک قدم چونک کر بولیں تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرے خدا لڑکی! تجھے کوئی شرم حیا ہے۔ شادی سے ایک رات پہلے جو یوں غیر مردوں کے ساتھ اکیلے میں۔ اکیلے میں ملی تھیں نا اس سے؟" وہ تیزی سے بولیں اور نہ جانے کیسے اس کا سر ایک بار پھر اثبات میں ہل گیا۔

"کوئی خیال نہیں تمہیں۔ محرم نامحرم کا احساس تو ماں باپ نے دلایا نہیں اب ہی کچھ سوچ لیتیں چند گھنٹے ہی ہیں تو میں صبر کرلوں۔ یوں اس زنانے مرد سے اکیلے ملنے...... بی بی!...... آگ کا کھیل ہوتا ہے یہ۔ تم بچہ بنی اس آگ سے کھیلنے جا رہی ہو۔ لگ گئی نا دامن کو تو دنیا کے سمندر بھی اس آگ کی جلن کو نہ مٹا سکیں گے۔ تنہائی میں ایک مرد ایک عورت اور تیسرا ان کا ساتھی شیطان۔ آگ لگنے میں پھر کیا کسر رہ جاتی ہے۔ اسی...... اسی سے بچانے کے لیے تو سو جتن کیے اور شادی کی نوبت آئی کہ یوں اکیلی ماری ماری پھرو گی تو اس آگ کی لپٹ میں آ کر ہی رہو گی سمجھ عقل تو ہے نہیں تمہیں ذرا بھی...... اس کے باوجود......"

اس آگ میں وہ آتے آتے تو بچی ان کی باتیں سمجھ میں نہ آنے کے باوجود ان باتوں کا سارا مفہوم اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

جب گولڈی نے اسے دھکا دیا اور پھر وہ اس کی شرٹ کے کالر سے چمٹ کر سنبھلی اور دوسری بار اس نے شرارت میں پھر اسے گرانا چاہا اور...... اور...... اس آگ کے شرارے کیسے اس کے چار جانب اڑے تھے اور گولڈی...... وہ تو جیسے پاگل ہو گیا تھا وہ خود کو اس کے حصار سے نکال نہیں پا رہی تھی...... اور ہاں وہ آگ ہی تو تھی جو اسے ان کمزور لمحات میں جلانے جا رہی تھی۔

اور اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سے...... وہ دونوں ان کمزور بے خود لمحات کے حصار سے نکلے تھے...... گولڈی نہیں صرف وہ...... اور وہ کیسے دیوانہ وار اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکل کر گرتی پڑتی پھسلتی اس تاریک جھنڈ سے باہر نکلی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے خالہ بی کی طرف دیکھا۔

"اگر میں انہیں یہ سب بتا دوں تو یہ کبھی نہیں مانیں گی کہ میں واقعی بچ آئی ہوں۔ اس آگ کی لپٹوں سے، اس کے خوفناک شعلوں سے۔"

وہ گولڈی سے ناراض ہو گئی تھی اور وہ اسے منانے کی خاطر خواہ مخواہ اس سے لپٹے جا رہا تھا اور پہلی بار۔ پہلی بار اسے گولڈی کی اتنی قربت سے وحشت ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے آتی وہ بیئر کی گندی بو اور اس کی نشیلی آنکھیں رال ٹپکاتا منہ لٹکے ہوئے ہونٹ اور وہ اس سے پرے ہٹنے، اسے خود سے دور دھکیلنے کی کوشش میں ہلکان ہو گئی تھی۔

اس نے چور نظروں سے ادھر دیکھا جہاں ابھی خالہ بی بیٹھی تھیں ان کا صوفہ خالی تھا۔

"خالہ بی! آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ میں ہی کم عقل ہوں ضرور اپنا ہی کوئی بڑا نقصان

کروا بیٹھتی...... شاید آج تو آپ کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا ورنہ......" وہ بھیگتی آنکھوں کے ساتھ صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر سوچنے لگی۔

☆☆☆

"شہریار احمد! آپ کو بعوض پانچ لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت حق مہر کے ساتھ ایمن طاہر قبول ہے۔" تیسری بار گہرا سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے لب نہیں ہل سکے تھے۔

یہ "دھاندلی" بھی عین وقت پر خالہ بی نے کی تھی۔ نکاح سے محض پندرہ منٹ پہلے اسے علیحدگی میں لے جا کر کہنے لگیں کہ "ہمارے ہاں حق مہر اسٹیٹس اور رتبے کے مطابق طے کیا جاتا ہے اور ایمن کا اسٹیٹس تمہارے سامنے ہے پھر اس کا جو کچھ بھی ہے، وہ تھوڑی دیر میں تمہارا ہونے والا ہے پھر کاہے کی پریشانی......"

اور وہ اس جال میں پھنس بھی گیا۔

تھوڑا ہچکچا کر متذبذب ہاں نہیں کے بیچ ڈولتے اسے ہامی بھرنی ہی پڑی کہ بہت سوچنے اور غور و خوض کرنے کا ٹائم نہیں تھا۔ مولوی صاحب آ چکے تھے اور اس کے باراتی رضوان سمیت دو ہوسٹل فیلو ایک اس کے باس کے پی اے اور دو دوسرے کولیگ اندر بیٹھے تھے۔ گولڈی اور بنٹی اپنے پیرینٹس کے ساتھ تھے جبکہ دو تین اس کے اور فرینڈز تھے یا ساتھ والے قریشی صاحب اور ان کی مسز تھیں۔

وہ تو پہلے ہی رات بھر کشمکش میں رہا تھا اور اب یہ پانچ لاکھ روپے کا حق مہر...... اس کے پسینے چھوٹنے لگے تھے۔ اس نے اتنی بڑی رقم کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی کجا رسماً ہی سہی کسی دوسرے کو دینے کا اقرار کر لینا۔

اس کے دستخط کرتے ہی سب خالہ بی کو مبارک دینے لگے اور وہ بمشکل اپنے چہرے پر ایک خجل سی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

ایمن سے ایجاب و قبول کا مرحلہ پہلے طے کیا جا چکا تھا۔ "یار! اتنا زیادہ حق مہر وہ بھی تو نے اپنی خوشی سے طے کیا ہے میں پانی کے بڑے بڑے گھونٹ بھی بھروں تو بھی یہ اتنی بڑی ہڈی میرے حلق سے نہیں اتر سکتی۔ تم اتنے دیالو نہ اس جنم میں نہ آئندہ سات سو جنموں میں ہو سکتے ہو اتنا تو مجھے پتا ہے۔"

کم بخت رضوان، مبارک باد دینے کے بہانے اس کے گلے سے کیا لگا۔ پچھلے سات منٹ سے پکتی گرم گرم کھچڑی اپنے دماغ کی اس کے کان میں انڈیل گیا۔

"میری مسز کا اسٹیٹس بھی تو دیکھو۔" اس نے مسکراہٹ اور گہری کرتے ہوئے ذرا اکڑ سے کہا۔

باقی کے لوگ فرداً فرداً اس سے ملتے ہوئے مبارک دینے لگے تو رات سے لے کر اب تک کے وقت کے دوران پہلی بار اس نے گھٹن اور کھچاؤ سے آزاد ایک طمانیت بھرا سانس لیا تھا۔

جو بھی جیسے بھی جس طرح بھی وہ بالآخر اپنی تقدیر خود بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا بالآخر اس شارٹ کٹ کے ذریعے خوابوں کی اس دنیا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا جس نے برسوں سے اس کی نیندوں کو پریشان کر رکھا تھا۔

ایک خوشحال خوشیوں بھری بلکہ نوٹوں سے ہری بھری پُرکشش زندگی کا خواب۔

اس کے بعد وہ جتنی دیر بھی اپنے احباب سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے دلی جذبات' اس کے رنگ رنگ سے پھوٹتی الوہی خوشیوں کی کرنیں اس کے چہرے کی جگمگاہٹ میں اضافہ ہی کرتی رہیں۔ آگے کیا ہونے والا ہے اس خدشے سے بے نیاز!

"مجھے معلوم ہوتا کہ تم اپنی شادی کے دن اتنی حسین لگو گی تو خدا کی قسم! میں عینی پر دو حرف بھیج کر صرف تمہاری ہی تمنا کرتا......"

معلوم نہیں کس وقت گولڈی اس کی سہیلیوں کے بیچ میں سے رستہ بنا کر یوں اس کے پہلو سے جڑ کر بیٹھ گیا تھا کہ وہ ذرا سا بھی کسمساتی یا اپنا توازن بگاڑتی تو اس کی آغوش میں ہی گر جاتی۔

اس نے ناگواری سے تھوڑا سا پرے کھسکنا چاہا۔ دوسری طرف للّی گولڈی کے اسٹائل میں اس سے جڑی بیٹھی تھی اور وہ مسلسل اس کے کان میں گھسا بدبودار بھبھوکوں کے ساتھ اپنے دل کی حسرتیں بیان کر رہا تھا۔

"للّی پلیز...... ذرا خالہ بی کو تو بلانا۔" اس نے للّی کو ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھاتے ہوئے کہا اور جیسے ہی للّی وہاں سے اٹھی وہ ایک جھٹکے سے اس کی جگہ پر بیٹھ گئی اور اس کی اس پھرتی کے نتیجے میں گولڈی اس کے زانو پر کہنی کے سہارے ٹکا تھا۔

"اُفوہ! اس لڑکے کا دیوانہ پن دیکھو ذرا۔ ابھی جو ادھر عینی ہوتی تو۔ شکر کرو وہ کل رات دبئی چلی گئی......"

بنٹی نے گولڈی کو اس والہانہ انداز میں ایمن کے زانو پر ٹھوڑی جما کے اسے تکتے دیکھ کر سب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت خالہ بی اندر داخل ہوئیں جب گولڈی اسی اسٹائل میں نیم دراز اس کے سجے سنورے چہرے کو حسرت اور ہوس بھری نگاہوں سے بے خود تکے جا رہا تھا۔

"بہن جی! اندر کھانے کے کمرے میں کھانا لگوا دیا گیا ہے۔ چلیں آپ لوگ...... ادھر ہی۔"

خالہ بی نے اندر داخل ہوتے ہی گولڈی کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور ذرا روکھے لہجے

میں گولڈی کی ماں اور دوسرے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اوں۔ کھانا کھانے کا تو ٹائم نہیں ہے۔ ہمارے گھر خود گیسٹ آنے والے ہیں یہ تو بس ایما کی خاطر آنا پڑا۔ ہمیں پیاری جو بہت ہے کھانا پھر سہی۔ بنٹی! میرے خیال میں چلنا چاہیے۔"

ان کی ممی نزاکت سے اپنی قیمتی ساڑھی اور نیم برہنہ بلاؤز دکھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ خالہ بی نے ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے بے اختیار دل میں لاحول پڑھا۔

"چلو بچے! تم ہی اٹھ کر کھا لو اور ذرا طریقے سے بیٹھ جاؤ۔ اچھا نہیں لگتا اس طرح۔"

پتا نہیں کتنے خون کے گھونٹ پی کر انہوں نے اس نمونے کو مخاطب کیا تھا جس کا ذکر ان کے منہ پر کبھی اچھے الفاظ میں نہیں آیا تھا۔

"سوری آنٹی! مجھے تو بھوک نہیں۔ یہ تھوڑا سا وقت ہے۔ میں ایما سے اپنے دل کی بات تو کر لوں۔" وہ نظروں کا فوکس ایمن کے چہرے سے ہٹائے بغیر وارفتگی سے اسے تکتے ہوئے بولا تو خالہ بی کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"دولہا کو ادھر لا رہے ہیں۔ تم اپنے دل کی باتوں کو دل ہی میں کوئی گڑھا کھود کر دفن کر دو اٹھو یہاں سے۔" اب کے انہوں نے بنا کسی لحاظ کے اس کی آستین کھینچتے ہوئے باقاعدہ اٹھایا تو وہ بدمزہ سا ہو کر سیدھا ہوا۔

بنٹی اور اس کی ماں نے گولڈی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے نکل گئیں۔

☆☆☆

"ایمن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا تم...... میرے خوابوں کی رانی نہیں بلکہ وہ جو میں ہر وقت گنگنایا کرتا تھا۔ میرے سپنوں کی رانی کب آئے تو' یونہی...... میری زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے یہی ایک گانا میرے لبوں پر رہتا تھا۔" وہ گولڈی والے اسٹائل میں اس کی طرف نیم دراز کہنی کے بل لیٹا اپنے دل کا حال بیان کر رہا تھا۔

"اور مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ اچانک اس طرح سے دن رات یہی دہراتے سچ مچ میرے سپنوں کی رانی میرے سامنے آ کھڑی ہو گی۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی نہ جانے کیوں میرا دل تمہارا اسیر ہو گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا وہ شام جب تم نے مجھے اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور یار! وہ کیا نزاکت تھی ٹام بوائے جیسی۔ میرا نوٹ اکلوتا نوٹ اپنے جاگر کے نیچے دبانے کی...... ایڈونچر تو جیسے تمہاری رگ رگ میں ہے ویسے سچ کہو یہ شادی یہ ملن یہ گھڑیاں بھی تمہارے کسی ایڈونچر کا حصہ تو نہیں۔" اس نے ایمن کی نازک کلائی کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے اپنی طرف کھینچا اس کا خوشبوؤں

بھرا سراپا اور مدہوش کرتا قیاس خیز حسن‘ شہریار کے حواس اپنا ضبط کھونے لگے۔

ایمن جو مسلسل نیچی نگاہیں کیے بیٹھی تھی۔ اس ہلکے سے جھٹکے کی تاب نہ لاسکی اور اگلے ہی پل کسی بے جان مورت کی طرح شہریار پر آ گری۔

’’اف ایسا بھی کیا نشہ دیکھوں تو......‘‘ اس نے ہنستے ہوئے ایمن کو سیدھا کیا۔ خوشبو میں لپٹا لطیف سا بوجھ اپنے شانے سے پرے سرکایا تو وہ پیچھے کی طرف لڑھک گئی۔ ’’ایں......‘‘ اب کے وہ واقعی چونکا۔ ذرا آگے ہو کر دیکھا۔

ایمن جیسے سو رہی تھی اس کی دونوں آنکھیں نیند کی سی حالت میں بند تھیں۔

’’ایمن...... ایمی...... ایما ڈارلنگ! آر یو آل رائٹ؟‘‘ ذرا سا پریشان ہو کر اس نے ایمن کے گال ہولے سے تھپتھپائے مگر اس کی نیند نہ ٹوٹی۔

’’اوہ یہ تو لگتا ہے بے ہوش ہے۔ اس نے ذرا سا جھک کر اس کے دل کی دھڑکنیں اور نبض چیک کرتے ہوئے قیاس کیا۔

’’اب کیا کروں؟‘‘ وہ ذرا پرے ہو کر اسے دیکھتے ہوئے حواس باختہ سا سوچنے لگا۔

’’ایمن! کیا ہوا ہے؟ پلیز آنکھیں تو کھولو۔‘‘ خوشبو کی گٹھڑی بے حس پڑی تھی اور اس کے دل پر کوئی جیسے ہولے ہولے ضرب لگا رہا تھا۔

ایمن کا معصوم حسن اتنا قاتلانہ ہوگا کہ ذرا سا بناؤ سنگھار اسے کیا سے کیا بنا ڈالے گا اور شہریار جو سمجھ رہا تھا وہ ایمن جیسی عام سی لڑکی سے کسی خاص مقصد کے لیے شادی کر رہا ہے اور وہ مقصد کم از کم ’’محبت‘‘ ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ پسندیدگی......

مگر ان فسوں خیز لمحات میں اسے اپنے خیالات اور ترجیحات کا جیسے از سر نو جائزہ لینا پڑ گیا۔

’’ایسے نو خیز قیامت سراپے اور معصوم حسن سے کون پتھر دل متاثر نہیں ہوگا۔ محبت اور پسندیدگی تو بہت معمولی جذبات ہیں۔ ایمن تو کسی عاشق کو مجنوں بنا کر صحرا کی ریت پھانکنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ میرا دل میرا وجود اس لمحے پکار پکار کر اقرار کر رہا ہے آئی لو یو ایمن آئی رئیلی لو یو...... شاید تمہارے بغیر میرا وجود اب کوئی معنی نہ رکھے۔‘‘ وہ یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے وہ اقرار و ایجاب کیے جا رہا تھا جن کے بارے میں اس سارے سلسلے کے دوران اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا......

’’کیا پتا اس رشتے میں اس کی مرضی نہ ہو......؟ کچھ کھا تو نہیں لیا اس نے...... یا پھر یہ واقعی اپنے اس دوست سے جس سے کل شام درختوں کے جھنڈ میں......‘‘

وہ بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا‘ دو قدم چل کر پھر اسے دیکھنے لگا جو اپنے قیامت حسن کو

سجائے یوں تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ جیسے نہ جانے کب کی سوئی ہو۔

’’کیا معلوم ان دونوں کے درمیان کیا ’’چکر‘‘ ہو اور معاملہ کہاں تک پہنچ چکا ہو...... کل ان دونوں کی ’’قربت‘‘ سے مجھے اس پہلو پر بھی تو سوچنا چاہیے تھا اور یہ بے ہوشی اسی ’’چکر‘‘ کا نتیجہ ہو تو میرے ہاتھ کیا آئے گا؟ رسوائی اور یہ شرمندہ سی نو خیز محبت کی موت...... اور یہ تو چاہے مجھے لات مار کر...... اس طرح تو ان پانچ لاکھ روپوں کے حق مہر سے بھی جان چھوٹ جائے گی...... مگر میرا مقصد...... اس کا کیا ہوگا اور یہ...... یہ اتنی خوبصورت شاندار لڑکی جو میری بیوی قسمت سے بن گئی ہے۔ اسے یونہی چھوڑ دوں...... یونہی۔‘‘

’’ایمن! آنکھیں کھولو ایمن! پلیز کچھ کہو تو سہی ایمن!‘‘

آخری کوشش کے طور پر اس نے بے ہوش لیٹی ایمن کے گال تھپکے اور پھر تھک کر اسے دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

’’اوئی اللہ ایسا کیا کہہ ڈالا تم نے میری بچی سے۔ ابھی تو بھلی چنگی تھی‘ ماں صدقے۔‘‘

خالہ جی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے یوں بے سدھ لیٹے دیکھ کر الگ سے دہائی ڈال دی۔ ان کی بات پر شہریار اپنی جگہ کھڑے کھڑے شرمندہ ہوگیا۔ کچھ دیر ہلانے جھنجھوڑنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ پریشان سی ہو کر بولیں۔

’’قریشی صاحب کی بہو ڈاکٹر ہے۔ میں اس کو بلا کر لاتی ہوں اگر رات کے اس پہر وہ آ گئی تو......‘‘ وہ ہراساں سی اس کا جواب سنے بغیر باہر نکل گئیں۔

اس نے آگے بڑھ کر پہلے تو ایمن کو ہلایا۔ اٹھانے کے لیے آوازیں دیں پھر بڑی آہستگی سے اس کے ماتھے پر چمکتا ٹیکا اور جھومر اتارے اور چٹکی والی نازک سی نتھ اتار کر ایک طرف رکھ دی اور خود اس کے پاس ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

’’کچھ بھی نہیں ہوا ہے اسے‘ بے تحاشا کمزوری کے باعث بی پی لو ہوگیا ہے۔ اس کی فاقہ کشی کب سے چل رہی ہے؟‘‘

قریشی صاحب کی بہو ایمن کا چیک اپ کرنے کے بعد سیدھا ہوتے ہوئے بولی خالہ بی نے ’’اللہ تیرا شکر ہے۔‘‘ کا کلمہ ادا کیا جبکہ دروازے کے پاس کھڑے شہریار نے بھی ایک طمانیت بھرا سانس لیا۔

’’ڈاکٹر صاحب! کل سے اس نے کچھ نہیں کھایا بلکہ پرسوں رات سے...... صبح بھی منتیں کیں ناشتے کے نام پر ایک توس لیا نہیں...... دوپہر کو تیاری میں پتا نہیں چلا اور شام کو کئی بار کہا۔ لقمے منہ میں ڈالے ایک نہیں پکڑ رکھی تھی میں نے کیا کرتی ہائے میری بچی!‘‘ خالہ بی نے تڑپ کر

اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"اسے ابھی ہوش آجاتا ہے۔کوئی جوس وغیرہ پلائیں اور تھوڑی دیر بعد کوئی اور لیکوئڈ دیں ......صبح پھر ہلکی پھلکی غذا دیں۔ٹھیک ہو جائے گی۔ ویسے میں انجکشن لگا دیتی ہوں۔ کچھ بہتر فیل کرے گی یہ۔" ڈاکٹر صاحبہ اپنے باکس کا جائزہ لینے لگیں۔

"ڈاکٹر صاحبہ! کوئی اور بات تو نہیں؟" پتانہیں کیسے شہریار کے منہ سے پھسل گیا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"شہریار صاحب! ابھی آپ کی شب عروسی بھی نہیں گزری تو کوئی اور کون سی بات ہو گی بھلا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی تو خالہ بی پہلے تو ناسمجھی سے سنتی رہیں پھر جیسے سمجھ میں آ گیا تو ہنس پڑیں۔شہریار تو اتنا شرمندہ ہوا کہ ایک دم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"وہ جیسا بھی ہے جس طرح کا بھی ہے' مجھے ادھر ہی چل کر رہنا ہے بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

ایک رات پہلے ان کا ولیمہ تھا بلکہ چند گھنٹے قبل ایک مناسب سے ہوٹل میں دو چار دوست شہریار کے تھے اور ان کی فیملیز جبکہ اس نے فواد اور للی کے سوا کسی کو نہیں بلایا تھا۔

اور یہ پہلا موقع تھا کہ خالہ بی نے اسے گولڈی اور بنٹی کو بلانے سے منع کیا اور اس نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔وہ خود اندر سے کتنی محتاط ہو چکی ہے' چاہتے ہوئے بھی خالہ بی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ ڈنر کرتے ہی وہ دونوں چلے آئے تھے اور گھر آتے ہی چینج کرنے کے بعد ایمن نے یہ بحث چھیڑ دی جس سے شہریار آخری دم تک بچنا چاہ رہا تھا۔

"ایمن! کیوں بچوں کی طرح ضد کر رہی یار! وہ گھر نہیں ہے بے حد پسماندہ کھنڈر ہے بلکہ اب تو کرائے دار بھی ادھر رہنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی جانوں کو خطرہ تھا بغیر بتائے خالی کر گئے۔" شہریار نے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے زچ آکر کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ گھر خالی ہے اور......"

"او مائی گاڈ ایمن! وہ گھر نہیں ہے اینٹوں کا ڈھیر ہے اور تمہیں اپنی جان کی پروانہ ہو۔ میری جان ایسی سستی نہیں کہ اسے ملبے کے ڈھیر تلے دفن ہونے کے لیے لے جاؤں۔" وہ قطعیت سے کہتے ہوئے اپنا سلیپنگ سوٹ اٹھائے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

"آج کی رات ادھر ہماری آخری رات ہے یعنی پرسوں صبح خالہ بی جاتے ہوئے اس گھر کی چابیاں قریشی انکل کو دے جائیں گی اور ہمیں کل رات یہاں سے چلے جانا چاہیے گویا شہریار

صاحب کو منانے کے لیے میرے پاس فقط چوبیس گھنٹے ہیں اور میں اس ناممکن کو ممکن بنا کر رہوں گی۔ میرا نام بھی ایمن ہے۔ مجھے خیرات میں دو چار مہینے یا دو چار راتیں نہیں چاہئیں اور جب میں اسے سب کچھ شادی سے پہلے بتا چکی ہوں تو پھر اس طرح ری ایکٹ کرنے کا کیا مطلب؟ میں نے واضح الفاظ میں بتایا تھا کہ یہ گھر اور اس کے علاوہ کوئی لمبا چوڑا بیلنس یا زور و جواہرات کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے تو اس سے بڑھ کر دوٹوک بات اور کیا ہو سکتی ہے پھر یہ حضرت کیوں انجان بنے جا رہے ہیں۔" وہ جلتی کڑھتی اٹھ کر اپنے الماری میں ٹنگے آخری دو سوٹ بھی تہہ کرنے لگی۔

شہریار اندر آیا تو اس کا موڈ آف تھا۔

خامشی سے ہینگر وارڈ روب میں لٹکا کر بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔اس کا خیال تھا ایمن اس کا خراب موڈ دیکھ کر فوراً اپنے رویے میں لچک پیدا کرتے ہوئے ضرور اس کے پاس آئے گی۔ جبکہ وہ بے نیازی بنی کپڑے تہہ کرنے کے بعد انہیں ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔

"میں آپ پر پہلے بھی سب کچھ واضح کر چکی ہوں۔ بار بار صفائیاں پیش نہیں کروں گی اور نہ ڈہراؤں گی۔کل صبح یا دوپہر میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے آپ کو اپنا ضروری سامان جو بھی رکھنا ہو' مجھے بتا دیں ویسے تو آپ کا پیک سامان اسی طرح پڑا ہے دوبارہ پیکنگ کی ضرورت نہیں۔ میں یہ اپنے کپڑے اپنے سوٹ کیس میں رکھ آؤں۔" وہ کہتے ہوئے باہر جانے لگی تھی کہ شہریار نے لپک کر اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی جانب گھما ڈالا۔

"یہ کیا مذاق ہے اور بات سنو میری۔ میں نے تم سے شادی کی ہے۔کوئی ڈیل نہیں جو یہ دھمکیاں اور تڑیاں دی جا رہی ہیں مجھے۔کل رات ......تو رات تم نے بے ہوش ہو کر برباد کر دی اور آج یہ نئی بخ ...... اتنی تو مائی ڈیئر تم معصوم نہیں ہو کہ تمہیں پتا نہ ہو کہ شادی کا کیا مطلب ہے ......" وہ اب اسے ذرا دوسرے طریقے سے ٹریٹ کرنا چاہ رہا تھا۔

قدرت نے بشر کے اندر یہ سب سے بڑی کمزوری رکھی ہے۔ اسے معلوم تھا اور اس "کمزوری" سے کب کوئی بڑا مقصد نکلوانا ہے۔اس کا بھی طریقہ اسے آتا تھا سو ایمن کے بھاگنے کی ساری راہیں مسدود کرتے ہوئے اسے بیڈ تک گھسیٹ ہی لایا۔

"او کے۔ میں اس کا ٹرم کا مطلب سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے کندھے چکا کر بولی۔ "مگر آپ کو بھی میری بات ماننا ہوگی۔کل ہم یہاں سے کس وقت جائیں گے۔ مجھے صرف اتنا بتا دیں۔" وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

"ایمی مائی ڈارلنگ! کیوں مجھے ستا رہی ہو' تڑپا رہی ہو بلکہ شاید میرے تڑپنے کا مزہ لے رہی ہو۔" شہریار نے اسی کمزوری کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے گھمبیر آواز میں کہا اور اسے اپنی

طرف کھینچا۔

''شرط میں بتا چکی ہوں۔ تڑپانے کا مجھے بھی شوق نہیں۔'' اس کی مزاحمت بھرپور تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں شہریار کے بڑھے ہوئے ہاتھ جھٹک کر اٹھ گئی۔ فوری طور پر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ چھینکے ہوئے ہتھیار کو کس طرح دوبارہ استعمال میں لائے۔

''اچھا چلیں۔ یوں کرتے ہیں محض ایڈونچر کے طور پر' آپ کو معلوم ہے نا مجھے ایڈونچر سے کتنا لگاؤ ہے۔ ہم ایڈونچر کے طور پر چند دن وہاں چل کر رہتے ہیں نہ آپ مجھے ضدی ہونے کا الزام دیں گے نہ میں رنجیدہ ہوں گی کہ آپ میری بات نہیں مان رہے۔ کیا خیال ہے؟'' دروازے پر پہنچ کر اس نے نیا آئیڈیا پیش کیا۔

''یہ تو میں یہاں بیٹھا شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم دو ہی منٹ کے بعد اس ایڈونچر سے ہاتھ اٹھا لو گی۔'' شہریار فوراً بولا۔

''او کے پھر آپ کو کیا اعتراض ہے جبکہ آپ کو معلوم ہے۔ میں خود ہی وہاں سے بھاگ آؤں گی۔'' وہ فوراً اسی کی بات کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بولی تو وہ کچھ سوچنے لگا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم جیتیں میں ہارا۔ کل رات کو تمہیں ذرا اس ایڈونچر کا مزہ چکھانے لے جاؤں گا۔ کیا یاد کرو گی تم بھی۔'' وہ رضا مند ہوتے ہوئے بولا۔ ''ریئلی۔ ہرا۔'' اس کی آنکھیں اس کے چہرے کے ساتھ چمک اٹھی تھیں۔

''اب تو آجاؤ' دو گھڑی بیٹھ کر اس غریب کا حال دل ہی سن لو۔'' وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ ''ابھی آتی ہوں۔ پہلے خالہ بی کو یہ خوش خبری سنا آؤں اور کچھ چیزیں ضروری رکھ لوں۔ آپ سوئیے گا نہیں۔ میں بس ابھی آئی۔'' وہ کسی تتلی کی طرح اڑتی ہوئی کھلے دروازہ سے باہر نکل گئی۔

شہریار کوفت بھرے انداز میں اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

''بالکل اینٹیک ہے یہ۔ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا کرے گی اور محترمہ کا سارا ایڈونچر تو کل رات ہی اڑنچھو ہو جائے گا...... اور کل رات...... اور آج۔ کتنا فرق ہو گا...... چل یار شہریار! ...... تھوڑے مزے کر لے ایئرکنڈیشنز کی یہ برفیلی ہوائیں' نرم لچکیلا بیڈ سمندر کی لہروں کا سا یہ قالین اور خوشبو دار فضائیں...... عیش کر لے بھائی! کل کو کس نے دیکھا ہے۔'' وہ خود سے کہتے ہوئے دھپ سے بیڈ پر اوندھا لیٹا آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔

''معلوم نہیں یہ احمق کب واپس آئے گی آ بھی جا...... آ بھی جا...... میرے سپنوں کی رانی کب...... آ تو گئی میرے دسترس میں کب آئے گی کب؟'' وہ لبوں میں بڑبڑاتے ہوئے غنودگی میں

چلا گیا۔

☆☆☆

''احمق ہو تم۔ دو چار ہفتے صبر نہیں ہوتا تھا تم سے دو چار دن ہی سہی...... ایسا کون سا مارشل لاء لگا جا رہا تھا۔ ادھر اس فراڈیے نے نہ جانے کس طرح یہ سب کچھ ہتھیایا ہے۔ دو چار سال بھی رہ لیتیں تو موا چیں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تمہاری خودداری نے یہیں آکر ڈیرے ڈالنے تھے۔ دیکھ ایمن میری بیٹی! میری بات سن ذرا کان لگا کر۔''

وہ بڑی خوشی خوشی خالہ بی کو یہ سب بتانے آئی تھی اور خالہ بی سنتے ہی جیسے متھے سے اکھڑ گئیں تھوڑا غصہ کرنے کے بعد اسے سمجھانے لگیں۔

''ابھی بڑا نازک تعلق ہے تم دونوں کے بیچ نہ تم اس کے مزاج کو سمجھتی ہو نہ تمہیں ٹھیک سے جانتا ہے۔ ابتدا ہے ابھی اس کچے دھاگے کے رشتے کی...... ذرا اور چار ماہ گزر جاتے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے لگتے...... اور کیا پتا اللہ بھی مہربانی کر دیتا......'' وہ رکیں۔

''یعنی چھپر پھاڑ کر دے دیتا دولت......'' وہ ان کی بات پہ فوراً بول اٹھی۔

''ارے نہیں گھامڑ! کیا پتا تم دونوں کے بیچ تیسرے وجود کی آمد کا کوئی سلسلہ بن جاتا۔''

''تیسرا کون یو مین گولڈی...... اس کا دھیان آج کل صرف گولڈی کی حریص فطرت کی طرف ہی چوکنا رہتا تھا۔ فوراً بولی۔

''لعنت اس موئے زنانے پہ۔ ابھی تمہارے دماغ سے نکلا نہیں وہ مردود...... سیدھے لفظوں میں بتاؤں تجھے۔ بے قوف تم دونوں کا کوئی بچہ وچہ آنے والا ہو جاتا تو......''

''ہائے خالہ بی! یہ کیا باتیں کر رہی ہیں آپ......'' خالہ کو امید تو ذرا بھی نہیں تھی کہ اس جیسی چکنے گھڑے پر یہ بات کوئی اثر کرے گی مگر وہ واقعی یکدم سے سرخ پڑ گئی تھی۔

''ہاں تو اور کیا اس رشتے کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے پھر اسے آہستہ آہستہ کھلے لفظوں میں حقیقت بتا کر جو تھوڑا تمہارے اپنے پاس ہے۔ کچھ اس سے لیتیں دونوں مل جل کر مناسب گھر لے لیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ جاب سے وہ لگا ہی ہے اور اچھی اور پرسکون زندگی گزارنے کے لیے کیا چاہیے' میری مانو تو ابھی یہ ہٹ چھوڑ دو۔ وہ خواہ مخواہ بھڑک اٹھے گا۔'' خالہ بی اس کا کندھا دبا دبا کر اسے اپنے تئیں طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''اوہ تو خالہ بی! یہاں تو اس گھر میں میں ایک گھڑی بھی نہیں رکوں گی جو ایک دوسرے کی فطرت کھلنا ہو گی' اسی موڑ پر کھل جائے گی۔ اچھا ہے کسی بچے وچے کی زنجیر تو پیروں میں نہیں ہو گی کہ آدمی مجبور ہو جائے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔ میں شہریار سے یہ بات منوا آئی ہوں

اور آپ کے ڈر کے برخلاف وہ ذرا بھی نہیں بھڑ کے بلکہ مان گئے ہیں کہ ہم چند دن وہاں چل کر رہ سکتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ میں چند دن ساری عمر وہیں رہنے کے لیے جا رہی ہوں وہ اسے مجھ ایسی بگڑی ہوئی امیر زادی کا کوئی ایڈونچر سمجھ رہے ہیں کہ وہاں ٹوٹا پھوٹا گھر دیکھ کر اگلے ہی دن بھاگ آؤں گی پر ایسا نہیں ہو سکتا اور خالہ بی آخری بات ......'' وہ سینے سے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔'' آپ نماز بھی پڑھتی ہیں اور اللہ کا ذکر بھی کرتی ہیں یعنی نیک ہیں۔''

''تو اس میں کیا برائی ہے؟'' خالہ بی برا مان کر بولیں۔

''برائی نہیں اچھائی ہے۔ کہتے ہیں اللہ اپنے ذکر کرنے والوں کی دعا جلدی سنتا ہے تو آپ میرے لیے دعا کیجیے گا اپنے گھر جا کر بھی۔'' ایک بدلی بدلی سی ایمن بولی تھی۔

''کک۔ کیا دعا کروں؟'' وہ اس کی بات پر کچھ ہکلا کر بولیں۔

''کہ اللہ تعالیٰ مجھے ڈھیر ساری طاقت دے۔ آئی مین سٹمنا برداشت کرنے کا کسی بھی مشکل کو سہہ جانے کا۔'' وہ ان کے بوڑھے ابھری ہوئی ہری نیلی نسوں والے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دل گیر لہجے میں بولی۔

''ماں صدقے خالہ بی قربان۔ اللہ نہ کرے میری بچی جو تجھ پر کوئی مشکل آئے یا کبھی تجھے اپنی برداشت سے بڑھ کر کسی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ خالہ بی ہر دم سوتے جاگتے چلتے پھرتے اپنے لبوں سے تیرے لیے دعا کرے گی۔ اللہ نے موقع دیا دنیاداری کے۔ جھنجٹوں سے جان چھڑا کر تجھ سے ملنے آتی رہوں گی۔ میرا اپنا تو سنبھال لیا ہے نا۔''

وہ رندھے ہوئے گلے سے کہتے ہوئے اسے سینے سے لگا کر رو پڑیں تو آنسو اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ اس کا ماما پاپا کے بعد خالہ بی کے سوا اور کون اپنا تھا جسے اس کی حالت کا صحیح علم تھا یا اس سے محض اس کی وجہ سے محبت تھی۔

''بس تم بہادر رہنا ہے جیسے اتنے سارے دنوں سے رہی ہو۔ رونا نہیں' گھبرانا نہیں اور جو مشکلیں پریشانیاں آئیں میری بچی تو وہ آدمی کو کندن ہی بنانے آتی ہیں ان سے پریشان نہیں ہونا۔ خالہ بی ہر پل تیرے لیے دعا کرتی رہے گی۔ چل جا اب شہریار انتظار کر رہا ہو گا کافی رات ہو گئی ہے۔'' انہوں نے زبردستی سے اٹھا کر کھڑا کیا تو وہ چہرہ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

سست قدموں سے چلتی ہوئی وہ اپنے بیڈ روم میں آئی۔

آہستگی سے دروازہ کھولا۔ زیرو پاور کی روشنی میں شہریار بیڈ پر کروٹ کے بل گہری نیند سویا ہوا تھا۔

''یہ تو سو گئے۔ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ میں نے اتنی دیر تو نہیں لگائی'' وہ افسردگی سے

سوچتی ہوئی دھیرے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔

''چلو آج کی رات ہے۔ میں بھی آخری بار اچھی طرح اپنے اس گھر میں چل پھر لوں۔ اس کو آخری بار اچھی طرح محسوس کر لوں جہاں سے مجھے کل ہمیشہ کے لیے چلے جانا ہے۔'' وہ خواب کے سے عالم میں چلتی ہوئی اپنے ماں باپ کے کمرے میں آ گئی۔

اسے لگا جیسے ماما بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے مہین سوتی لباس پہنے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی ہیں اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی پاپا اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ بے اختیار سی ہو کر اندر داخل ہوئی۔

''ماما! پاپا کیوں چھوڑ کر چلے گئے مجھے۔ کیوں؟'' وہ ان کے الوژنز سے لپٹ کر بے اختیار سسکنے لگی۔

☆☆☆

''اچھا خالہ بی! میں نے جو آپ سے بدتمیزیاں کی ہوں۔ انہیں معاف کر دیجیے گا اور میرے لیے دعا کرنا نہ بھولیے گا۔'' وہ جاتے ہوئے' ان سے لپٹ کر بے اختیار کہنے لگی۔

''میری بچی! میری جان! تو نے کیا بدتمیزی کرنی تھی مجھ سے۔ میں ہی ماں ہونے کا حق نہ ادا کر سکی۔ الٹا تجھ معصوم' یتیم و تنہا کا طعنے مار مار کر جی جلاتی رہی۔ ہو سکے تو بوڑھی سٹھیائی ہوئی خالہ کو معاف کر دینا۔'' دونوں ایک دوسرے سے لپٹی گلے شکوے کیے جا رہی تھیں کہ شہریار نے بے زاری سے گاڑی کا ہارن بجایا۔

''اچھا خالہ بی! رات بھی کافی ہو گئی ہے۔ چلتی ہوں۔ صبح آپ جاتے ہوئے چابیاں قریشی صاحب کو دے جائیے گا۔ میں نے فون کر دیا تھا راشد صاحب کے پی اے کو۔ اپنا خیال رکھیے گا اور دونوں سوٹ کیس بھی اپنے ساتھ لے جائیے گا جو میں نے آپ کے لیے تیار کیے ہیں اللہ حافظ۔''

وہ انہیں تاکید کرتی خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ خالہ بی روتے ہوئے افسردگی سے ہاتھ ہلانے لگیں۔ اس نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔ شہریار نے غصے میں گاڑی اسٹارٹ کر دی اور دونوں انجان رستوں کی طرف چل پڑے۔



"اماں! آج استاد نے مجھے بڑا مارا، مار مار کر میرا اور ننھے کا حشر کردیا اور دونوں کو ورکشاپ سے "چھٹا دے" دیا۔ ہم دونوں نے بھی آتے ہوئے لات مار کر بڑا ٹول بکس گرا دیا اور اسے ماں بہن کی پوری سولہ گالیاں بھی دے کر آئے۔"

وہ دیوار پر لگے ٹوٹے ہوئے شیشے جس کی سطح بالکل دھندلا چکی تھی اس کے آگے کھڑا تیل لگے بالوں کو درمیان میں سے مانگ نکال کر دونوں سائیڈوں پر لٹکائے ادھر ادھر جھلا رہا تھا۔

"تیرا ستیاناس سلو! یہ تیری ورکشاپ ہے جو تو ایسے چھوڑ کر آیا ہے کیسی منتوں ترلوں سے اس ممتاز خان نے تجھے رکھا تھا اور کچھ نہیں پندرہ روپے دیہاڑی تو دیتا تھا، پتا تھا جب تجھے کہ شام کو چولہا گھر میں تیرے ان پندرہ روپوں سے جلتا ہے تو...... پرے مرو آج سارے بھوکے نلکے کا پانی پیو اور میری جان کو روتے سوجاؤ۔" زاہدہ باجی جن کا سر پہلے ہی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سر پر پیوند لگے پھٹے پرانے دوپٹے کی پٹی باندھے پہلے ہی کراہ رہی تھیں۔ سلو کا کارنامہ سن کر تو ان کے سر میں درد کی لہریں سی اٹھنے لگیں۔

"اماں! لعنت بھیجو ایسے پندرہ روپوں پر...... کیا آتا تھا ان میں بول۔ ایک کلو آٹا نہیں۔ ایک پاؤ دال نہیں۔ چھٹانک گھی نہیں، پاؤ بھر چینی نہیں اور جو سارا دن میں جوتے، لاتیں، پلگ پانے ڈنڈے سلاخیں کھاتا تھا وہ الگ اور دے ماں بہن کی موٹی موٹی گالیاں وہ الگ۔ ایمان داری سے بولوں ایک ذرا جو اس ممتاز نے مجھے کام سکھایا ہو۔ اتنی مار تو میں نے پچھلے دونوں استادوں سے نہیں کھائی، جتنی اس ب[illegible]تاش نے میری ہڈیاں سینکی ہیں۔ یہ آج مجھے نہ نکالتا تو ایمان سے میں خود دو دن میں لات مار آتا۔" اس نے ٹوٹے ہوئے دندانوں والی میل سے بھری کنگھی سامنے چارپائی پہ بچھے میلے چیکٹ بستر پر اچھالی اور ماں [illegible] آ گیا۔

"یہ دیکھ میری قمیص اٹھا کر جو اس بیٹے نے میرا حال کیا ہے۔" وہ ماں کے سامنے ننگی پیٹھ کر کے جھکا تو ایک بار تو زاہدہ باجی کا دل بھی لرز کر رہ گیا۔ لال لال خون رنگ لکیریں اور کہیں کہیں سے کھال بالکل ہی ادھڑی ہوئی اور ان سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔

"کیسی تکلیف ہو رہی ہوگی ان زخموں میں۔" ماں کا دل رو اٹھا۔

"باقی جسم اب تجھے کیا دکھاؤں بڑا سکھ ہے یہ ممتاز۔ چند سکوں کی خاطر اگلے کا لہو پینے والا ڈریکولا، مردار کھانے والا۔" انہوں نے ہلکا سا ہاتھ ان زخموں پر پھیرا تو وہ کراہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ہوا کیا تھا؟" وہ نم آنکھوں سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"وہی روز کا ڈرامہ۔ شیخ منظور کی گاڑی کا کوئی پرزہ غائب تھا۔ پہلے بکتا رہا کہ میں نے اور ننھے نے چرا کر بیچ آئے ہیں جب ہم انکار کرتے رہے اور سچی بات ہے ہم بھلا کوئی چور ہیں۔ ہم کیوں مانتے...... لالچ دے رہا تھا کمینہ، مان جاؤ دو دن کی دیہاڑی اکٹھی دے دوں گا۔ ہمیں پتا تھا۔ ہمیں پھنسا رہا ہے ذرا جو ہم نے اقرار کیا اس نے مار مار کر ہمارا جو بھرتہ بنانا ہے وہ الگ اس پرزے کے ڈبل پیسے بھی ہم پر ڈال کر اگلے پورے مہینے کی دیہاڑی بھی ہڑپ کر جاتا ہے۔ بس پھر اس کا بھیجا گھوم گیا۔"

وہ زخموں اور ان سے اٹھتی ٹیسوں سے بے پروا ہو کر پھر سے اس دھندلے شیشے کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا جس کی ٹوٹی ہوئی تکون میں پورا چہرہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

"اور تجھے کیا آتا ہے سوائے لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ کے، اب بتا کیا ہوگا۔ ہائے اماں بھوک!" منیا جو بھوک کی ویسے ہی کچی تھی۔ اندر آ کر بے اختیار بول پڑی۔

"صبح سے کتوں کی طرح دروازہ دروازہ بنا بنا (منڈیر) گھوم رہی ہے آ کر چار لفافے بنا دے ساتھ اور کچھ نہیں تو دس بیس مل ہی جاتے، پر تجھے تو اپنی آوارہ گردیوں سے فرصت نہیں۔"

زاہدہ باجی جو صبح سے منیا پر بھری بیٹھی تھیں۔ اس کی بھوک کی پکار سن کر پھٹ ہی تو پڑیں۔

"تو کیا کروں؟ اس شاہی محل میں آ کر یہاں کون سا کھانے کو کوئی دانہ مل جاتا ہے۔ فاقے فاقے پیٹ صبح سے شام تک بیٹھ کر لفافوں کو لیوی (گوند) لگاؤ بیٹھ بیٹھ کر بندے کا کب نکل آتا ہے اور شام کو آٹھ روپے دس روپے پھر آدھی روٹی کے لیے منت ترلہ میں باز آئی! ایسے کام سے۔" وہ بھی جواب میں خوب ہاتھ نچا نچا کر بولی۔

"بے غیرت! بے حیا! ماں کے آگے زبان چلاتی ہے ہڈحرام! کھانے کو چنگی چوکھی (تازہ دم) اور کام کو موت پڑے تجھے نامراد!"

"اماں میری جان کا سیاپا کرو اس لاڈلے کو کچھ نہ کہنا، جو مزے سے نوکری کو لات مار کر چلا آیا، کام سے جان جاتی ہے۔"

وہ اچک اچک کر ادھر ادھر ہوتی ماں کا ہر نشانہ خطا کرتی رہی۔

"زبان اپنی قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ ساری کنڑی میں تیرا بھونپو گونج رہا ہے۔" کوکو نے پیچھے سے آ کر اس کو دھپ لگائی وہ بجلی کی طرح تڑپ کر مڑی، اس نے پلٹ کر جھٹکے دیے۔ کوکو کے

منہ سے بے اختیار چیخیں نکلیں۔

''اب بول کس کا بھونپو بول رہا ہے، ساری کٹڑی میں ماں کی چمچی!'' وہ بے دردی سے اس کے بال کھینچتی اسے پورے کمرے میں گھماتی چوکھٹ پر پٹخ گئی۔

''ٹھہر تو نامراد، لچی! مشٹنڈی سارا دن ان ہی برائیوں مار کٹائیوں میں تیرا ٹیم (ٹائم) پاس ہوتا ہے اور تو نے کیا سیکھنا ہے۔'' زاہدہ باجی نے اب پیروں سے جوتیاں اتار کر اس کی طرف اچھالیں، دوبارہ پیڑھی سے اٹھیں بھی مگر وہ کون سا ہاتھ آنے والی تھی۔

''دفع کر اماں! تو کیوں خون جلاتی ہے۔'' سلو نے لاپروائی سے کہتے ہوئے چارپائی کا رخ کیا۔

''ہا...... ہائے میں مرگیا۔'' وہ جو دیوار سے سر ٹکا کر چارپائی پر لیٹنے لگا تھا۔ ایک کراہ کے ساتھ اٹھ بیٹھا، چھلی ہوئی کمر نے دہائی دی تھی۔

''میں مرجاؤں میرا لعل۔ ہاتھ ٹوٹیں اس نامراد کے کیسے بچے کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ کل جاؤں گی ذرا اس سے دو دو ہاتھ کرنے لاوارث سمجھ رکھا تھا اس نے۔''

زاہدہ باجی سلو کی کراہ پر تڑپ کر رہ گئیں۔

''جانے دے اماں! اس حرام خور کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں تجھے جا کر، میں خود اچھا خاصا حساب بے باق کر آیا ہوں آخر لوگ یونہی تو مجھے سلو بھائی نہیں کہتے۔'' وہ سلیمان خان کے اسٹائل میں بنائے ہوئے بالوں کو ماتھے پر دائیں بائیں جھلاتے ہوئے اسٹائل سے بولا۔ اسے پتا تھا۔ ماں کل جا کر اس کی منت کر کے اسے دوبارہ وہاں رکھوا آئے گی پھر وہی روز کا تشدد۔

''اماں کوثر خالہ کہہ رہی ہیں۔ ہمارے تو خود دو دن سے آٹا نہیں تو کہاں سے دوں آپ کو پیالی بھر آٹا!'' اسی وقت جگنو مٹی کی پرانی ٹوٹے کناروں والی خالی پیالی لیے چلا آیا۔

''ہاہاہ ہماری قسمت...... آج موا سر کا درد ایسا اٹھا سارا دن دس لفافے بھی نہیں بن سکے۔ سو پچاس کی نوبت آتی چار پیسے آجاتے تھے۔ وہ بھی نہیں، میں اکیلی جان کیا کروں۔'' وہ زور زور سے پٹی بندھے سر کو دباتے ہوئے ہائے ہائے کرتے بولیں تو گہری ہوتی رات کی سیاہی کو پہلے سے بیمار روشنی والا بلب ان کے چہروں کو اور بھی بیمار لاچار بنا رہا تھا۔ چوکھٹ کے اِدھر کھڑی منیا، چوکھٹ کے اندر دیوار کے ساتھ لگی کوکو، چارپائی کے کنارے ٹکا کمزور...... لمبے سے منہ والا سلو اور ماں کے پاس اکھڑی اینٹوں والے فرش پر اکڑوں بیٹھا جگنو۔

کمرے میں خامشی...... گھمبیر خامشی چھاگئی۔

منیا نے سر اٹھا کر اوپری اوپر لکڑی کے ریلنگ والے چوباروں پالکونیوں کو حسرت سے دیکھا۔ سب گھروں میں نہ سہی مگر بیشتر گھروں میں کھانے پکے تھے اور ان کھانوں کی ملی جلی خوشبو

کبھی کبھی ہوا کے کسی ہلکے جھونکے کے ساتھ آ ہی جاتی اور اس کی بھوک اور بھی چمکا جاتی۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیرتے اور خالی پیٹ کی آوازوں کو سنتے ہوئے امید بھری نظروں سے پٹی والے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر بیٹھی ماں کی طرف دیکھتی جیسے وہ ابھی اپنے ململ کے کرتے سے کوئی جادو کی چھڑی نکالے گی اور کچھ نہ کچھ کھانے کو پیش کر ہی دے گی۔

کمرے میں ہوا ناپید تھی، کمرے کی اکلوتی کھڑکی جو پچھلی طرف اماں بتولاں کے برآمدے میں کھلتی تھی۔ اس سے تھوڑی ہوا آتی جاتی تھی اگر کھلی ہو تو ورنہ اماں بتولاں چیخ چیخ کر لڑنا شروع کر دیتی کہ زاہدہ اور اس کے بچے میرے گھر کی کن سوئیاں لیتے ہیں اس کھڑکی سے ہوا کے بہانے۔

آئے دن تو اماں بتولاں کا اپنی دونوں بہوؤں سے خوب جھگڑا چلتا اور یہ خاندان کس قدر جھگڑالو اور لڑاکا تھا کٹڑی کے بڑے بڑے لڑکے مرد و زن اس گھر کی ہوا سے بھی دور بھاگتے تھے۔ سو زاہدہ کھڑکی کھولنے ہی نہیں دیتی تھی، صرف آدھی رات کے بعد جب وہ نک چڑھی لڑاکا بڑھیا گہری نیند میں ہوتی تو ذرا ہوا کے لیے زاہدہ یہ کھڑکی کھول دیا کرتیں اور صبح دن نکلنے سے ذرا پہلے چپکے سے بند بھی کر دیتی مگر اکثر کھڑکی بند کرنے میں دیر ہوجاتی اور بس......

''اماں! بھوک......'' جگنو نے گم صم سر ماتھا پکڑ کر بیٹھی ماں کا گھٹنا زور سے ہلایا۔ زاہدہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جگنو کی آنکھوں میں چمکتے پانی سوکھے لب منہ کے گڑھے میں اترتے رخسار اس کے غصے کو شدید رنج میں بدل گئے۔

''جا بلقیس مامی سے دس پندرہ روپے ادھار لے آ۔ تھوڑا آٹا نمک ڈال کر روٹی پکا دوں گی۔'' وہ لجاحت سے کوکو سے بولیں۔

''ہرگز نہیں۔ پہلے ان کے تین سو روپے دینے ہیں اب تو وہ میری شکل دیکھتے ہی مارنے کو دوڑتی ہے۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔'' کوکو نے تو فوراً انکار کر دیا۔

''جا سلو! اپنے جورے چچا کی دکان سے لے آ، کہنا پہلے حساب میں لکھ لے، دو چار دنوں میں بھجوا دوں گی۔''

''توبہ...... توبہ اللہ میری توبہ جو میں اس قصائی کی دکان کے پاس سے بھی گزروں۔ اماں جانی پورے نو سو روپے کا بل ہے اس کا پرسوں مجھے دھمکی دے رہا تھا۔ اگر اس مہینے چکتا نہ کیا تو غنڈوں کو لے کر آئے گا وہ خود ہی نکلوا لیں گے تمہاری اماں ابا سے...... میں تو اس لفنگے سے اب کبھی بھی ادھار لینے نہ جاؤں۔'' سلو نے انکار کیا اور چارپائی کے ایک طرف کروٹ کے بل لیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کچھ کھانے کو ملے تو میں کہیں لیٹ جاؤں۔ ادھر کس قدر گرمی ہے۔'' دوسرے ہی پل

وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ بیٹھا تھا۔

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

منیا اچک اچک کر لکڑی کی ریلنگ سے نیچے دیکھ رہی تھی، جہاں اب گہرے اندھیرے میں کہیں کہیں کمروں کے دروازوں کھڑکیوں سے آتی روشنی میں اکا دکا لوگ اوپر چڑھتے اترتے نظر آ رہے تھے۔

آٹھ تو کب کے بج چکے۔ اسے نگہت خالہ کے گھر اسٹار پلس کا ڈرامہ دیکھنے جانا تھا پر خالہ نے سختی سے کہہ رکھا تھا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ کے درمیان ہمارا کھانے کا ٹائم ہوتا ہے جس نے آنا ہوتا ہے ساڑھے آٹھ کے بعد ڈراما دیکھنے آئے۔

نگہت خالہ کا گھر عین ان کے کمروں کے نیچے تھا اور ادھر سے چمچ چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''آج ماسی نے چاول پکائے ہیں۔ کمبخت دانے گن گن کر تو پکاتی ہے مرکے، اس کا اپنا ٹبر ہی رج جائے مجھے کیا دے گی۔'' وہ اب تقریباً لٹکی ہوئی سوچ رہی تھی۔

''چھلانگ لگا دے ایک سے تو جان چھوٹے گی۔'' سلو نے پیچھے سے آ کر اسے شانوں سے پکڑ کر نیچے اچھالنا چاہا تو اس کے منہ سے جو بلند و بانگ چیخیں نکلیں۔ اردگرد کے کمروں کھڑکیوں اور برآمدوں سے کئی چہرے متوحش زدہ ہو کر جھانکنے لگے، سلو ماں کی گالیوں کی زد میں تھا۔

''آہا...... یہ کس کے لیے؟'' زاہدہ باجی کے کوسنے، گالیاں اور قسمت کے رونے جاری تھے کہ سلو کی بند آواز پر ان کی تیز تیز چلتی زبان تھم سی گئی۔

''اماں نے بھیجی ہے بریانی۔'' نیچے نانا دین محمد کا نواسا یوسف چاولوں کی بھری ہوئی پلیٹ لیے دروازے میں کھڑا تھا۔

سلو نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پلیٹ جھپٹ لی، یوسف نے لمحہ بھر کو زاہدہ باجی کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر واپس مڑ گیا۔

''ادھر دے۔ میں کھاؤں گی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔'' منیا اپنا رونا دھونا بھول کر پلیٹ اس سے چھیننے لگی۔

''ادھر لاؤ کمینو! دیکھنے دو مجھے ہے کیا؟'' زاہدہ باجی اپنا تھل تھل کر لٹکتے گوشت اور چربی والا جسم اٹھا کر بمشکل پیڑھی سے گز بھر اٹھیں اور پھر ناطاقتی کے سبب دوبارہ دھپ سے گر گئیں۔

منیا اور سلو زور آزمائی کے دوران مٹھیاں بھر بھر کر نوالے منہ میں ڈالے جا رہے تھے۔

''دو مجھے بھی کتو!'' جگنو نے پلیٹ چھیننے کی کوشش کی۔

کوکو کیوں پیچھے رہتی وہ بھی پلیٹ تک ہاتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔

''اماں! بسے ہوئے (خراب) چاول لگتے ہیں اور یہ تینوں کھائے جا رہے ہیں۔'' کوکو کی سونگھنے کی حس بڑی تیز تھی۔ پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی وہ فوراً چلائی۔

''نامرادوں برسات کا موسم ہے خراب چیز کھاؤ گے تو خالی معدے الٹ پڑیں گے دکھاؤ مجھے کیسے چاول ہیں۔'' وہ وہیں بیٹھی دہائی دے رہی تھی۔

ان کی دہائی سننے کی نہ کسی کو فرصت تھی نہ ضرورت! جگنو کے منہ میں فقط چار ہی لقمے گئے تھے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔

منیا اور سلو مرغ کی ٹانگ کی اس ہڈی کو چھیننے کی تگ و دو کرتے ہوئے ایک دوسرے کو مارنے بھنبھوڑنے سے گریز نہیں کر رہے تھے جو چاولوں کے نیچے سے نکلنے والی خالی ہڈی۔

''چھوڑ...... چھوڑ...... تیری بوٹیاں کردوں گی میں، پہلے ہی سارے چاول ہڑپ کر گیا۔ اب ہڈی بھی لے گا، نہیں دوں گی۔'' منیا کے بال دوبار سلو نے اپنی مٹھی میں جکڑے تھے۔ وہ زور زور سے چلائی بھی تھی مگر ہڈی پر اس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔

منیا نے ہڈی مٹھی میں دبا کر سلو کی کمر پر ایک دھپ لگائی، اور اس کا یہ وار کاری رہا، سلو کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلی تھی اور منیا نے اتنی ہی مہلت کو غنیمت جانا اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی اور آندھی طوفان کی طرح لکڑی کے پرانے پٹ بند کرتے ہوئے اس نے پھرتی سے چٹخنی چڑھا دی۔

''کھول خبیث کی نانی! تیرا آج میں خون پی جاؤں گا، تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا میرے ہاتھ لگ ذرا......'' سلو نے اندھا دھند دروازے کو لاتیں مکے ٹکریں مارتے ہوئے غصے کی وحشت سے چلا کر کہا۔

زاہدہ پھر سے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر گرائے بے بس بیٹھی تھی، جبکہ جگنو روتے روتے آگے بڑھ کر نیچے گرے چاولوں کے دانے اکٹھے کر کر کے منہ میں ڈالنے لگا۔

''گندی زمین ہے جگنو! گندہ فرش ان کے پیروں کے نیچے آئے چاول مت کھا۔ پیٹ خراب ہو جائے گا۔'' کوکو نے دوبارہ اسے کندھے سے پکڑ کر کھینچنا چاہا مگر وہ اسی طرح فرش سے چاول اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈالتا رہا۔

''اس کو اماں پٹہ ڈال، ورنہ کسی دن میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گی نامراد! خون کردوں گا کسی روز اس کا۔'' سلو اب دروازے کو ٹھڈے لاتیں مار کر کچھ بے دم سا ہو گیا تھا۔

''اس کو مارے گا تو جیل چلا جائے گا۔'' جگنو نے مٹی اور چاولوں سے سنے ہاتھ زبان سے چاٹے اور بولا۔

''جیل چلا جاؤں گا تو اچھا ہے اس مفت کی بیگار، استاد کی مار سے تو جان چھوٹ جائے

گی اور کچھ نہیں جیل میں دو وقت کی روٹی ملے گی۔ اس آزادی کے فاقوں سے جیل کی دال روٹی اچھی۔'' سلو چارپائی اور راستے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

''اماں! منیا سے کہو نا دروازہ کھولے ہم ادھر گرمی میں کیسے سوئیں گے۔'' جگنو روہانسی آواز میں بولا۔

اس گھر کا اکلوتا سالوں پرانا پنکھا صرف اس اندرونی کمرے میں لگا تھا جس کا دروازہ منیا مقفل کر کے بیٹھ گئی تھی۔

''نہ وہ چنڈال میرے کہنے میں ہے نہ تم لوگ، جس کو جہاں جگہ ملتی ہے سو جائے اف گرمی گھٹن۔'' زاہدہ بیزار لہجے میں کہتی چہرے اور بدن پر رینگتے پسینے کو ململ کے پھٹے پرانے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اماں! تم نے تو کچھ کھایا بھی نہیں۔'' ایک کوکو ہی تھی جسے کبھی کبھار ماں کا خیال آ ہی جایا کرتا تھا۔

''تم لوگوں نے تو کھا لیا نا۔ ماں جائے جہنم میں۔ تم خود غرضوں کو کیا پروا!'' وہ ایک دم سلگ کر بولی، پیٹ تو اندر سے خالی ہو کر جیسے تختہ بن کر کمر سے جا لگا تھا۔ سوچا تھا سلو دس بیس لے آئے گا۔ کچھ وہ ایک دو درجن لفافے بنا لے گی۔ دس روپے تو مل ہی جائیں گے۔ شام کو کلو ڈیڑھ کلو آٹا یا تھوڑی دال آ جائے گی تو سب کھا لیں گے مگر اب......

اور کل سلو بھی ورکشاپ نہیں جائے گا، فاقہ منہ کھولے کھڑا تھا زاہدہ نے آنکھیں سکوڑ کر اس اندھیروں میں روشنی میں دہلیز کے کونے کھدروں سے جھانکتے کچھ چاولوں کے دانوں کو دیکھا۔

''اماں! سو جاؤ نا ایسے ہی ابھی تھوڑی دیر میں کھڑکی کھول دوں گی یا وہ کمینی دروازہ کھول دے گی تو اندر پنکھے میں چل کر لیٹ جانا۔'' کوکو نے گہری غنودگی سے ذرا آنکھیں کھول کر ماں کی طرف کروٹ لی تو ماں کو اس زاویے پر بیٹھے دیکھ کر فوراً بولی۔ زاہدہ نے ہولے سے اچھا کہہ دیا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

رات گہری ہو چلی تھی جب وہ لکڑی کے موٹے پایوں والی نواڑی میلی سی پیڑھی سے ہائے ہائے کرتی گھٹنوں کو پکڑتی چولہے کے اوپر لگے گیس کے لوہے کے پائپ کو کھینچتی بہ دقت اٹھی اس کا اگلا سہارا وہی بند کھڑکی کا طاق تھا۔

اسی طرح جھکے جھکے ذرا اس نے طاق کی طرف کان لگائے اور پھر آہستگی سے بوسیدہ کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔

باہر بھی ہوا نہیں تھی مگر جیسے اندر کی حبس زدہ گرم گھٹن کو نکلنے کا رستہ مل گیا۔

وہ اسی طرح کرموں جلی جھکی جھکی ہانپتی، آنکھوں کے سامنے ناچتے تاروں کو آنکھیں

جھپک جھپک کر دور بھگاتی دہلیز تک پہنچی تھی اور پھر وہیں گر کر دروازے کے پاس ڈھیر ہو گئی۔

آسمان سے اترتی رات کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ دہلیز کے کونے کھدروں میں انگلی ڈال ڈال کر چاول کے دانے نکال رہی تھی اور انہیں منہ میں رکھ رہی تھی۔

''اماں!'' کوکو نے نیند میں کروٹ لے کر خالی پیڑھی کی طرف دیکھا۔

اماں اندھیرے میں زمین پر جھکی چوکھٹ سے دانہ دانہ چنتی نظر آئی تو اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی وہ کہنیوں کے بل ذرا سی اٹھی۔ بھوک کی وحشت سے باؤلی ہوئی ماں کو دیکھ رہی تھی۔

اس کی کہنیوں کے سہارے گر گئے اور آنکھیں گہرے پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔

اماں تھوڑی دیر بعد کسی بھاری بھرکم جانور کی طرح زمین پہ گھسیٹتی اس کے پاس پہنچی تو اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔

اماں نے اس کے پاس رک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا پھر جیسے مطمئن سی ہو کر سر سے دوپٹہ اتارا اس کا گولہ سا بنا کر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔

کوکو کی آنکھوں سے پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں، جن کی کوئی آواز نہیں تھی۔

☆☆☆

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے راستے میں دوبارہ پوچھا۔ شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گاڑی شہر کے پوش علاقے رونق والے بازاروں روشنیوں سے دمکتی سڑکیں ہوٹلز اور دوکانیں پیچھے چھوڑتی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

کچھ تو اتنا لمبا سفر اور کچھ شہریار کی پراسرار خاموشی...... ایمن کا دل گھبرانے لگا تھا۔

''کہیں یہ مجھ سے ناراض تو نہیں...... اور کسی دوسرے شہر یا کہیں اور...... مار ڈالنے کو...... نہیں نہیں شکل سے تو ایسے ظالم نہیں لگتے...... ایمن بی بی! تمہیں شکلوں کا کیا پتا تم نے تو آج تک ساری اچھی پیاری شکلوں کو غلط ہی پہچانا، عین وقت پر آ کر ان کے اندر سے کیسے ظالم کٹھور بے رحم انسان نکلے یہ تو پھر ابھی...... چند ہی دن ہوئے اس تعلق آشنائی کو۔''

گاڑی کی رفتار قدرے کم ہو گئی تھی، یہ بہت زیادہ رش والی سڑک تھی گاڑیوں اور دوسرے وہیکلز کے برعکس یہاں پیدل اور سائیکلوں پر آنے جانے والوں کا زیادہ رش تھا۔

انجان سا علاقہ انجان سے لوگ...... وہ اس شہر کی رہنے والی تھی مگر ان علاقوں کی طرف وہ کبھی بھولے سے بھی یا راہ بھٹک کر بھی نہیں آئی تھی۔

اسے معلوم تھا یہ اس چوڑی دو رویہ سڑک کے آگے شہر کے اندرون پس ماندہ ترین علاقے شروع ہوتے ہیں، جن سے آگے بدنام زمانہ ریڈ لائٹ ایریا

کہیں شہریار کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے تو نہیں، سنا ہے اس علاقے کی عورتوں کو بیٹوں کی پیدائش سے نفرت ہوتی ہے وہ انہیں پھنکوا دیتی ہیں۔ بیچ دیتی ہیں یا ان کے لڑکے خود ہی کہیں بھاگ کر اپنا فیوچر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور شہریار جس طرح اپنی Roots کے ذکر سے چڑتے ہیں مخفی رکھا ہے اپنے بارے میں سب...... تو یہ یقیناً اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اب ...... اب مجھے بھی ایسے ہی کسی چوبارے، یقیناً تبھی تو یہ خائف تھے ادھر آنے سے ...... سو بہانے گھڑے تھے انہوں نے، اس نے ترچھی نگاہوں سے اسی طرح کس کر لب بھینچے ڈرائیونگ کرتے شہریار کو دیکھا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور نظریں جیسے ایک ہی نقطے پر مرکوز ایمن کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔

باہر اب کشادہ سڑک کی جگہ تنگ سی ذیلی سڑک تھی، جس کے اردگرد پھلوں کی ریڑھیوں اور ٹھیلوں والے رات کے ان آخری اوقات میں بچے کھچے پھل کو سستے ترین نرخ پر بیچنے کے لیے حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگا رہے تھے۔

گاڑی اب شہر کے تاریخی دروازے میں داخل ہو رہی تھی اس کا دل کمزور پتے کی طرح لرزا۔

''لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر دن بھر کے مشاغل و مصروفیات کے بارے میں بے فکری سے تبصرے کرتے، گپیں لگاتے ٹولیوں کی شکل میں بازار سے گزر رہے تھے۔ پیچھے سے آتی ان کی گاڑی کی لائٹیں یا ہلکے سے ہارن کی آواز پر مڑ کر غصیلی نظروں سے انہیں دیکھتے اور تھوڑا سا گاڑی کو رستہ دے دیتے۔

گاڑی اب کشادہ احاطے سے گزر کر تنگ سڑک پر آگئی تھی جہاں سے ایک گاڑی اور ایک بائیک گزرنے کے بعد بمشکل ایک آدمی کے پیدل چلنے کی جگہ بچی تھی وہ بھی اگر بند دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے رستہ دے دیتے تو...... رستہ آگے تنگ ہی تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

سانپ کی طرح بل کھاتی ٹیڑھی میڑھی تنگ گلیاں جہاں زندگی رات کے وقت بھی بام عروج پر تھی۔

رات کے بارہ بجنے کو تھے یا شاید بج ہی چکے تھے مگر لوگ اس طرح ہشاش بشاش تھے جیسے ابھی تازہ دم ہو کر اٹھے ہوں۔

اس لیے تو کہتے ہیں ان علاقوں کی راتیں جاگتی ہیں۔

''او بھائی صاحب! آگے راستہ تنگ ہے کھدائی بھی ہوئی ہے گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ مہربانی فرما کر یہ ادھر بٹ صاحب کے احاطے میں پارک کرلیں، ورنہ آگے جا کر پھنس جائیں

گے ریورس بھی نہیں ہو سکے گی۔''

بے تحاشا راہ چلتے ہجوم میں سے ایک شخص نے گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹاتے ہوئے انہیں خبردار کیا۔ شہریار نے گاڑی روک کر گردن تھوڑی سی باہر نکال کر اردگرد دیکھا۔

''کس طرف ہے یہ احاطہ؟'' اس نے بادل نخواستہ اس شخص سے پوچھا۔

''یہ اس طرف...... دائیں طرف چوک سے آگے لے جائیں پہلے ہی ہاتھ دائیں طرف ہے وہ جگہ۔'' اس نے بڑے جوش سے رہنمائی کی۔

واقعی وہاں اچھی خاصی کھلی جگہ تھی، شاید اہل علاقہ اپنی گاڑیاں ادھر ہی پارک کرتے ہوں گے۔

شہریار گاڑی لاک کر کے صرف اسی کا چھوٹا سا بیگ لیے چلا آ رہا تھا۔ اسے کچھ الجھن سی ہوئی۔

''باقی کا سامان نہیں لائے۔'' اس کا ایک سوٹ کیس اور ایک شہریار کا ڈگی میں پڑا تھا۔

''ابھی کافی پیدل چلنا ہے تو کیسے اٹھائیں گے۔'' چہرے کے پتھریلے تاثرات کے برعکس اس کا لہجہ ہموار ہی تھا۔

اس نے طمانیت بھرا سانس لیا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

مگر اس کا اندازہ اسے جلد ہی ہو گیا کہ ان گلیوں میں پیدل چلنا بھی اتنا آسان نہیں تھا رش تو جو تھا سو تھا جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر تعمیراتی سامان ریت بجری اینٹوں کے ڈھیر، یہاں سیوریج کا نظام ابھی تک انڈر گراؤنڈ نہیں ہوا تھا۔

دو بار شہریار نے اسے مڑ کر دیکھا وہ بہت قدم پیچھے اس سے چل رہی تھی وہ کیا کرتی اس سے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔

سادہ ہلکی سی کڑھائی والا رات کی مناسبت سے ذرا گہرا پرپل شیڈ اور پلین جوتی پہنی تھی۔ اس نے ہلکی سی چین اور کانوں میں ٹاپس اور ایک انگوٹھی جو اسے شہریار نے پہنائی تھی مگر اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا۔ اس نے ڈھیروں ڈھیر سامان آرائش لاد رکھا ہے اور ہر کسی کو نگاہیں اسی پر جمی ہیں۔

دل میں اپنی نزاکت اور شہریار کے غصے کو کوستی خود کو سنبھالتی اب کے سارا دھیان صرف محتاط ہو کر چلنے میں لگاتی وہ تھوڑا تیز ہوئی۔

حیران کن طور پر یہاں گلی اونچی ہوتی جا رہی تھی جیسے کسی پہاڑی علاقے میں کوئی چڑھائی ہو۔

"آ جاؤ۔" شہریار کی غراہٹ سی اس کے کانوں میں پڑی اور کھمبے پر ٹمٹماتے بلب کی مدھم روشنی یا گھروں کی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں سے چھن کر آتی مدھم چمک میں اس نے دیکھا وہ لکڑی کے ایسے اونچے لمبے چوڑے بھاری بھرکم دروازے کے آگے کھڑی ہے، جیسے وہ کسی قلعے کا پھاٹک ہو۔

حیرت اور خوف اور تھوڑی پریشانی کی وجہ سے وہ اگلا قدم اٹھانا ہی بھول گئی۔

جیسے وہ پچھلی صدیوں کے کسی گم لمحے میں موجود ہونے جا رہی ہو۔

"آؤ بھی نا!" شہریار نے کچھ ایسے لہجے میں کہا، جیسے اسے اٹھا کر وہیں پٹخ ڈالے گا اگر وہ آگے نہ بڑھی تو......

اس نے جھجکتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔

مقام حیرت اس جناتی دروازے کے اندر ایک پوری بستی آباد تھی، ایک چھوٹا سا گاؤں یا قصبہ۔

دائیں بائیں محض کمروں پر مشتمل گھر تھے۔ پورے پورے گھرانے ان میں رہائش پذیر لگ رہے تھے۔

وہ حیران سی دائیں بائیں دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔

"اف!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے گلے میں ڈالے اس چھوٹے سے دوپٹے کو پورے کا پورا ناک اور منہ کے آگے کس لیا۔

ناقابل برداشت بدبو تھی، وہ متذبذب سی کھڑی ہوگئی شہریار اب دائیں جانب مڑ چکا تھا۔

وہ اس کے پیچھے ہوئی اور شہریار سیڑھیوں کے پہلے زینے پر اپنے سیل فون کی روشنی کیے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

"توبہ! تم نے تو گھنٹوں لگا دیے جلدی چلو اب۔" وہ اس کے قریب آتے ہی اس جھلاہٹ سے بولا، جو اس سارے سفر کے دوران اس کے مزاج کا حصہ رہی تھی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر بھی اندھیرا تھا چھوٹا سا صحن تھا یا خلا...... اسے اندھیرے میں ٹھیک سے پتا نہ چل سکا۔

وہ دونوں چار ہی قدم چل کر ایک کھلے دروازے کے آگے کھڑے تھے کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی، جو ادھر اُدھر کے گھروں اور کھڑکیوں سے وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ اسے اس ملگجی سی روشنی سے مانوس ہونے میں چند پل لگے، نیچے فرش پر ننگ دھڑنگ ایک نے نیکر اور ایک نے شلوار پہنی ہوئی تھی دو لڑکے ہاتھ پیر چھوڑے مدہوش سو رہے تھے، تھوڑا پرے شاید کوئی لڑکی تھی اور اس کے

ساتھ پہلی نظر میں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آسکا۔ کپڑوں کی گٹھڑی تھی یا کوئی اونچا سا ڈھیر وہ سمجھ نہ سکی۔

شہریار ان کو ٹاپتا پھلانگتا اب اندرونی دروازے کے آگے کھڑا تھا۔

وہ پسینے میں پوری نچڑ چکی تھی اور اب اس چھوٹے سے کمرے میں وہ چار پانچ یا شاید اس سے بھی زیادہ نفوس ہوں گے، شہریار نے بری طرح ہاتھ مار کر دروازہ پیٹا تھا، اور کمال حیرت ان سب سوئے ہوؤں میں سے کوئی بھی نہ ہلا نہ کسمسایا۔ دوسری بار اس نے پیٹنے کے علاوہ دروازے کو ایک زوردار لات بھی رسید کی تھی۔

دروازہ گویا اپنی عمر کا واسطہ دیتے ہوئے گڑگڑاتا ایک جھٹکے سے کھل گیا تھا، اس کی چٹخنی ٹوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔

اور کھلے پٹ کے آگے ڈری سہمی بارہ تیرہ سال کی کوئی لڑکی نیند سے بوجھل آنکھیں لیے کھڑی تھی۔

اپنے سامنے ایک اجنبی کو یوں رات گئے جارحانہ انداز میں کھڑے دیکھ کر، اس کی آنکھیں اگلے ہی پل پوری کھل گئی تھیں، جبکہ کمرے میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا تھا۔

"کک......کون ہیں آپ؟" وہ ڈرتے ہوئے ہکلا کر بولی۔ شہریار نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ایک زور کی چپت لگائی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اور کندھے سے پکڑ کر اسے باہر دھکیل دیا۔

وہ خوفزدہ سی ہو کر باہر نکل آئی اور اس اونچے سے پہاڑ نما ڈھیر کے پاس سکڑ کر بیٹھ گئی۔

"آؤ تم کیوں کھڑی ہو۔" اس نے دیوار پہ ہاتھ مار کر کمرے کی اکلوتی لائٹ کا بٹن ڈھونڈ لیا تھا۔

جیسے ہی ایمن اندر داخل ہوئی۔ شہریار نے کھٹ سے اس کے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔

چٹخنی ٹوٹ چکی تھی صرف دونوں پٹوں کو بند کرنے والی کنڈی سلامت تھی، اس نے وہی بند کرلی۔

"یا...... یہاں......رہیں...... مطلب رات کو۔"

سب کچھ نظر آتے ہوئے بھی اسے جیسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چھوٹا سا کمرہ اونچی بے تحاشا اونچی چھت والا کمرہ گھر گھر کرتا بیمار سال خوردہ پنکھا ٹمٹماتا بلب ایک پرانی سی کرسی اور ایک جھلنگا سی مسہری جس پر بے حد گندی چادر پڑی تھی۔ چادر پر میل کے علاوہ جگہ جگہ گھی اور سالن کے داغ اس ٹمٹماتی روشنی میں بھی نمایاں تھے، جگہ جگہ سے ٹوٹا اکھڑا فرش اور......اور......بس ہاں کمرے کے مخالف سمت ایک دروازہ بھی تھا جیسے دیوار توڑ کر زبردستی

بنایا گیا ہو، ایک پٹ کا بند دروازہ اس کے ساتھ طاق نما کھڑکی۔

''اف تھک گئے چلو سوتے ہیں۔'' شہریار نے بوٹ اتار کران میں جرابیں ٹھونسیں اور اس جھلنگا مسہری میں بیٹھتے ہوئے آدھے سے زیادہ لیٹ ہی گیا۔

اور وہ تو ایسی حیران ایسی گم صم ہوئی تھی کہ پتھر کے بت کی طرح کمرے کے بیچوں بیچ بے حرکت کھڑی تھی۔

شہریار نے محفوظ ہونے والی نظروں سے اس کی گم صم حیران صورت کو دیکھا۔

''آجاؤ کھڑی کیوں ہو۔'' اس نے پیچھے کی طرف بانہیں پھیلا کر لیٹتے ہوئے انگڑائی سی لی اور آنکھیں بند کرلیں۔

اس کا حلق سوکھ رہا تھا اور دم......دم تو جیسے نکلنے کو تھا نہ جانے کیسے وہ نڈھال سی پیچھے اس پرانی بید کی کرسی پر گرسی گئی۔

شہریار نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اف گرمی بہت ہے۔ ایسے تو سویا نہ جائے گا۔ تم نے میرا نائٹ سوٹ تو رکھا تھا نا وہی نکال دو مجھے، میں چینج کرلوں۔'' وہ ایسی اپنائیت بھرے انداز میں بولا، جیسے ان کی شادی کو کئی سال بیت چکے ہیں اور وہ کسی تفریحی مقام پر چھٹی گزارنے آئے ہیں۔

ایمن نے ڈبڈبائی نگاہوں سے شکایت کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''اف! کیا قیامت ہے اور اس پنکھے کو دیکھو، مردود چل رہا ہے کہ ہمیں چلا رہا ہے۔'' اس نے جلدی جلدی گریبان کے سارے بٹ کھول دیے۔

''بابا! اٹھ بھی جاؤ مجھے کپڑے دے دو، غلطی کی بازار سے گزرتے ہوئے دو کولڈ ڈرنکس ہی پکڑ لیتے پیاس لگی ہے۔'' ایمن نے آنکھیں جھپک کر اسے دیکھا، اسے گرمی قیامت خیز لگ رہی تھی۔ کوئی انوکھی سی خوشی ملنے کا خوشگوار احساس ہوا لگ رہا تھا، اس نے شہریار کی طرف دیکھا۔

''کپڑے تو آپ کے سوٹ کیس میں تھے اور سوٹ کیس گاڑی کی ڈگی میں۔'' وہ بادل نخواستہ بولی تھی۔

''اوہ! اب کیا کریں؟'' وہ کوفت بھرے انداز میں کہہ اٹھا اور مسہری کے پاس اِدھر اُدھر ہونے لگا۔ اس سے زیادہ کی کمرے میں گنجائش نہیں تھی۔

''نہا ہی لیتا ہوں شاید کچھ سکون مل جائے۔'' اس نے بے قرار سا ہو کر بغلی دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

''سبحان اللہ غسل خانے میں پانی نہیں۔ ایک قطرہ بھی نہیں۔'' اگلے ہی منٹ وہ واپس

آچکا تھا۔

''ایڈونچر کا شوق پورا ہوا یا ابھی اور کچھ عجائب دیکھ کر توبہ کروگی۔'' وہ تھوڑی دیر کی صبر آزما چپ کے بعد بولا تو ایمن نے تھوڑا حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

''ایڈونچر کیسا ایڈونچر؟ شہریار صاحب اب زندگی میں ایڈونچر نہیں رہا۔''

اس نے بولتی نظروں سے جواب دیا، اور بے آرام سی ہو کر کرسی پر ذرا پیچھے کھسکی۔

''پتا نہیں کیا تمہارے بھیجے میں سمایا تھا اچھا بھلا گھر بیڈ روم اپنا ائیر کنڈیشنڈ کمرہ چھوڑ کر اس منحوس جگہ آگئیں سمجھایا، سر پٹخا، منت کی، پیار سے اشارے کیے کہ بی بی! تم جو سمجھ رہی ہو یہ ایڈونچر ویسا نہیں۔ عقل کرو چلو اگر ایسا ہی تھا تو دن میں نکل آئے۔ آنکھوں سے دیکھ کر تسلی ہو جاتی تو واپسی کا رستہ تو بچ جاتا، رات بھی بے آرام کی اور واپسی کے لیے کم از کم صبح کا انتظار تو کرنا ہوگا۔ کیا مصیبت ہے۔''

اس نے ہاتھ مار کر شرٹ کے بقیہ بٹن بھی کھول دیے اور اگلے ثانیے شرٹ اتار کر مسہری کے آخری کونے میں پھینک دی۔

ایمن نے دزدیدہ نظروں سے اس کے کسرتی بدن اور بالوں بھرے سینے کو دیکھا اور نظروں کا زاویہ پھیر لیا۔ وہ گرمی اور گھٹن سے بے حال ہو رہا تھا۔

''اف مچھر بھی ہیں۔'' اس نے ننگے شانے پر زور سے کھجایا۔

ایمن کی قمیص کے بازو کافی شارٹ تھے اور دو تین جگہوں پر اسے بھی مچھر کاٹ چکے تھے مگر نجانے کیسا عالم تحیر تھا کہ وہ اس تکلیف کا احساس کرنا بھی، اس لمحے جیسے بھول گئی تھی۔

شہریار نے اگلے پل بنیان بھی اتار کر پھینک دی۔

''دیکھو لو، سولو گی ادھر۔'' چند لمحے جاں لیوا انتظار میں گزرنے کے بعد شہریار نے بے صبرے پن سے دیکھا۔

''تو اور کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے بولی جیسے رو دے گی۔

''اونہوں! چلتے ہیں۔'' وہ اب کے ذرا لجاجت سے بولا۔

''کہاں؟......کہاں چلیں گے اس وقت؟'' وہ حیران سی ہو کر بولی کہ شہریار کا جی چاہا اپنا سر مسہری کی لکڑی سے ٹکرا دے۔

وہ چپ کر کے وہیں دراز ہو گیا۔

تھوڑی دیر زور زور سے کروٹیں لینے کے بعد وہ اس جھلنگا سے نیچے فرش پر آ گیا۔

گندا میلا چیکٹ تکیہ اس نے سر کے نیچے رکھا اور ٹانگیں ایمن کی کرسی کے نیچے پھیلاتے

ہوئے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

''دیکھو، تمہیں اس طرح گوتم بدھ کی طرح بیٹھ کر کسی مراقبے میں جانا۔ گہری سوچ بچار کے بعد کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن پلیز یہ لائٹ آف کر دو۔ میں ایک دو گھنٹے سو ہی لوں۔ ایک تو بج چکا ہے تم بھی ادھر مسہری پر نہ سہی نیچے آ کر لیٹ جاؤ۔ ذرا کمر سیدھی ہو جائے گی۔ پلیز لائٹ۔'' وہ غنودگی میں بھاری آواز میں کہتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس کی طرف کروٹ لیے لیٹ گیا۔

مجبوراً اٹھ کر لکڑی کے ڈیش بورڈ پر لگے وہ کالے موٹے بٹن دبا دبا کر آخری بٹن پر بلب بند کرنا پڑا۔

لمحہ بھر کو تو کمرے میں گھور اندھیرا سا چھا گیا۔

اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ شہریار کی ٹانگوں سے الجھی اور سنبھلتے سنبھلتے بھی اس پر گر گئی۔

اس کی تو ساری نیند ہوا ہو گئی۔

ایمن کو لگا۔ اس کا دم نکل جائے گا۔

''یہاں اس جگہ اس ماحول میں......''

''نن، نہیں...... ہرگز نہیں۔'' اس نے پورا زور لگا کر خود کو چھڑایا اور اچک کر مسہری پر چڑھ گئی۔

''اس ماحول میں جہاں انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح گندی زمین پر سونے پہ مجبور ہیں۔ وہ ایک اور کیڑے کو جنم دینے کا باعث بن جائے۔ ہرگز نہیں بالکل نہیں۔''

زور لگانے، خود کو چھڑانے میں اس کے زیر دباؤ آنے والے حصے کراہ رہے تھے اور کمرے کی آکسیجن جیسے اور بھی کم ہو گئی تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

''میں نے تم سے شادی کی ہے۔ کوئی بھگا کر نہیں لایا ادھر آؤ۔''

شہریار کی لال ہوتی آنکھیں اسے اس گھور اندھیرے میں بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ مسہری پر آ چکا تھا۔

ایمن نے بے اختیار اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھا ورنہ شاید تیز چیخ اس کے منہ سے نکل جاتی، اس نے بولنے کی کوشش کی مگر لب کپکپا کر رہ گئے۔

وہ ایک بار پھر اس کی مضبوط مردانہ گرفت میں آ چکی تھی۔

''ش...... شہر...... شہریار...... پ...... پلیز۔'' اس نے ہچکیوں اور دم گھٹتی سانسوں کے بیچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

وہ اندھیرے میں اسے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ دونوں کی سانسیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں کہ لمحہ بھر کو تو گرمی اور گھٹن کا احساس بھی ناپید ہو گیا تھا۔

''عجیب سائیکی کیس ہو تم۔ تین دن ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور تم...... تم اگر ذہنی طور پر تیار نہیں تھیں تو کیوں کی تھی شادی...... اور مجھے تو یہ چکر ہی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کوئی فراڈ لمبا ہاتھ یا کوئی دھوکا...... آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

اس کی حالت پہ معلوم نہیں اسے ترس آیا تھا کہ غصہ...... یا اس نے سخت وحشت کے عالم میں اسے خود سے دور دھکیلا تھا۔

وہ گٹھڑی سی بنی دیوار کے ساتھ لگ کر کانپنے لگی۔

''تمہارے پاس رات کے چند گھنٹے ہیں اچھی طرح سوچ لو...... اس کے بعد اس کے بعد خدا کی قسم! تمہیں ایک پل کی مہلت نہیں دوں گا۔ تم بار بار میری مردانگی کو چیلنج کر رہی ہو...... اور صبح...... صبح ہم یہاں سے واپس چلیں گے تمہارے گھر، ختم یہ ایڈونچر کا ناٹک سنا تم نے...... ورنہ مجھے اور بھی بہت سے طریقے آتے ہیں...... اچھا مذاق ہے۔''

وہ غصے میں کھولتا، ابلتا، بل کھاتا، مسہری سے اترا تھا۔ اپنی ناہموار سانسوں کو قابو میں کرتا مسلسل بولتے ہوئے اپنے اس جذباتی ہیجان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا، جو ابھی اس دشمن جاں کو اتنے پاس خوشبودار سانسوں کے ساتھ اپنے اتنے قریب پا کر پیدا ہوا تھا۔

پاس گری بنیان اٹھا کر اس نے چہرے اور جسم پر رگڑی اس کھلے طاق سے غلطی سے تازہ ہوا کا جھونکا سا اندر آیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ کمرے کا درجہ حرارت معتدل ہونے لگا، یا شاید اس کے اندر اٹھنے والا آتش فشاں سرد ہوا تو اسے درجہ حرارت اعتدال پر آتا محسوس ہونے لگا۔

وہ تھوڑی ہی دیر میں سو چکا تھا۔

ایمن کو دیوار کے ساتھ کافی مچھر اور کھٹمل کاٹ چکے تھے، شہریار کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے پر وہ بے آواز حرکت کے ساتھ مسہری سے نیچے اتر کر اس کرسی پر بیٹھ گئی۔

''رات کے چند گھنٹے سوچنے کے لیے...... کیا سوچوں۔'' وہ طاق سے آتی مدھم روشنی میں شہریار کے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

''میں تو ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں تو پھر کیا سوچوں واپسی کے بارے میں۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''مگر شہریار بھی غلط نہیں کہتا یہاں چند گھنٹے گزارنا ناممکن ہیں۔ کجا چند دن یا چند ماہ۔ کشتیاں جلی ہوں یا دریا رخ بدل چکے ہوں۔ میں کم از کم یہاں نہیں رہ سکتی بالکل بھی نہیں۔ شہریار

اس معاملے میں غلط نہیں اور گھر کتنا ہی ٹوٹا پھوٹا، بوسیدہ کیوں نہ ہوتا ایسی گھٹن بھری کوٹھریوں کے بارے میں تو میں نے تصور نہیں کیا تھا یہ تو شاید سزائے موت کے قیدیوں کا کوئی سیل ہے...... میں یہاں تو ہرگز نہیں رہ سکتی۔''

''تو پھر کہاں رہو گی؟'' خالہ جی اس اندھیرے گھٹن بھرے کمرے میں جانے کہاں سے آ گئی تھیں۔

''کہا تھا نا جلد بازی مت کرو۔ دو چار ماہ کی مہلت لے لو۔ ذرا ایک دوسرے کو سمجھ لو، جان لو۔ پھر تم تو غیرت کی علمبردار بنی جھنڈے گاڑنے کے زعم میں سب منٹوں میں کرنے پر تلی تھیں۔ اب مزہ چکھو۔'' خالہ بی اس طرح اندھیرے میں چٹکی بجاتی غائب ہو گئیں جیسے اسے اکثر طعنے دیا کرتی تھیں۔

''چند گھنٹے ہی تو گزرے ہیں میں دن کی روشنی ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ خالہ بی کو جا کر روک لوں گی کہ چابیاں ابھی قریشی صاحب کو نہ دے کر جائیں۔ میں خود بات کرلوں گی اگرچہ میرا دل نہیں کرتا۔ میں اس فراڈ شخص سے بات بھی کروں۔ کجا کوئی رعایت مانگنا...... مگر ایسی غلیظ نالیوں جیسی جگہ پر زندگی گزارنے سے اچھا ہے کہ میں اپنے غصے اور نفس کی سرکشی پر قابو پا کر تھوڑے دنوں کے لیے ڈھیٹ، بے حیا بن جاؤں۔ اس میں کوئی حرج نہیں خالہ بی یقیناً میرا ساتھ دیں گی۔ وہ تو پہلے ہی یہی چاہ رہی تھیں یا اللہ! دن کب نکلے گا۔'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر سیل فون نکالا اور ٹائم دیکھنے لگی۔

''ابھی تو بہت ٹائم پڑا ہے۔ کم از کم تین گھنٹے۔'' اس نے مایوس ہو کر سیل بیگ میں ڈالا اور اسی کرسی پر نیم دراز سی ہو گئی اس کی ٹانگیں شہریار کی ٹانگوں کو چھو رہی تھیں اور وہ اب کے سوتے شیر کو جگانے کا رسک نہیں لینا چاہتی تھی، سو ٹانگیں کرسی پر سمیٹ کر سکڑ کر بیٹھ گئی۔

مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ بیس پچیس منٹ بعد وہ بھی گہری نیند سو چکی تھی، اس کی ٹانگیں کرسی کی حدود سے لڑھک کر شہریار کی ٹانگوں پر گر چکی تھیں مگر اسے نیند میں کوئی ہوش نہیں تھی۔

دل کو دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ تھی جس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

خوف سے اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔

وہ گڑگڑاہٹ لکڑی کے اس بند دروازے سے آ رہی تھی، جس کی لرزتی کنڈی دوسرے جھٹکے پر اتر گئی تھی۔

''منیا! بدبخت تیرا بیڑا غرق مردود کنڈلی مار کر بیٹھ گئی پتا ہے موتنے (باتھ روم جانے کے

لیے) یہی ایک راستہ ہے پڑے تجھے اللہ کی مار۔'' زور سے دروازہ کھلا اور بمشکل پانچ فٹ کی چھوٹی سی پہاڑی نما عورت اس کے سامنے کھڑی تھی، جیسی حیرت اور خوف ایمن کے چہرے پر اسے دیکھ کر نمودار ہوا تھا۔ کچھ ویسا ہی حال اس کا بھی تھا۔

''کک...... کون ہو تم اور میرے گھر......'' پوچھتے ہوئے اس کی دوسری نظر نیچے لیٹنے بے سدھ سوئے شہریار پر پڑی جو کروٹ کے بل تھا اور اس کا منہ دوسری طرف تھا۔

''کون ہو تم لوگ...... اور یوں کمرہ بند کرے...... ادھر کیا حرامزدگیاں پھیلا رہے ہو۔ وہ بھی میرے گھر میں......'' اب کے وہ خوفناک تیور کے ساتھ گرجی۔

ایمن نے حواس باختہ سا ہو کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھپٹ کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ کرسی پر گرا اسٹول نما دوپٹہ اٹھا کر کھلے دروازے سے باہر بھاگی۔

''اے...... اے ٹھہر چھوری! کون ہے تو۔ ٹھہر ذرا حرام خور اب یار کو چھوڑ کر کیوں بھاگ رہی ہے اے۔'' وہ مڑ کر ہانپتے ہوئے چلائی ایمن ان سنا کرتے اندھا دھند انجان رستوں پر مڑتی ٹھوکریں کھاتی نیم روشنی اور اندھیرے میں گرتی پڑتی سیڑھیاں اتر گئی۔

☆☆☆

''جی وہ آپ کی خالہ جی تو چلی گئیں۔ ساڑھے سات بجے ان کی ٹرین جانی تھی، وہ تو صبح تین بجے کی اٹھی ہوئی تھیں۔ ساڑھے چار سے وہ شور مچانا شروع کیا کہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ رکشہ ٹیکسی لا دو میری گاڑی نکل جائے گی۔ سب نے سمجھایا۔ ابھی جلدی ہے۔ اتنے منہ اندھیرے، اسٹیشن پر جا کر کیا کریں گی۔ ذرا دن نکلنے دیں اسٹیشن یہاں سے زیادہ دور نہیں، پر انہوں نے کسی کی بھی نہیں سنی۔'' نوکر اسے یوں صبح صبح اپنے سامنے دیکھ کر جو بولنا شروع ہوا تو بمشکل چپ ہوا۔

''چلی گئیں۔'' اس کے دماغ کی سوئی تو اس ایک جملے پر اٹک گئی تھی۔

''کب...... کب گئیں؟'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''صبح ساڑھے پانچ بجے میں نے رکشہ لا کر دیا انہیں تو سب نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ رات بھر کسی کو سونے نہیں دیا۔ انہوں نے۔'' نوکر سخت بیزار تھا۔

''وہ...... وہ اس گھر کی میرا مطلب ہے ہمارے گھر کی چابیاں تو دے گئی ہوں گی قریشی انکل کو ذرا انہیں تو بتاؤ جا کر میں آئی ہوں۔''

اس نے قریشی صاحب کے ملازم کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا بلکہ ''یوں کرو'' اسے خیال آیا۔

''ان سے چابیاں لے آؤ۔ میں ذرا دن نکلتا ہے تو خود ہی ان سے آ کر مل لوں گی۔'' اس

نے جلدی سے کہا تو نوکر اسے دیکھنے لگا۔

''جاؤ کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔'' اب کے وہ جھلا کر بولی۔ ایک تو رات بھر کی بے آرامی کرسی پر لٹکے لٹکے اس کی ٹانگیں اور کمر دوہری سی ہو کر درد کر رہی تھیں پھر جو پورے جسم پر مچھروں نے کاٹا تھا۔ اس کی الجھن علیحدہ جی چاہ رہا تھا فوراً جا کر اپنے واش روم میں ایک ٹھنڈا باتھ لے اور پھر اپنے سی چلا کر اپنے آرام دہ بستر میں گھس کر سو جائے۔

''جی خالہ جی! تو رات کو ادھر ہی سوئی تھیں۔ آپ کے گھر کو تالا لگا کر آ گئی تھیں کہ اتنے بڑے گھر میں انہیں ڈر لگے گا۔ اکیلی سو نہیں سکیں گی۔'' نوکر بڑے تحمل سے بولا۔

''تو ...... تو چابیاں تو انکل کے پاس ہی ہوں گی لے آؤ جا کر۔''

کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل سی ہونے لگی تھیں کمبخت گیٹ کے آگے تنا کھڑا تھا۔

''جی وہی تو کہہ رہا ہوں۔ چابیاں انہوں نے رات ہی صاحب کو دے دیں تھیں اور صاحب نے ان کے سامنے ہی وہ راشد صاحب کے پاس ڈرائیور کے ہاتھ بجھوا دی تھیں اور بعد میں خالہ جی سے بات بھی کروا دی تھی کہ چابیاں انہیں مل گئی ہیں۔'' نوکر اسے تفصیل سے بتا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا۔ کوئی اس کے قدموں کے نیچے سے زمین لپیٹے جا رہا ہے۔

اس نے بے اختیار اپنے گھومتے سر کو تھاما اور دیوار کا سہارا لیا۔

''بی بی جی آپ آ جائیں اندر بیگم صاحب اٹھنے والی ہیں۔ آپ اندر آ کر انتظار کریں۔'' نوکر اس کی حالت دیکھ کر ہمدردی سے بولا۔

''نن ...... نہیں میں چلتی ہوں۔'' وہ شکستہ آواز کے ساتھ بولی اور مڑ گئی۔

نوکر چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر کندھے اچکا کر گیٹ بند کر کے چلا گیا۔

ایمن نے دو قدم پہ ایستادہ اپنے گھر کے اس عالیشان کاسنی کلر کے آہنی گیٹ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، جو پرایا ہو جانے کے باوجود ابھی بھی پرایا نہیں لگ رہا تھا۔ یوں آنکھیں کھولے اس کی جانب تک رہا تھا جیسے ابھی اپنی بانہیں پھیلا کر اسے اپنے اندر سمو لے گا۔

اس نے سبز بیلوں سے ڈھکی دیوار پر بڑی نرمی سے ہاتھ پھیرا جیسے اس دیوار کے لمس کو اپنے ہاتھ کی لکیروں میں جذب کرنا چاہ رہی ہو، شاید اس طرح یہ دیوار ...... یہ گیٹ یہ گھر پھر سے اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اتر آئے اس کا مقدر بن جائے۔

اس نے گہری سانس لے کر اس فضا سے اپنی سانسوں کا آخری حصہ وصول کیا اور شکستہ قدموں سے آگے کی طرف چل پڑی، دل کو سمجھانے کے باوجود مڑنے سے پہلے تین بار اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس چار دیواری کو دیکھا تھا اور آنکھیں جھپکتی موڑ مڑ گئی۔

''شہریار! میں رستہ بھول گئی ہوں۔'' وہ سیل فون پر بتاتی ہوئی رو دینے کو تھی، ایک تو اس نے فون اتنی دیر بعد ریسیو کیا تھا اس سے وہ گھبرا گئی تھی گھر کیا ہاتھ سے نکلا۔ اس کی حالت بھیڑ میں گم ہو جانے والے بچے کی سی ہو گئی تھی، جو اپنا گھر اپنے ماں باپ کا نام اتا پتا کچھ بھی نہ جانتا ہو جیسے اس کی پہچان ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

''تم صبح صبح کہاں مارننگ واک پر نکل گئی تھیں۔'' اس کی نیند میں ڈوبی طنز بھری آواز سیل سے ابھری لحہ بھر کو ایمن بھونچکی سی رہ گئی۔

''مارننگ واک۔'' اس نے سراسیمگی سے ارد گرد گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا جن کے لیے چوراہے کے ایک طرف کھڑی فیشن ایبل کپڑے پہنے تھوڑی حواس باختہ سی لڑکی فون کان سے لگائے کسی عجوبے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ان کی سوالیہ چبھتی نگاہیں، اسے برداشت کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے یہاں سے جاتے ہوئے ٹیکسی والے سے اس علاقے کا نام پتا پوچھ لیا تھا۔ کافی راستہ چلی بھی آئی تھی مگر دائیں بائیں آگے پیچھے سے نکلتیں تنگ ٹیڑھی میڑھی گلیاں اسے بالکل ایک جیسی لگ رہی تھیں، کبھی ایک گلی میں جاتی تو کبھی دوسرے میں مگر کہیں بھی وہ جناتی پھاٹک اسے نظر نہیں آیا تھا جو رات اندھیرے کے باوجود اس کے دماغ میں نقش ہو کر رہ گیا تھا، آخر تھک ہار کر اس نے شہریار سے رابطہ کیا تھا۔

''اب کیا سو گئی ہو یار! میری نیند برباد کرنا تھی کیا صرف۔'' وہ اسی جھلاہٹ سے بولا جو اس کے لہجے کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

''میں کیا کروں کیسے آؤں گھر؟'' بہت مشکل سے اس کے لبوں نے گھر کا لفظ ادا کیا تھا۔

''اب کہاں کھڑی ہو؟'' وہ بیزار ہو کر بولا۔

''کہاں ...... زمین ......'' وہ بوکھلا کر بولی۔

''اف!'' وہ جیسے بال نوچنے کو ہوا۔ ''جگہ کون سی ہے گلی نمبر یا کچھ خاص دکان کا بورڈ وغیرہ جو سامنے ہو۔''

''اوہ یہ چوراہا ہے اور سامنے ہاں سامنے نذیر پان شاپ ہے اعوان بیکرز اس کے ساتھ اور ...... ڈاکٹر شوکت حیات اور ......''

''اچھا بس مجھے سمجھ میں آ گیا۔'' وہ تیزی سے بتا رہی تھی جب شہریار نے اسے بیچ میں ٹوکا۔ ''تم یہیں رکو۔ میں آ رہا ہوں زیادہ دور نہیں ہو تم یہاں سے۔''

''چلیں جی میرے ساتھ۔'' وہ راہ چلتے لوگوں ریڑھی بانوں ٹھیلے والوں اور ارد گرد جا بجا

کھلتی دکانوں اور تھڑوں پر بیٹھے اترتے چڑھتے لوگوں کی نظروں کو جیسے اپنے اندر آر پار اترتے محسوس کر رہی تھیں۔ اتنے ہجوم کے بیچ یوں بے مقصد کھڑے ہو کر بے چینی سے کسی کا انتظار کرنا اس کی زندگی کا انوکھا ہی نہیں، سب سے اذیت ناک واقعہ لگ رہا تھا۔ جب پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا جس کا قد تو خوب بڑھ رہا تھا مگر جسم کسی سوکھے ڈھانچے سے مشابہ تھا۔ اس کے ہاتھ پیر خوب بڑے بڑے اور ان کی انگلیاں سخت اور لمبی لمبی سی تھیں جن پر جگہ جگہ محنت کی گانٹھیں لگی تھیں اس کے ہاتھوں کی طرف کوئی پہلی نظر میں دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ وہ چائلڈ لیبر کے خلاف کام کرنے والی ان گنت این جی اوز اور فلاحی اداروں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

"تم ......کون ہو؟" وہ متذبذب سی ہوئی۔

"آپ کو لینے بھیجا ہے مجھے ماموں نے چلیں۔" وہ ماموں سے بھی زیادہ بیزار لگ رہا تھا۔

"ماموں؟" وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ "کون ماموں؟" وہ سمجھ کر بھی انجان بنی رہنا چاہتی تھی۔

"ماموں ہمارے......" وہ آگے چل پڑا تھا۔ "شہریار ماموں اور کون؟" وہ خوب منہ میں لفظوں کو چبا کر بولا تھا۔

"شہریار تمہارے ماموں ہیں ......تم تمہاری امی کے بھائی۔" اس نے تیزی سے تین چار قدم اس کے پیچھے اٹھائے تھے اور تصدیق کرنا چاہی تھی۔

"ہاں جی اماں کے بھائی۔" وہ لاپروائی سے راہ میں آتے پتھروں کو ٹھوکروں سے دور دور اچھالے جا رہا تھا، اس کا میلا چیکٹ بادامی رنگ کا کرتہ جگہ جگہ سے پیوند لگا تھا اور اس کے سوکھے سڑے شانوں پر جھول رہا تھا جیسے کسی نے بانس پر اس کرتے کو پھیلا رکھا ہو۔

"او......اور تمہاری مدد آئی مین تمہاری اماں کہاں ہیں۔"

وہ اس کے برابر چلنے کی کوشش میں اپنا توازن اس اونچی نیچی گلی میں بمشکل سنبھالے ہوئے تھی۔

"گھر میں اور کہاں ہوں گی۔" وہ اس کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اسی طرح پتھروں اور راہ میں پڑی چیزوں بوتلوں کے ڈھکن ریپر اور کاغذوں کو اڑائے جا رہا تھا۔

"گھر؟ کون سے گھر جہاں ......جہاں" اسے سمجھ میں نہ آیا کہ آگے اس کے گھر کی کیا خاص نشانی بیان کرے۔ "جہاں ابھی تمہارے ماموں موجود ہیں وہاں۔" بالآخر اسے وہ خاص نشانی سمجھ میں آ ہی گئی۔

"ہاں وہیں۔" وہ جھپاک سے موڑ مڑ گیا۔ وہ بجلی کی طرح لپکی تھی وہ واقع کافی آگے جا چکا تھا۔

"تم صبح صبح کہاں ہوا خوری کرنے نکل گئی تھیں۔ وہ بھی بتائے بغیر۔" شہریار اس طرح زمین پر اسی تکیے کو دوہرا کیے نیم دراز تھا، اسے دیکھتے ہی بول اٹھا اس کے پیر بری طرح سے درد کرنے لگے تھے۔

اسے اس طرح کے اجنبی ناہموار رستوں پر چلنے کی عادت کب تھی؟ جواب دینے سے پہلے آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے چھپانے کے لیے وہ اسی کرخت اکڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر جھکی اور سینڈل اتارنے لگی۔

دروازے میں کوکو، منیا، جگنو اور ذرا پرے سلو بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ اسے کیا جواب دے؟ وہ نیچے جھکی نم، آنکھوں کے ساتھ سوچنے لگی وہ کہاں سے ہو کر آئی ہے، اس مقام دیگر سے جہاں خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی تمام کشتیوں کو آگ لگائی تھی اور اب ......اب وہاں محض راکھ کا ڈھیر ہے اور اس ڈھیر میں سلگتی اس کی یادوں کی چنگاریاں......

"یونہی بس ادھر دل سا گھبرایا تو اس علاقے کو ڈس کور کرنے نکل پڑی اور رستہ بھول گئی۔"

"سر اٹھا کر جواب دینے تک وہ اپنے آنسو اور اپنے حوصلے دونوں ضبط کر چکی تھی، سولا پرواہی سے تھوڑا مسکرا کر بولی۔

"ڈس کور کرنے؟ تم کیا کولمبس کی جانشین بننے چلی تھیں اور خیر سے یہ کون سا امریکہ تھا جسے دریافت کرنے کا سہرا تمہارے سر آنا تھا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اوئے دیکھ اندر جا کر غسل خانے میں پانی ہے ٹب میں، نہا ہی لوں کیا آفت رات تھی۔ قیامت اف جو ایک پل بھی چین کی نیند آئی ہو۔" اس نے بڑے حقیر سے لہجے میں جگنو کو یوں اشارہ کر کے بلایا، جیسے کوئی کسی ملازم کو بلاتا ہے۔

جگنو ڈری ڈری نظروں سے پہلے شہریار کو اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا اسی وقت کمرے کی زمین پر ہلکی سی دھمک محسوس ہوئی۔

ایمن نے یونہی گردن گھمائی اور دھک سے رہ گئی۔

وہی ......گوشت سے بھرے گول مٹول چہرے والی عورت جس کے سارے نقوش اس گوشت کے فوم میں دھنس گئے ہوں آنکھیں بالکل گول ننھی ننھی، وہ چل رہی تھی مگر لگ رہا تھا بیٹھے ہوئے گھسٹ رہی ہے۔

"ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ شادی میں نہ بلاتا شادی کی اطلاع ہی دے دیتا، مرے ہوئے ماں باپ کے حوالے سے اتنا تعلق تو بنتا ہے ہمارا۔" وہ کمرے کے درمیان میں آ کر رکی تھی اور کوکو بھاگ کر ماں کا وہ نواڑی پیڑھا اٹھا کر لائی اور اس کے پیچھے رکھ دیا۔

کوکو ہی کے کندھوں کا سہارا لے کر وہ اس پیڑھے پر بیٹھ گئی تھی۔

شہریار نے جواب دینے کے بجائے گردن کا رخ نخوت سے دوسری جانب پھیرلیا، جیسے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھتا ہو۔

''بہنوں کے دل میں بھائیوں کی شادی کے سوا رمان ہوتے ہیں اور تو تو میرا اکلوتا ایک ہی ماں جایا تھا تو فقط خبر ہی بھیج دیتا میں اِدھر بیٹھی اپنے چاہ ارمان پورے کرلیتی، کوئی عزت ہی رہ جاتی میری اِدھر کٹڑی میں۔'' وہ شہریار کے بے نیاز رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے اسی لہجے میں بول رہی تھی، لجاجت بھرا معذرت خواہانہ انداز۔

شہریار اس طرح منہ پھیر کر بیٹھا رہا، ایمن کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس طرح کیوں کررہا ہے؟

''ماشاء اللہ چندے آفتاب، اللہ نظر بد سے بچائے کیا حور سی دلہن ہے میں تو نظر بھر کر دیکھ نہیں رہی کہ میری ہی نظر نہ لگ جائے، کیسا سوہنا روپ چڑھا ہوگا دلہن بن کر۔'' اب کے اس نے ایمن کی طرف رخ کیا اور بلائیں لینے والے انداز میں بولی۔

ایمن کو اس تعریف سے خوشی کے بجائے الجھن سی ہونے لگی۔

اسے تو یہی ملال کھائے جارہا تھا۔ شہریار نے اس سے اور خالہ بی سے جھوٹ کیوں بولا کہ اس کی بہن ملک سے باہر رہتی ہے اور...... بہن بہن بھی ایسی کہ...... اس نے جھکی جھکی نظروں سے اس گوشت چربی کے پہاڑ کو دیکھا۔

''میں کیا سوال کروں شہریار سے ابھی تو مجھے اس کا رویہ ہی سمجھ میں نہیں آیا اگر وہ ان لوگوں سے ملنا نہیں چاہتا تھا تو پھر اسے ادھر کیوں لے کر آیا۔''

''تمہاری ضد اور اصرار کی وجہ سے۔'' اسے فوری طور پر جواب بھی اپنے اندر سے ہی مل گیا۔

''ارے سلو ادھر آ۔'' اس نے دونوں کی چپ سے مایوس سا ہوکر دوسرے کمرے میں بیٹھے سلو کو پکارا۔

وہ کچھ ثانیے توقف کرنے کے بعد بیزار سا اٹھ کر ماں کے پاس آگیا۔

ماں نے نجانے اس کے کان میں کیا کہا اس کے چہرے کے زاویے اور بھی بگڑ گئے۔

''میں نہیں جاؤں گا۔'' وہ رسی تڑانے والے جانور کی طرح اڑی کرنے لگا۔

ماں نے پھر لجاحت سے کچھ کہا، آواز اتنی دھیمی تھی کہ دو قدم پر بیٹھی ایمن بھی سن نہیں پا رہی تھی۔

وہ بالآخر پیر پٹختا چلا گیا۔

''اوے سنا نہیں تو نے، اندر جا کر دیکھ پانی آرہا ہے؟'' شہریار غصے میں خفا سا چہرہ لیے

اسی تمکنت اور تضحیک بھرے انداز میں جگنو سے بولا۔ وہ اس طرح ڈری سہمی نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

''جانا ماموں کہہ رہا ہے۔ دیکھ اندر پانی آرہا ہے؟ کوکو تولیہ لادے اندر سے۔'' ماں نے یوں کہا جیسے ماموں بڑے لاڈ سے کہہ رہا ہو اور بھانجا نخرے دکھا رہا ہو۔

جگنو بادل نخواستہ کچھ ڈرا ہوا سا شہریار کے آگے سے گزر کر کمرے کے اس سنگل دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

کوکو تولیے کے نام پر پیلی پھٹک داغوں والی دھجی سی اٹھا کر لائی، جسے شہریار نے پرے اچھال دیا تھا۔

''آ...... آرہا ہے پانی ٹونٹی میں۔'' جگنو نے اندر آکر کونے میں کھڑے ہوکر اطلاع دی تھی۔ شہریار اس کو پرے جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

ایمن ان کے سامنے مجرم بنی بیٹھی تھی۔

''شروع ہی سے ایسا ہے الگ الگ سب سے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر اس معذرت خواہانہ انداز میں بولنے لگی۔

''آج کے اس دور میں جب پیسے سے بڑا کوئی تعلق اور روپے سے بڑا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا تو یہ بے چارہ بھلا کیوں زمانے کے طور طریقے سے ہٹ کر چلتا۔ اس کی خوشی میں راضی تھی میں، جب دل میں ہوک اٹھتی قبروں میں لیٹے ماں باپ کی یاد اٹھتی اس کے لیے بھی خوامخواہ دل تڑپ اٹھتا تھا یہاں آکر رہے ہمارے دکھ درد کا سانجھی ہے۔ کوئی کب تک اس بے وجہ کے کاروبار میں سانجھی بنے۔ ہاں اس کی خوشیوں کی لمبی عمر کی دعا ضرور کرتی تھی یا کبھی آکر اپنی چاند سی صورت مجھے دکھادے۔''

ایمانداری سے کہو لگتا ہے نا شہزادہ کسی ریاست کا...... مجھ سے ہم اس سے کٹڑی کے ہر کڑیل جوان سے زیادہ سوہنا اور گھبرو۔'' وہ ایک دم جوش محبت میں مغلوب سی ہوکر معلوم نہیں اس سے استفسار کررہی تھی یا اپنے دلی جذبات کا اظہار۔

''یہ معلوم نہیں تھا اب سوہنا اتنی کرموں کی بارش کردے گا کہ اپنی چاند سی ووہٹی لے کر سیدھا ادھر ہی آئے گا، اماں ابا کی روحیں رات سے کیسی نہال ہوں گی اور میں نگوڑی کم نصیب کوئی شگن کرنے جوگی بھی نہیں اس نے بتایا ہوتا کوئی اطلاع بھجوائی ہوتی تو چاہے جان گروی رکھتی۔ کوئی نہ کوئی اہتمام تو کرتی پر اس نے تو سو غیروں والا سلوک کیا اور چل ادھر آہی گیا تو......''

جیسے ہی شہریار نہا کر اندر داخل ہوا اس کی تیزی سے چلتی زبان رک سی گئی۔

رات کی اتاری ہوئی بنیان سے اس نے گیلے بالوں اور جسم کو رگڑا اور خالی شرٹ پہن کر بے نیازی سے گیلے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

''میرے کپڑے تم نے کون سے سوٹ کیس میں رکھے تھے میں گاڑی سے اپنے کپڑے نکال لاتا ہوں اور تمہیں بھی چینج کرنے ہوں گے تمہارا کون سا سوٹ لے آؤں۔'' وہ مڑ کر سر جھکا کر بیٹھی ایمن سے یوں بولا تھا جیسے کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں ہو۔

ایمن نے ہچکچاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو سوٹ کیس ہی لے آئیں نا۔ میں خود ہی نکال لوں گی۔'' وہ لمحہ بھر بعد بولی تو شہریار کی فراخ پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''یہاں ...... یہاں پورے سوٹ کیس؟ کہاں رکھو گی۔'' وہ یوں چیخ کر بولا جیسے وہ کسی گٹر کے کنارے بیٹھے ہوں۔

''یا ...... یہاں ہی۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''خیر! میں ابھی اپنے کپڑے اور تمہارا کوئی سا بھی سوٹ نکال لاتا ہوں اس پر پھر بات کریں گے اور......''

''اماں! یہ لیں۔'' اسی وقت سلو ایک بڑے سے خاکی لفافے میں کچھ لے کر آیا لفافے کے باہر جگہ جگہ گھی لگا تھا۔

''کوکو! چینی کی جو دو پلیٹیں پڑی ہیں وہ لے آ یہ تین تین شکر پارے کٹڑی کے سارے گھروں میں جگنو جا کر دے آتا ہے اور ساتھ بتا آنا کہ میرے ماموں آئے ہیں شادی کے بعد پہلی بار، اس لیے اماں نے مٹھائی بانٹی ہے ورنہ ساری کٹڑی کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے گا کہ زاہدہ آج کیسے اتنی دیالو بن گئی۔''

وہ لفافہ اپنی گود میں رکھے کہہ رہی تھی جس میں بمشکل آدھا کلو وزن کی کوئی چیز تھی۔

کوکو چینی کی سرخ پھولوں والی پرانی سی دو پلیٹیں لے آئی جس کے کنارے جگہ جگہ سے تڑخے ہوئے تھے اور زاہدہ گن گن کر تین تین شکر پارے لفافے میں سے نکالتی اور پلیٹ میں رکھ دیتی۔

''اماں! ایک ہی بار دے دیں۔ میں بار بار سیڑھیاں اتروں چڑھوں گا نہیں۔ پہلے ہی مجھے بھوک لگی ہے۔'' جگنو فوراً بگڑ گیا۔

''اتنے برتن تجھے گھر میں نظر آتے ہیں جو ایک ہی بار دوں۔'' وہ اب لفافے کے اندر منہ گھسائے شکر پاروں کی گنتی کر رہی تھی انہماک ٹوٹنے پر خفگی سے بولی۔

''ارے سلو! یہ تو کم رہیں گے۔ خالہ چھٹن اور بوبی لوگوں کی طرف بھی تو دینے ہیں اور

لے آ جا کر۔'' انہوں نے باہر اسی چارپائی پر بیزار بیٹھے سلو کو آواز لگائی۔

''ہاں طیفا حلوائی میرا ماما......'' وہ زبان پھسلنے پر لمحہ بھر کو رکا۔ ''وہ ایک ٹکڑا بھی نہیں دے گا نہ میں لینے جاؤں گا۔ صاف بتا رہا ہوں۔'' سلو نے وہیں سے کرارا جواب دیا۔

''آخر اس تماشے کی ضرورت کیا ہے۔ کیا ٹکٹ لگائی ہے۔ ہمارے یہاں آنے پر رہنے دیں۔ یہ سب ان کو دے دیں یہ کھا لیں گے۔'' شہریار نے پاس سے گزرتے ہوئے جھلا کر وہ دونوں پلیٹیں بھی دوبارہ لفافے میں انڈیلیں اور خالی پلیٹیں مسہری پر اچھال کر فوں فوں کرتا باہر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''بڑا جھلا ہے میرا بھائی بالکل بھولا۔ لو اسے کون بتائے کہ ایسے موقعوں پر کیا کیا شگن ہوتے ہیں۔ کیسے ماں بہنیں رسمیں کرتی تھکتی نہیں اور ایک یہ ہے کہ مجھ نمانی کی اس معمولی خوشی کو بھی تماشا کہہ رہا ہے۔ میرے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھے، کیسی مجبور اور شرمندہ ہوں ایک بھائی وہ بھی جسے خود اپنی گود میں لے کر پالا ہو۔ اس کی زندگی کے اتنے اہم موقع پر میرے پاس اس کی خوشی منانے کے لیے کچھ بھی نہیں......'' اس نے کہتے ہوئے دوبارہ سر لفافے میں گھسا لیا۔

''کوکو پلیٹیں لے کر آ جا، منیا تو خالہ خورشید کی طرف دے آ اور یہ جگنو''

''اماں اس کو نہ دینا یہ رستے ہی میں چٹ کر جائے گی۔'' کوکو نے فوراً تنبیہ کی، منیا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''چل جگنو! میرا بچہ تو ماں کا کہنا مان اور فٹافٹ سارے گھروں میں جا کر دے آ۔'' اس نے منیا کی طرف بڑھائی ہوئی پلیٹیں کھینچ کر جگنو کو تھمائیں اور اگلی گنتی کرنے لگی۔

''تو ایمن طاہر حفیظ! یہ سرپرائز تھا زندگی کے پاس آپ کے لیے، آپ کی شادی کے شکر پارے شہر کے اس پس ماندہ ترین علاقے کی اس بدبودار کٹڑی میں بانٹے جائیں گے اور شہریار......''

☆☆☆

''تمہارا ایڈونچر تمام ہوا یا ابھی کچھ اور محظوظ ہونے کا ارادہ ہے۔'' شام کو چلنے والی تیز آندھی اور جھکڑوں کی وجہ سے وہ دو کمروں کا پورشن مٹی سے اٹ گیا تھا مگر حبس اور گھٹن میں خاصی کمی واقع ہوگئی تھی۔

شہریار صبح ناشتے کے بعد جو نکلا تو اس آندھی کا زور ٹوٹنے کے بعد ہی لوٹا تھا، ہاتھ میں چار نان اور آٹھ کباب کا شاپر لیے۔

اس سے تو ایک نوالہ بھی توڑا نہیں جا رہا تھا۔ لگ رہا تھا نوالہ منہ میں ڈالے گی اور گرد ہر

طرف پھیلی مٹی اس نوالے میں آجائے گی اور اس کے دانتوں کے نیچے کچر کچر...... اسے تو اس خیال ہی سے ابکائی آنے لگی تھی۔

صبح ناشتے میں بھی نان چنے لے آیا تھا۔شہریار نے صبح بھی خوب پیٹ بھر کر ناشتہ کیا تھا۔ شاید اس کا پیٹ بھر گیا تھا جو وہ بچا ہوا ڈیڑھ نان اور تھوڑے سے چنے ٹرے میں یہ چھوڑ گیا تھا۔

چاروں بچے دروازے کی اوٹ سے ان کو ناشتہ کرتے دیکھتے رہے تھے ان کے مسلسل دیکھنے کی وجہ سے وہ تین چار لقموں سے زیادہ نہیں کھا سکی تھی اور شہریار کے سیڑھیاں اتر کر جاتے ہی منیا لپک کر اندر آگئی تھی۔

"آپ نے یہ کھانا ہے۔" اس نے فوراً وہ بچا ہوا نان اور چنے جھپٹے تھے ایمن کے نفی میں سر ہلاتے ہی وہ باہر بھاگ گئی۔

اور باہر پھر جو لڑائی ہوئی اور چیخم دھاڑ مچی پہلے تو اسے اس لڑائی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ڈر کر اپنی جگہ بیٹھی رہی، جب چیخیں اور شور زیادہ بڑھا تو اٹھ کر باہر آگئی۔

منیا کے منہ میں نان کا بڑا سا ٹکڑا ٹھنسا ہوا تھا۔باقی کا نان اس کے ہاتھ میں تھا جسے سلو اور جگنو جھپٹنے کی کوشش میں کبھی اس کے بال نوچتے کبھی اسے تھپڑ اور مکے مار رہے تھے اور وہ ابھی ایسی سخت جان مار کھائے جا رہی تھی مگر نان ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہی تھی۔

زاہدہ اس اونچے سے نواڑی پیڑھے پر بیٹھی انہیں گالیاں اور کوسنے دیتے ہوئے چنوں کا لفافہ انگلیوں سے چاٹ رہی تھی، جیسے ہی اس کی نظریں ایمن سے ملیں دونوں شرمندہ سی ہو گئیں۔

ایمن چپکے سے اندر کمرے میں لوٹ گئی۔

اور وہ سارا دن اس نے اس کمرے میں اکڑوں کرسی پر بیٹھے گزار دیا دوبارہ نہانے کے لیے پچھلی طرف بنے اس غسل خانے کی طرف گئی اور لوٹ آئی۔

چھوٹا سا اینٹوں اور مٹی سے خود بنایا جانے والا غسل خانہ جس پر ٹین کی چھت تھی اور دروازے کی جگہ بوریاں کاٹ کر سیا گیا پردہ۔

اگرچہ موٹی ٹونٹی سے پانی کی دھار بہت ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی اور اس کا نہانے کو دل بھی بہت کر رہا تھا مگر جگہ جگہ سے بڑے بڑے سوراخوں والا دروازے کی جگہ ٹنگا پردہ، اسے دوبارہ کمرے میں چلے آنے پر مجبور کر دیتا۔

دوپہر تک وہ شہریار کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔

پھر نہ جانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی، وہ اسی طرح زمین پر وہی میلا سا تکیہ لیے جو کروٹ لے کر لیٹی تو زور زور سے بجتے دروازوں اور کھڑکیوں کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

باہر زوروں کی آندھی آرہی تھی اور آندھی کے شور کے علاوہ بڑوں اور بچوں کا شور الگ سے تھا۔

"اٹھ گئیں تم۔ادھر سے عورتیں آرہی تھیں بار بار تم سے ملنے۔"

زاہدہ باجی پتا نہیں کیسے جھکے جھکے اندر آئی تھیں اسے بیٹھے دیکھ کر بولیں۔اس نے زبان سے کیوں پوچھنے کی بجائے نظروں سے سوال کیا۔

"ماشاء اللہ سے دلہن ہو تم شہریار کی اور شہریار کو تو ادھر سب ہی جانتے ہیں پھر صبح مٹھائی بھیجی تھی سارے گھروں میں تو سب نے دلہن دیکھنے کو لازماً آنا ہی تھا۔" انہوں نے جیسے بڑے پتے کی بات کی۔اسے ایک دم سے غصہ سا آگیا شاید مٹھائی کا نام سن کر جو صبح بھیجی گئی تھی۔

"سوری، میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی اور نہ کوئی مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔" وہ بدمزاجی سے کہتے ہوئے اٹھی اور باہر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ٹھنڈے پانی سے جی بھر کر ہاتھ منہ بازو اور پاؤں دھوئے اور کافی دیر وہیں کھڑی چھوٹی سی طاق نما کھڑکی سے نیچے گزرتی تنگ پتلی سی گلی میں دیکھتی رہی۔

شاید عام دنوں میں وہ ادھر آتی تو ایک منٹ کے لیے بھی ادھر نہ ٹھہرتی مگر اب کیا کرے، کدھر بھاگ کر جائے۔

اپنی بے بسی پر کوفت، غصہ اور نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

شہریار آئے تو وہ اس سے دو ٹوک بات کرے کہ جو تھوڑی بہت سیونگ اس کے پاس ہے وہ اس سے کوئی مناسب سا گھر ماڈرن طرز کا رینٹ پر لے لے مگر وہ یہاں نہیں رہے گی۔

یہاں کے در و دیوار، یہاں کے لوگ، یہاں کی طرز زندگی اسے ایک ہی رات میں سب سے نفرت بے تحاشا نفرت، محسوس ہونے لگی تھی۔شہریار جو ان لوگوں سے کٹ کر رہا تو بالکل حق بجانب تھا۔

"اف کس قدر نفرت انگیز ہے ان لوگوں کے بیچ رہنا۔"

اسے صبح اور پھر دن کے مختلف اوقات میں منیا اور دوسرے بہن بھائیوں کا آپس میں لڑنا اور گالی گلوچ کرنا اور وہ بھی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لیے......

"شہریار لا سکتا ہے۔کم از کم تھوڑا ناشتہ کھانا زیادہ لے آئے تو ان لوگوں کو اس طرح لڑنا نہ پڑے۔"

اسے دن میں کئی بار یہ خیال آیا تھا اور اس بات پر آکر اس کا دل شہریار سے اختلاف کرتا کہ اسے کم از کم یہاں رہنے کے عوض ہی سہی دو تین روٹیاں نان ان کے لیے زیادہ لے آنی

چاہئیں اور اب پھر وہ اسی طرح چار نان اور کباب لے کر آیا تھا۔

کچھ تو ہر طرف پھیلی مٹی اور کچھ ان لوگوں کا باہر والے کمرے میں خالی بیٹھے ان کے کھانے سے فارغ ہونے کا انتظار کہ کب وہ ایک آدھ نان چھوڑیں اور وہ اسے جھپٹنے کے لیے دنگا کریں۔ ایمن سے کھایا نہیں جا رہا تھا اگرچہ وہ دن بھر کی بھوکی تھی۔

''کھاؤ نا۔ تم نے دن میں کچھ کھایا تھا؟'' وہ پہلا نوالہ ہی ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی جب شہریار نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔ اس نے ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کھاؤ، صبح بھی تم نے دو چار نوالے لیے تھے۔'' وہ صبح ہی کی طرح خوب رغبت سے کھا رہا تھا۔

''ان لوگوں کے لیے بھی لے آتے۔'' اس نے دبی زبان میں بالآخر کہہ ہی ڈالا۔

شہریار کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا تھا ذرا غور سے ایمن کی طرف دیکھا۔

''تمہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اسی طرح رہنے کے عادی ہیں، کھاؤ تم۔''

وہ کیسی بے حسی سے کہہ رہا تھا اگرچہ اسے بھی ان سے کوئی ہمدردی یا محبت نہیں تھی مگر...... بحیثیت انسان انسانیت کے رشتے سے......اور وہ اتنی کمنی اور گری ہوئی تو کبھی نہیں رہی تھی۔

اخبار کے ٹکڑے پر پڑے نان اور کباب تیزی سے ختم ہوتے جا رہے تھے۔

''پھر بھی انہیں پوچھنا تو چاہیئے ...... بھوک ...... بھوک لگی ہوئی ہے انہیں بھی۔'' بھوک کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جیسے اس کی اپنی بھوک بھی چمک اٹھی۔

''رہنے دو، جو بچے گا دے دینا۔'' وہ لاپروائی سے بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولا تو پہلی بار ایمن کو اس کا خوب صورت چہرہ اور وجیہہ قامت بہت بدصورت بے ڈھنگی سی لگی۔ زاہدہ باجی سے بھی زیادہ بے ڈھنگی اس نے خود پر بہت جبر کرتے ہوئے چھ سات نوالے کھائے اور باقی کا ایک نان اور کباب ......اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

''اوئے چھوٹے ادھر آ۔'' شہریار نے ایک بڑا سا ڈکار لیتے ہوئے سہمے ہوئے جگنو کو بڑی حقارت سے پکارا۔ پتا نہیں ان کو مخاطب کرتے ہوئے اس کا لہجہ ایسا حقیر کیوں ہو جاتا تھا۔

جگنو ڈرا ڈرا سا اندر آیا۔

''یہ لو، کھالو جا کر اور یہ......'' اس نے ایمن کی مشکل دیکھتے ہوئے لحہ بھر کو سوچا اور شرٹ کی اوپری جیب میں پڑا بیس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس سے تین چار نان یا روٹیاں اور لے آؤ اور کھالو۔'' نوٹ جگنو کو پکڑا کر اس نے شاباش لینے والے انداز میں ایمن کی طرف دیکھا جو اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی اس کا سارا دھیان باہر جاتے جگنو اور شروع ہونے والے متوقع جھگڑے

کی طرف تھا۔

مگر اس بار باہر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ شاید اس بیس کے نوٹ نے جھگڑے کو دبا لیا تھا۔

باہر آدھا پون گھنٹہ کھڑ پڑ ہوتی رہی۔

''اماں! میں اوپر جا رہا ہوں سونے۔ ادھر تو جگہ نہیں ہے۔'' یہ یقیناً سلو کی آواز تھی بھاری پھٹے ڈھول کی سی۔

''یہ جگنو کو بھی لے جا اپنے ساتھ۔'' زاہدہ باجی نے لجاجت سے کہا۔ سلو نے شاید کوئی اختلاف نہیں کیا تھا اس لیے اس جملے کے بعد باہر مکمل سکون سا ہو گیا تھا۔

دونوں لڑکیاں شاید ماں کے ساتھ باہر ہی لیٹ گئی تھیں۔

شام کی آندھی کی وجہ سے اس بوڑھے پنکھے کی گردش بھی قدرے بہتر تھی۔

''اور باہر...... باہر تو یہ پنکھا بھی نہیں ہے۔'' خیال آتے ہی عجیب سے احساس ندامت میں وہ گھر سی گئی۔

شہریار اسی غسل خانے کی طرف جا کر نائٹ سوٹ کے نام پر ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن آیا تھا۔

''آف آج پھر اس بے آرام جگہ پر سونا پڑے گا وہ بھی ایسی گرمی میں۔'' کمرے میں آتے ہوئے وہ کوفت بھرے انداز میں بولا تھا۔

ایمن چپکی بیٹھی رہی مگر زیادہ دیر چپ رہنا بھی تو ممکن نہیں تھا۔

''تمہارا یہ ایڈونچر تمام ہوا یا ابھی اور محفوظ ہونے کا ارادہ ہے۔'' اس نے وہی میلا چیکٹ تکیہ دوہرا کر کے سر کے نیچے رکھا اور بلب کی ٹمٹماتی زرد روشنی میں کرسی پر اکڑوں بیٹھی ایمن سے پوچھا۔

ایمن نے ایک بار نظر اٹھا کر شہریار کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟''

اب زیادہ دیر تک سر جھکانا اور چپ رہنا ممکن نہ تھا۔

''تو اور کیا کریں پھر؟'' وہ بے بس سی ہو کر بولی۔

''کرنا کیا ہے۔ صبح چلتے ہیں واپس۔'' وہ اسے نیم رضامند سا دیکھ کر جوش میں اٹھ بیٹھا۔

''کہاں واپس!'' وہ ذرا توقف سے مدھم آواز میں بولی۔

شہریار نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی یادداشت کھو گئی ہو۔ ''گھر اور کہاں؟''

''کون سے گھر؟'' اب کے وہ سیدھی ہو کر بولی۔

''تمہارے گھر اور کون سے گھر؟'' وہ تحمل سے بولا۔

''میرا گھر؟'' وہ سوالیہ لہجے میں الٹا پوچھنے لگی۔

''کم آن یار! اب یہ نہ کہہ بیٹھنا۔ میں کون ہوں؟'' وہ یوں بولا جیسے اس کے سوال سے لطف اندوز ہوا ہو۔

''شہریار! کیا آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں؟'' اس بات کا احساس اسے شہریار کے ریلیکس انداز دیکھ کر کئی بار ہوا تھا مگر پھر اس نے سر جھٹک دیا تھا کہ وہ تو سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا چکی ہے۔

''کیسی غلط فہمی؟'' وہ ٹھٹھکا۔

''جو کچھ میں آپ کو اپنے متعلق بتا چکی ہوں اس کے بارے میں۔'' شہریار کے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کا شک درست ہے۔

''کیا بتا چکی ہو؟'' وہ آنکھیں سکوڑ کر اسے تکتے ہوئے بولا تو دوسری بار اس بیان کی ہوئی تلخ ترین حقیقت کو بتانے کے لیے اس کا حلق سوکھ گیا۔ لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہ سکی۔

''یہی کہ ......'' اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ ''میں ...... میرے پیرنٹس وہ گھر انکل راشد پاپا کے پارٹنر خرید چکے ہیں اور وہ آگے شاید سیل بھی کر چکے ہیں اور ہم نے ...... میں نے اور خالہ بی نے وہ گھر خالی کرنا تھا۔ انہیں ڈیٹس میں جب ہماری شادی ہوئی سو میں ...... ہم آتے ہوئے چابیاں گھر کی انہیں دے آئے سو...... سو اب وہ تو ہمارا نہیں رہا تو ...... تو پھر کہاں جائیں گے۔''

وہ اتنی مشکل سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مناسب الفاظ لائی تھی جس سے اس تلخ ترین حقیقت کو بیان کے قابل بنایا جاسکے مگر اب شہریار کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھتے ہوئے ایمن کو لگ رہا تھا اس کی کوشش بیکار گئی۔

''تو اس روز جب خالہ بی نے تمہارا پرپوزل میرے آگے رکھا اور تم نے مجھ سے بات کی کہ میں تمہیں کیوں پسند کر رہا ہوں۔ تم نے جو باتیں بیان کیں کہ شاید تمہارے پیسے اور امارت کی وجہ سے اور بعد میں تم نے خود ہی تصحیح کی کہ تم ...... اب امیر نہیں رہیں دیوالیہ ہو چکیں کہ تمہارے والدین تمہارے کے لیے کچھ بھی چھوڑ کر نہیں گئے ایسے ہی ہوا تھا نا!''

وہ اس سے تو مخاطب تھا مگر اپنے دماغ میں ساری باتوں کی کڑیاں جوڑتے شاید اپنے دل میں موجود اس غلط فہمی کا سرا پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے باعث وہ اتنے سارے گھنٹے، اندھیرے...... مکمل اندھیرے میں رہا۔ جبکہ وہ سمجھتا رہا کہ وہ چکا چوند روشنیوں میں آگیا ہے اور اب ان روشنیوں پر وہ اندھیرا چھا رہا تھا...... چھا گیا تھا۔

ایمن نے آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلایا اس کی تائید کے لیے......

''تو گویا تم ...... جو میں سمجھا'' وہ بولتے بولتے رکا۔ ''کہ تم میرا ٹرائل لے رہی ہو۔ مجھے آزما رہی ہو، پرکھ رہی ہو کہ میں کسی لالچ میں آکر تو تم سے شادی نہیں کر رہا ہے۔ نا!'' وہ اب بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔

ایمن نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ایسی بات تھی۔ اس لیے تم نے مجھ سے یہ سب کہا۔ میں چپ چاپ تمہارے گھر سے اٹھ کر آگیا۔ تم سمجھیں کہ میں واقعی لالچی تھا اس لیے خاموشی سے لوٹ گیا۔ مگر پھر...... پھر میں دوبارہ آگیا۔ پرجوش اور خوش تم سے شادی پر راضی تمہاری اس مکار بڑھیا خالہ بی کے جال میں پوری طرح پھنستے ہوئے محض ایک ہفتے کے اندر شادی پہ راضی ہے نا!''

اس کے تھوڑی بدلی ہوئی ٹون میں بات کرنے پر ایمن کے اندر کچھ بیدار سا ہوا تھا۔ وہ چونکی سی ہو کر سننے لگی۔

''تو تمہارے خیال میں، میں محض تمہاری محبت، تمہارے حسن کی کشش سے کھنچا تم سے شادی کرنے چلا آیا تھا۔ تو سنو ایسا بالکل نہیں تھا۔ تم جیسی نہ جانے کتنی روز راہ چلتے سڑکوں پر ماری ماری پھرتی نظر آتی ہیں بلکہ تم سے بھی کچھ زیادہ حسین، ان پر مجھ جیسوں کا دل کیوں نہیں آجاتا کہ ہم اندھے باولے ہو کر ان سے شادی کے لیے مرے جاتے ہیں سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی کہ وہ ہم سے بھی کم حیثیت ہیں تو ڈیئر یہ بات نہیں تھی۔''

جیسے اس کے اپنے دماغ سے وہ بھی اندھیرا چھٹ رہا تھا جو چند لمحے اس کے دماغ پر چھایا جا رہا تھا۔

''میں نے باقاعدہ معلومات لی تھیں تمہارے بارے میں، تمہارے باپ کی پراپرٹی کے بارے میں، اور مجھے جس شخص نے یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے شرطیہ کہا تھا کہ کروڑوں کی نہ سہی مگر تم اب بھی لاکھوں کی مالک ہو اور اس نے گارنٹڈ یہ بات کی تھی کہ اس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں اور اب تم فرما رہی ہو کہ تم وہ گھر بھی دے آئی ہو بلکہ وہ تمہارا رہا ہی نہیں......''

وہ اب اسے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے کوئی راہ فرار تلاش کر کے شکار کو گھورتا ہے۔

''اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں اور میں ......'' وہ آہستگی سے کہنے لگی مگر شہریار نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''کچھ بھی فائنل بولنے سے پہلے اپنے دل و دماغ میں واضح طور پر سمجھ لینا کہ میں نے تم سے شادی بہرحال نہ تمہارے حسن سے متاثر ہو کر کی تھی، نہ محبت سے، نہ کسی عشق وشق میں پڑ کر ...... میں نے تم سے شادی محض تمہاری دولت، تمہارے پیسے کے لیے کی تھی۔ اب بولو۔''

وہ اتنی تیزی سے اور کٹھور پن سے بولا کہ ایمن گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

وہ کہہ رہا تھا کہ ”اب بولو۔“ اب وہ کیا بولتی ...... محض پیسے کے، دولت کے لیے اور...... ان کے بغیر اس شخص کی نظر میں رشتوں کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا دھیان بے اختیار باہر دو قدم پر پنکھے کے بغیر سوئے اس گوشت کے پہاڑ اور سوکھی چرمرخ لڑکیوں کی طرح چلا گیا جن سے اس کا خون کا رشتہ تھا اور مجھ سے...... مجھ سے تو اس کا خالی لفظوں کا رشتہ ہے۔

بول دینے کے بعد اس کے پاس کیا بچے گا۔ ایمن کو لمحہ بھر میں احساس ہو گیا۔ نفع اور خسارہ، سارے گوشوارے اس کی نظروں کے سامنے روز روشن کی طرح کسی بساط کی مانند سجے ہوئے تھے اس کے باوجود اسے بولنا تھا اور سچ ہی بولنا تھا۔

”جس کسی نے بھی آپ کو میری پراپرٹی میری جائیداد یا میرے دولت مند ہونے کے بارے میں اطلاع دی اس کے پاس بوگس نالج تھی شاید سال بھر پہلے کا یا کم سے کم آٹھ دس سال پہلے کا ورنہ اب تو یہ بات تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ میرے پیرنٹس میرے لیے واقعی کچھ بھی نہیں چھوڑ کر گئے۔ کیوں، اس کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود میرا دماغ شل ہو چکا ہے جبکہ میں ان کی اکلوتی، اکیلی بیٹی تھی بغیر کسی قریبی خونی رشتے کے، ان کے بعد دنیا میں تنہا رہ جانے والی ...... پھر بھی وہ میرے لیے کچھ نہیں چھوڑ کر گئے۔“

آخر میں اس کے گلے میں جیسے ریت سی بھرنے لگی وہ لب بھینچ کر چپ ہو گئی۔

شہریار زمین پر یوں اکڑوں سر پکڑے بیٹھا تھا جیسے اس کا کوئی بہت قریبی عزیز، کوئی پیارا اچانک مر گیا ہو اور وہ ناقابل یقین سی حالت میں اس کی میت کے پاس اکڑوں بیٹھا ہو۔

”تم میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہیں؟“ بہت دیر بعد اس کی ڈوبتی آواز کسی پاتال سے آئی تھی۔

”نہیں...... نہیں ہے یہ مذاق۔“ وہ اتنی زور سے ہسٹریائی انداز میں چیخی کہ باہر کے کمرے سے بے ساختہ کسی کی کون؟ کون؟ کی آواز آئی تھی۔

شہریار پلک جھپکے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ یہ مذاق ہے؟ یہ سچ ہے اور کتنی بار پوچھ پوچھ کر میرے زخموں پر نمک چھڑکیں گے۔ بس کریں۔ کرلیں اب اس حقیقت پر یقین کہ میں ایک عام معمولی سی کم حیثیت ایمن طاہر حفیظ ہوں جس کا باپ مرتے ہوئے اس کے لیے صرف اپنا نام ہی چھوڑ کر گیا اور بس۔“

وہ کسی بھی بات کا خیال کیے بغیر گہری ہوتی رات کے سناٹے میں گونجتی اپنی آواز سے بے

پروا بولتی چلی گئی۔

شہریار تو جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔

”تھوڑا بہت میرے پاس ہے۔ اتنا کہ ہم کوئی اچھا سا گھر اچھے علاقے میں رینٹ پر لے سکتے ہیں یا اگر کچھ آپ کے پاس بھی ہو تو ملا کر ایک چھوٹا سا گھر یا فلیٹ بھی لے سکتے ہیں ساتھ میں کوئی سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی اس کے علاوہ ہمیں اور کیا چاہیے ہم نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کر سکتے ہیں پوری سچائی اور ٹھوس حقیقت کے ساتھ۔“

ایمن کو اپنے بولنے کے تھوڑی دیر بعد ہی شہریار کے پتھر وجود کا احساس ہوا تھا اس پتھر میں زندگی کی کونپل کھلانے کے لیے پتھر میں جونک لگانے کے لیے اور کچھ...... کچھ یہاں سے نکلنے کی صورت پیدا کرنے کے لیے اس نے بڑی لجاجت بھرے انداز میں اس کے پاس جا کر اکڑوں بیٹھتے ہوئے بڑی ملائمت سے اس کا سرد پڑتا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا۔

”کتنا ہے تمہارے پاس؟ دس بیس تیس چالیس ستر اسی ہزار اور بس...... اس طرح رینگ رینگ کر سسک سسک کر کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی اسٹارٹ کرنے کے لیے میں نے تم سے شادی کی تھی تم سے...... پھر تم ہی رہ گئی تھیں شادی کے لیے۔ تم......“

وہ پہلے تو پاگلوں کی طرح چیخا اور پھر اتنی زور سے اُسے دھکا دیا۔ وہ جو پیروں کے بل بیٹھی تھی لڑھکتی ہوئی کرسی کے پاس جا گری۔ اس کا سر پیچھے سے کرسی کی لکڑی سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

اس کے ہاتھوں اس کے جسم پر لگنے والی پہلی چوٹ! وہ ششدر سی سر پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تمہارے پاس پوری رات ہے سوچنے کے لیے۔ مجھے اپنی زندگی ہزاروں سے نہیں لاکھوں سے اسٹارٹ کرنی ہے۔ کم از کم اسٹارٹ۔ اگر تمہارے پاس ایسا کوئی آپشن ہے تو ٹھیک ورنہ تم میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔“

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے اٹھ کر روشنی گل کی اور دوبارہ اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گیا اور وہ ملگجے اندھیرے میں بیٹھی سر کے پچھلے حصے سے اٹھتی ٹیسوں کو برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایسا کوئی ”آپشن“ سوچنے لگی جس کے بارے میں شہریار نے اس سے کہا۔

☆☆☆

ٹھاہ، کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

وہ کرسی کے پاس سکڑی سمٹی نہ جانے کس وقت آپشن کے متعلق سوچتی گہری نیند سوگئی تھی۔

شہریار اس کے سامنے تیار حلیے میں کھڑا تھا۔

وہ کچھ دیر اسے یونہی دیکھتی رہی۔ ذہن ابھی بھی غنودگی میں تھا۔

پاکٹ ہیئر برش سے برش کرنے کے بعد وہ مسہری پر بیٹھا جرابیں جوتے پہن رہا تھا۔

''کہاں جارہے ہیں؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رات آخری لمحات میں ہونے والی گفتگو قطعی طور پر اس کے ذہن سے نکل چکی تھی۔

شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے جرابیں پہن کر جوتے پہننے لگا۔ اس کے لب اس روز کی طرح بھینچے ہوئے تھے جیسے پہلے روز گاڑی میں یہاں آتے ہوئے رستہ بھر اس کے ہونٹ جڑے رہے تھے۔

ایمن کے دماغ میں کچھ کلک سا ہوا۔

اسے رات کا وہ ''دھکا'' یاد آیا جو شہریار نے اسے دیا تھا اور وہ کرسی سے جاٹکرائی تھی اور اس کے سر کے پچھلے حصے میں چوٹ آئی تھی اور درد...... اس کا ہاتھ بالکل غیر ارادی طور پر سر کے اس حصے کی طرف گیا جہاں ہلکا سا ابھار پیدا ہوگیا تھا۔

''کتنا ہے تمہارے پاس دس بیس، تیس چالیس ستر اسی ہزار اور بس...... اس طرح رینگ رینگ کر سسک سسک کر کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی اسٹارٹ کرنے کے لیے میں نے تم سے شادی کی تھی تم سے...... پھر تم ہی رہ گئی تھیں شادی کے لیے تم......''

اس نے ہولے سے اس ابھار کو دبایا تو ہلکی سی ٹیس ابھری اور شہریار کے لفظ سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اترنے لگے۔

''تمہارے پاس پوری رات ہے سوچنے کے لیے۔ مجھے اپنی زندگی ہزاروں سے نہیں لاکھوں سے اسٹارٹ کرنی ہے کم از کم اسٹارٹ! اگر تمہارے پاس ایسا کوئی آپشن ہے تو ٹھیک ورنہ تم میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ، مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔''

ایک ایک کر کے اسے وہ پچھلے سیسے کی مانند سارے لفظ یاد آنے لگے وہ پلک جھپکے بغیر یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔

''اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ جلدی کرو۔'' ایمن نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ یہ سرگوشی کس نے کی تھی۔ یہ الارم تو اس کے اندر سے بجا تھا۔

وہ بال سمیٹتی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

اس لمحے شہریار بھی مسہری سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔

اس سرسری سی نگاہ میں کیا نہیں تھا۔ زمانے بھر کے بیگانگی، اجنبیت اور...... شاید تھوڑی سی نفرت اور حقارت بھی...... ویسی نفرت اور حقارت جو جگنو اور مینا کو آواز دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

''کک...... کہاں جارہے ہیں آپ؟'' اسے اپنی آواز سے وحشت ٹپکتی محسوس ہوئی۔

شہریار نے تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم مجھے سخت جان کہو، حوصلہ مند یا ڈھیٹ۔ مگر ایسا ہے کہ میں اپنے نقصانات، اچانک ہو جانے والے خسارے پر بہت دیر تک بیٹھ کر ماتم کرنے کا عادی نہیں اگرچہ یہ جو دھچکا......'' اس نے انگلی سے ایمن کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو شدید دھچکا ایک دھوکے کی شکل میں تم نے مجھے پہنچایا ہے۔ اس پر ماتم کرنے اور غم منانے کے لیے یہ پوری زندگی بھی کم ہے مگر مجھے...... غم منانے سے، رونے دھونے سے نفرت ہے۔ میں نقصان کو اپنے سر سوار نہیں کرتا اگلے امکانات پر غور کرتا ہوں۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بول رہا تھا۔

''اگلے امکانات؟ کیا مطلب؟''

''تو نہیں تو اور سہی۔'' وہ گنگنایا۔

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

''سنو، مجھے تم نے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مگر واحد دھوکا جو میں نے کسی سے کھایا۔'' وہ اس کے بالکل قریب آکر درشتی سے بولا۔

''کک...... کیسا دھوکا؟'' اس پہ گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

''پتا ہے میں تمہیں کیا سمجھا تھا۔'' وہ اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اونچا کرتے ہوئے مبہم لہجے میں بولا۔

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی انگلی ایمن کی تھوڑی پر جمی تھی۔

''میں تمہیں پارس سمجھا تھا۔ پارس سمجھتی ہو نا جس سے خام لوہا بھی چھو جائے تو سونا بن جاتا ہے اور میں خود کو سونا بنانا چاہتا تھا تمہیں چھو کر تمہیں اپنا کر خاص الخاص بے حد قیمتی بیش قیمت بن جانا چاہتا تھا، اور پچھلے دس سالوں سے میں ایسے ہی کسی ''پارس'' کی تلاش میں تھا جو مجھے ہیرے میں ڈھال دے تم قسمت سے ٹکرائیں تو میں سمجھا میری محنت بر آئی۔ میری قسمت کو پارس مل گیا میں اپنی قسمت پر نازاں تھا اور......'' وہ ہنسا۔

''اور مجھے کیا معلوم تھا قسمت کو مذاق کرنے کی بھی عادت ہے اور وہ بھی ہم جیسے ازلی پیدائشی بدقسمتوں سے مذاق کرنے کی...... اس نے پارس کے روپ میں میری قسمت میں کھوٹا سکہ لکھ

دیا تھا۔ پیتل تانبا...... صرف ملمع اندر سے کھوٹ خام...... کاش...... کاش اس کھلے دھوکا دہی پر میں اتنا بہادر ہوتا کہ تمہاری یہ خوب صورت گردن تیز دھار چھری سے کاٹ کر کہیں اتار پھینکتا تو قسمت کے اس تمسخر پر جو جوار بھاٹا میرے اندر ابل رہا ہے وہ کچھ...... کچھ تو اتر جاتا...... مگر میری بے بسی دیکھو، میں اس پر بھی قادر نہیں۔'' اس نے ایک جھٹکے سے ایمن کی تھوڑی کو پرے کیا اور تیزی سے مڑ گیا۔

ایمن جو پتھر کی طرح ساکت اس کے کاٹ دار لفظوں کا وار سہے جا رہی تھی اس کے یوں مڑنے پر ہوش میں آگئی۔

''کہاں جا رہے ہیں مجھے چھوڑ کر...... یہاں...... یہاں...... نہیں۔ پلیز شہریار...... سنو!...... سنیں تو...... میری بات......'' وہ پاگل دیوانوں کی طرح بغیر دوپٹے کے اس کی طرف لپکی تھی۔

جبکہ وہ جیسے بھاگتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

''شہری! شہریار...... پلیز...... میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ کبھی نہیں...... خدا کے لیے...... اللہ کے...... مجھے ساتھ لے کر جائیں میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ کوئی فراڈ نہیں کیا۔ آپ کو سب کچھ سب پہلے سے بتا دیا تھا پلیز...... میری بات سنیں میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ نہیں رہ سکوں گی پلیز......''

وہ اندھوں کی طرح اس کے پیچھے چوڑی چوڑی اکھڑی اینٹوں اور اونچے اونچے پائیدانوں والی سیڑھیاں اترتی چلی جا رہی تھی اور بار بار اس کے قدم ڈگمگاتے ہوئے غیر متوازن ہوتے جا رہے تھے۔ دو بار وہ گرتے گرتے بچی۔ اکھڑی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کا سہارا لیتی گرتی پڑتی اس کی کہنیاں چھل گئی تھیں مگر اسے پتا تھا یہ لمحات ہاتھ سے نکل گئے تو پھر...... پھر شاید وہ یہیں رہ جائے۔ کبھی نہیں۔

اس نے ایک ہی جست میں دو سیڑھیاں پھلانگی تھیں۔

''بیوی ہوں میں آپ کی۔ یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتے آپ مجھے۔ شہریار پلیز رک جائیں۔

'' وہ آخری سیڑھی پر پہنچی تھی جب شہریار اس احاطے کا آخری موڑ مڑ چکا تھا۔ وہ جو اس کے پیچھے چلاتے ہوئے بھاگنے لگی تھی کہ ایک دم اس کی نگاہ شہریار کے غائب ہوتے وجود سے ہٹ کر سامنے کے منظر پر پڑی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے کوئی چٹان سی اس کے اوپر آ گری ہو جس نے پل بھر میں اسے اسی جگہ جہاں وہ کھڑی تھی اپنے وزن کے نیچے اس کو دبا ڈالا ہو۔

وہ اس وزن کے نیچے دبی ہلنا تو کجا ایسی خواہش بھی نہیں کر سکتی تھی اور اس انوکھے منکشف ہوتے لمحے میں وہ یہ بھی بھول گئی وہ کس کے پیچھے بھاگ رہی تھی اور کیوں بھاگ رہی تھی۔

نہ جانے کتنے پل یونہی ساکت بے حس و حرکت کھڑے گزر گئے۔ اسے خبر نہیں ہو سکی۔ وہ

وہیں کھڑے کھڑے ان ہی قدموں پر بیٹھ گئی تھی۔

حیرت زدہ...... ہراساں...... وہ وحشت زدہ...... اس کی نظروں کے سامنے جو منظر تھا اس نے تو ایسا کوئی منظر اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا تھا تو ایسا انوکھا منظر دیکھ کر کیسے پلکیں جھپک سکتی تھی وہ بے خود سی بیٹھی سامنے تکے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''ہم ازلی پیدائشی بدقسمت لوگ ہیں۔ میں جو کہتا تھا مجھے غربت سے نہیں غریب سے غریب سے نفرت ہے کہ وہ خود جان بوجھ کر غربت جیسی قابل نفرت دلدل میں دھنسا رہنا چاہتا ہے۔ آج وہی غلیظ دلدل مجھ پر ہنس رہی ہے قہقہے لگا رہی ہے۔ وہ دلدل جس سے میں اپنے حساب سے نکل چکا تھا۔ میں تو وہیں تھا اسی جگہ کھڑا جہاں سے برسوں پہلے چلا تھا۔''

وہ جتنا سوچتا جاتا، غور کرتا جاتا اسے اپنا آپ اور بھی حقیر دکھائی دے رہا تھا۔

''مگر میں خود کو یوں لاچار ہو کر ضائع نہیں کروں گا میں جو دوسروں کا تمسخر اڑاتا تھا اب دوسروں کو خود پر ہنسنے کا موقع دوں، ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں ابھی تو بہت زندگی پڑی ہے بنانے کے لیے سنوارنے کے لیے۔ مجھے ایک ہی شکست پر یوں حوصلہ ہار نہیں دینا چاہیے فرسٹ چانس از ناٹ لاسٹ۔''

وہ اس کشمکش میں ''حفیظ ولا'' بھی جا کر ہو آیا تھا۔ اردگرد سے ساری معلومات لے آیا تھا جس سے اس کے حوصلے اور بھی ٹوٹے تھے کہ گوگھر سیل ہو چکا تھا۔

وہ راشد صاحب کے سابقہ کو پارٹنر یونس رحیم کے سیکرٹری سے بھی لڑ رہا تھا جس نے اسے بوگس فیگرز دیے تھے طاہر حفیظ کی چھوڑی ہوئی پراپرٹی کے بارے میں اور ہر جگہ ایمن کا ''سچ'' خود کو منواتا نظر آیا تھا۔ اگر اسے چالیس پچاس ہزار سے زندگی شروع کرنی ہوتی تو کئی برس پہلے ایسا کر چکا ہوتا جبکہ وہ تو کئی برس پہلے اس گھٹیا جگہ سے اپنا ناتا توڑ کر چلا آیا تھا۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اس کے منصوبے اس کے عزائم اور بلند ارادے اور عالیشان خواب سب کچھ تلپٹ ہو گیا۔

صد شکر کہ اس نے جذبات میں آ کر آفس جاب سے ریزائن نہیں دیا تھا۔ اب بھی وہ آفس میں رضوان اور اپنے ہاسٹل کے دوسرے ساتھیوں سے کئی دنوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس بار اس نے دوسرے ہاسٹل میں کمرہ لیا تھا، وہ بھی انڈیپینڈنٹ کسی روم میٹ کے بغیر...... ابھی تو وہ خود اپنے ساتھ اپنی موجودگی برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور کسی اور کی کیا کرتا۔

ابھی تو سوچنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ سوائے خود کو لعن طعن کرنے کے۔ کئی بار دل میں ابال سے اٹھتے کہ اس چیٹ لڑکی کو ڈائیورس پیپرز بھجوا دے مگر پھر حق مہر کے پانچ لاکھ روپوں کا خیال

آجاتا جو اس مکار بڑھیا نے دھوکے سے نکاح نامے میں لکھوا دیے تھے۔ اگرچہ حق مہر سے جان چھڑانے کا اس کے پاس معقول جواز موجود تھا کہ اس نے کون سا حق زوجیت استعمال کیا تھا جو حق مہر ادا کرتا پھرتا مگر اس کے باوجود وہ ابھی اس معاملے کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے؟ یاروں سے کہاں چھپے پھرتے ہو۔ کئی دنوں سے آفس آرہے ہو مگر مجال ہے کہ بندہ آکر سلام دعا ہی لے لے بلکہ دو بار تمہارے کیبن میں آیا ہوں حضرت غائب، ہم نے کہا جناب کیا چکر ہے؟" اس روز وہ اپنے کیبن میں بیٹھا بری طرح سے سگریٹ پھونکتے ہوئے سوچوں میں غلطاں تھا کہ رضوان بنا دستک دیئے اندر چلا آیا۔

اس کا مزاج بری طرح سے کڑوا ہوا تھا۔

"یہ اندر کیا کسی سین کی شوٹنگ ہو رہی ہے جو تم نے ہر طرف دھواں دھواں منظر پھیلا رکھا ہے۔ شہریار! تم اور سگریٹ۔ ناقابل یقین۔"

وہ بنا اجازت لیے اس کے سامنے کرسی سنبھال چکا تھا اور ان ابتدائی جملوں کے بعد اس نے جو سوال و جواب اور بکواس شروع کرنا تھی پھر اسے روکنا شہریار کے بس میں بھی نہیں تھا اور اس کا آخری نتیجہ شدید تلخ کلامی کی صورت میں نکلنا تھا وہ لاوا سا جو اس کے اندر پک رہا تھا اتنے دنوں سے اگر رضوان کی معمولی چھیڑ چھاڑ سے پھٹ نکلا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا اور اس "کچھ بھی" سے بچنے کے لیے شہریار ایک جھٹکے سے اٹھا اور "ایکسکیوزمی" کہہ کر بنا رضوان کی طرف دیکھے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس کا باپ گدھا گاڑی چلاتا تھا ایک بے حد معمولی دیہاڑی دار مزدور اور اکثر ہی وہ خالی جیب گھر لوٹا کرتا تھا۔ اس کا مریل بالکل چھوٹے قد کا کمزور گدھا ایسی حالت میں ہوتا کہ ابھی گرا اور ختم۔ جسے اس کوڑے والے احاطے کے پاس اوپر سے آتے پائپ کے ساتھ باندھ کر وہ کھوں کھوں کرتا اوپر چلا آتا۔

ایک کمزور مریل مدقوق ہڈیوں کے پنجر جیسا مفلوک الحال بوڑھا جو ادھیڑ عمری میں ہی بوڑھا لگنے لگا تھا اور جس سے اپنی عمر کے اولین سالوں میں ہی شہریار کو نفرت ہو گئی تھی کہ وہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی کسی نہ کسی کونے میں چھپ جاتا۔

ان کے گھر کا چولہا ہفتے کے پانچ دن ٹھنڈا ہی رہتا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ سے بھی زیادہ کمزور مریل سوکھی سڑی بیمار بڑھیا تھی جن کے منہ سے ہر وقت تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی درد جاری رہتا۔ "ہائے ہائے ہائے" کرتی وہ بمشکل گھریلو امور کے کچھ فرائض ادا کیا کرتی تھی۔

اس کی ماں، اس کا باپ ازلی پیدائشی غریب اور بدقسمت...... ان کو دیکھ کر اسے بچپن ہی سے زندگی کی اس ضرورت سے شدید نفرت ہو گئی تھی حالانکہ کٹڑی میں اور بھی سب لوگ ایسے ہی تھے اسی طرح کی زندگی بسر کرنے والے۔ کوئی ریڑھی بان کوئی گھوڑا تانگہ چلانے والا، کوئی سبزی فروش کوئی شیر فروش، کوئی کوڑا کرکٹ اٹھانے والا، کوئی ماشکی، کوئی مالشیا، کوئی نانبائی اور کوئی پان فروش مگر اسے کسی کو دیکھ کر اتنی گھن نہیں آتی تھی جتنی اپنے باپ کو اور اپنی ماں کو دیکھ کر آتی تھی اسے بچپن میں جب وہ اس "گھن" اس نفرت کو کوئی نام نہیں دے پاتا تھا وہ دونوں اسے جانوروں کی طرح لگا کرتے تھے ان کی کمروں کے ساتھ لگے خالی پیٹ، جبڑوں کے اندر دھنسے سوکھے سڑے رخسار، کم روشنی والی آنکھیں، کھچڑی بال اور سوکھے سڑے ڈنڈے جیسے بازو اور ٹانگیں دونوں ہی کم گو کم سخن تھے اور شہریار کو یاد نہیں پڑتا کبھی اس نے ان دونوں کے بیچ کوئی محبت بھرے جملے یا ایک دوسرے کی خاطر کہے گئے کوئی لفظ سنے ہوں وہ دونوں بے زبان جانوروں کی طرح ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

ابا کچھ کما کر لاتا تو آتے ہوئے سبزی دال آٹا چاول۔ کسی دن ذرا زیادہ پیسے ہوتے تو گوشت قیمہ انڈے بھی لے آتا ورنہ عموماً وہ ڈنڈے جیسے سوکھے سڑے بازو جھلاتا پیوند لگی تہبند کو سنبھالتا سیڑھیاں چڑھتا اوپر آتا جیسے ساری دنیا کو گدھا گاڑی پر ڈھو کر راوی کنارے چھوڑ کر آرہا ہوں۔ اس روز ان کے گھر میں ضرور فاقہ ہوتا پھر بھی لوگوں میں کچھ احساس باقی تھا ایسے میں کہیں نہ کہیں سے ایک آدھ روٹی یا تھوڑے بہت چاول سبزی کچھ آ ہی جاتا ورنہ سوکھے مرونڈے اماں ان کے آگے رکھ دیتی جو کبھی چار پیسے اماں کے پاس فالتو ہوتے تو وہ پھلیاں اور گڑ ملا کر بنا لیتی اور ایسے فاقوں میں "من وسلویٰ" کا کام دیتا۔

اس کے اماں ابا نے کل چودہ بچے پیدا کیے جن میں سے زاہدہ باجی کا پہلا نمبر اور اس کا اپنا دسواں نمبر تھا۔ بیچ کے سارے بچے اتنے کمزور نامکمل ادھورے اور مریل ہوئے تھے کہ اکثر دنیا میں آکر سانس بھی نہ لیتے کہ واپسی کے لیے دوڑ پڑتے۔ ان کا "آنا" اور "جانا" دونوں پر ہی اماں ابا کو اس نے ایسا مطمئن ایسا چپ پایا کہ جیسے انہیں پتا ہوتا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ بس ایک آدھ سانس سے زیادہ ان پر بوجھ نہیں ڈالے گا اور اسی طرح ہوتا بھی......

بچے کو دفنا کر آنے کے بعد ابا یوں تہبند سمیٹے کٹڑی کے دروازے کے پاس کٹڑی کے بڑے بوڑھوں کے ساتھ بیٹھا یوں حقہ گڑگڑا رہا ہوتا جیسے اس کے گھر نہیں کسی اور کے گھر بچہ پیدا ہو کر مر گیا اور وہ اسے ابھی قبر کی مٹی میں بو کر آیا ہو۔

صرف ایک بار اسے اماں بالکل ویسی ماں لگی جیسے وہ اپنے لیے خوابوں میں سوچا کرتا تھا۔

کریپ کا نیلا جوڑا پہنے جس پر سرخ رنگ کے گلاب کڑھے ہوئے تھے اور نیلا جارجٹ کا دوپٹہ جس کے کناروں پر سرخ کروشیے کی بیل تھی۔ اماں نے چاندی کے بڑے بڑے بالے، چاندی کے دو کڑے اور ناک میں چاندی کی سرخ رنگ والی لونگ رکھی تھی اس دن...... اس کی یادداشت میں محفوظ وہ واحد دن جب اماں کے منہ سے تسبیح کے دانوں کی طرح ہائے ہائے، نہیں ٹپک رہا تھا نہ اس کے ہاتھ کمر پر سہارا دینے کے لیے تھے نہ سر پر دوپٹے کی پٹی تھی وہ دن زاہدہ باجی کی شادی کا دن تھا۔

شہریار کی یادداشت میں محفوظ اس کے بچپن سے لڑکپن تک کا واحد خوشیوں بھرا دن جب ابا بھی اسے ابا جیسا نظر آیا۔ سفید براق تہبند میں سفید کرتہ پہنے کندھے پر سبز نیلی ڈبی والا رومال رکھے آنکھوں میں سرمہ لگائے اپنے ڈنڈے سے لمبے سیاہ بازو کرتے کی آستین میں چھپائے تھوڑا جھینپتا تھوڑا مسکراتا ہوا زاہدہ باجی کی آنے والی بارات کے استقبال کے لیے دوسرے مردوں کے ساتھ کٹڑی کی صحن میں لگے شامیانے کے باہر کھڑا پہلی بار اسے اچھا لگا۔

اور اس کے علاوہ اس کی یادوں کی پوٹلی میں کانٹے ہی کانٹے تھے جسے کھولتے ہی اس کے ہاتھ لہولہو ہونے لگتے۔

اور جب زاہدہ باجی بھی شادی کے دسویں مہینے بچہ جننے اماں ابا کے دو کمروں کے اس مختصر احاطے میں آ گئی تو اس کا جی چاہتا وہ کہیں بھاگ جائے اور پھر زاہدہ باجی نے اماں کی سیٹ سنبھال لی۔

شادی کے پانچ سالوں میں اس نے اماں کی طرح پانچ بچے پیدا کیے اور اس کے پانچویں بچے کی پیدائش کے تین مہینے بعد اماں پھر اسی قیامت خیز مرحلے سے گزر رہی تھی جس سے گزرنے کی اب اماں کے بوڑھے بدن میں ہمت نہیں تھی۔

نہ جانے کیا مشکل تھی کہ ابا جو اکثر دائی بلانے کے حق میں بھی نہیں ہوتا تھا اس بار خود جا کر محلے کی لیڈی ڈسپنسر کو لے آیا۔

چار گھنٹے موت و حیات کی کشمکش رہی۔

اور بالآخر نہ بچہ اس دنیا میں آ سکا نہ اماں جانبر ہو سکیں۔

اف کیسی چیخیں اور بین تھے اس شام اس کٹڑی میں جب اماں کا جنازہ اٹھا۔ زاہدہ باجی اور ابا کے واسطے بھی اماں کو اب جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔

اسے اماں سے پیار تھا یا نہیں اس کا پتا اسے بھی نہیں تھا مگر اس رات جب ابا اماں کو لحد میں اتار کر آنے کے بعد خالی خالی سا بیٹھا اماں کی خالی مسہری کو تکے جا رہا تھا تو اسی مسہری کے پائے کے ساتھ لیٹے شہریار کو انوکھا سا اطمینان ایک کمینی سی خوشی اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے اماں کو وکٹری کا نشان بھی بنا کر دکھایا تھا۔

شاید ابا کی زندگی کی واحد وجہ اماں تھی کہ اس کے جانے کے بعد ابا کے پاس جینے کا جواز ہی نہ رہا۔

جب زاہدہ باجی کے نہ جانے کونسا واں بچہ پیدا ہوا تھا اور پچھلے بچے کی پیدائش سے لے کر اس بچے کے پیدا ہونے تک اس کا جسم جو کسی فٹ بال کی طرح پھولنا شروع ہوا تھا اس میں دن بدن کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس بچے کی پیدائش کے فقط دو ہفتوں بعد ابا بھی چپکے سے اٹھ کر اماں کے پاس چل دیا۔

ابا کے جانے پر بھی اس کی آنکھیں نم نہیں ہوئی تھیں۔

اس کے بے حس دل کو یوں لگا جیسے اس کے کندھے پر رکھے دو بھاری پتھر کسی نے چپکے سے اتار لیے ہوں۔ زاہدہ باجی کا خاوند جو ابا کی طرح کوئی مزدور مستری یا شاید ریڑھی بان تھا بہت کم ان کی طرف آتا تھا۔ دو گلیاں چھوڑ کر اس کا چوبارہ تھا۔ فقط ایک چوبارہ جس میں اس کے ماں باپ تین ادھیڑ عمر کنواری بہنیں، دو چھوٹے بھائی ایک قصائی چچا اور چچی اور ان کے تین بچے رہتے تھے۔

بڑا سا کمرہ جس کے بیچوں بیچ پردہ کر کے پارٹیشن کی گئی تھی اور برآمدے میں دونوں فیملیز کے کچن تھے جہاں دن میں تین نہیں تو چار لڑائیاں ضرور ہوا کرتی تھیں۔

اس چوبارے کے مقابلے میں اماں ابا کا یہ دو کمروں کا احاطہ زاہدہ باجی کے لیے محل ہی تھا اسی لیے وہ ہر بچے کی پیدائش پر آرام سے ادھر آ جاتیں۔ ایک دن خبر آئی زاہدہ باجی کا خاوند جو مستری کسی زیر تعمیر مکان کی چھت سے گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ اس وقت یہ جگنو پیدا ہوا وہ یہ کٹڑی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا آیا۔ ایک نئی دنیا دریافت کرنے، غربت اور جہالت کی دلدل سے پاک.......

وہ تو شاید کبھی پلٹ کر ادھر نہ آتا اگر یہ مکار ایمن ضد نہ کرتی اور وہ محض اس کا دل جیتنے کی خاطر اسے یہاں لے آیا جو پہلے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ اس کے ساتھ "ہاتھ" ہو چکا ہے تو وہ ایمن پہ وہیں لعنت بھیج کر چلا آتا جیسے اب...... اسے بڑے زور کی ٹھوکر لگی تھی راہ میں پڑی اس اینٹ سے۔ وہ پکڑ کر نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ نہر کا گدلا پانی ہولے ہولے رواں تھا اور اس پر جھکے پیڑوں کے سائے ان پانیوں کے ساتھ متحرک بھی تھے اور ساکت بھی۔ کیسے اپنی انفرادیت اپنا وجود قائم رکھے ہوئے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر ڈھلتی شام کو دیکھا۔ آسمان پر کہیں کوئی پرندہ اڑ رہا تھا۔ ابھی اونچی شاخوں پر دھوپ کی سنہری چھایا موجود تھی شام ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی مگر اسے لگ رہا تھا جیسے

شام کے پہر اس کی زندگی میں ٹھہر سے گئے ہیں۔ کئی سالوں سے وہ دوراہے پہ کھڑا ہے اس کا ایک قدم غربت کی دلدل میں ہے اور دوسرا قدم نئی دنیا کے کنارے ......اور یہ دلدل...... اسے چھوڑ نہیں رہی۔

"جو بھی ہو جائے اس دلدل سے پیچھا چھڑا کر رہوں گا۔ مجھے اس قابلِ نفرت دنیا میں جا کر نہ تو رہنا ہے نہ اس کا حصہ بننا ہے مجھے اپنے وجود کو منوا کر رہنا ہے کیڑے مکوڑوں کی طرح اس دنیا کے قدموں تلے کچلے نہیں جانا میں خود کو منوا کر رہوں گا۔ کیا ہوا جو ایک ٹھوکر لگی منہ کے بل گر بھی گیا تو اٹھنے کا حوصلہ ہے میرے اندر ......اور میں اٹھ چکا ہوں آج سے یہ افسردگی یہ قنوطیت ختم جس نئی دنیا کی دریافت کا میں نے خود سے وعدہ کر رکھا ہے میں نا صرف اسے دریافت کروں گا بلکہ اسے فتح بھی کر کے دکھاؤں گا چاہے مجھے کتنی ہی ٹھوکریں کیوں نہ لگیں ایک ٹھوکر کی کیا بات۔" وہ پیر کا انگوٹھا سہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور افق پر پھیلتی شفق کو دیکھنے لگا۔ "بالکل اسی طرح مجھے زندگی کے افق پر جگمگانا ہے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی بن کر نہیں رو پہلے چاند کی روشنی بن کر۔" وہ نئے عزم ارادے دل میں باندھتا نہر کی مخالف سمت چل پڑا۔

☆☆☆

"شہریار! تم ایئرپورٹ چلے جاؤ ہمارے ایکوپمنٹس آنے والے ہیں ان کی ڈلیوری کروالو ساتھ خرم اور شہزاد کو لے جاؤ ان دونوں کو ڈلیوری کے بعد فیکٹری بھجوا دینا اور ہمارے سامان کے ساتھ براؤن کلر کے دو پیکٹس بھی ہوں گے وہ امپورٹڈ ہاؤس میڈیسن ہیں وہ تم الگ کر لینا اور یہ کارڈ رکھ لو اس ایڈریس پر یہ دونوں پیکٹس پہنچا دینا۔"

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا رضا صاحب نے اسے بٹھا کر کہنا شروع کر دیا۔ "اور وہاں جیسے ہی وہ پیکٹس وصول کر لو مجھے انفارم کر دینا میں کریم صاحب کو اطلاع کر دوں گا کہ تم ان کے مطلوبہ پیکٹس لے کر آ رہے ہو۔" اس نے ان کے ہاتھ سے لیے کارڈ کی طرف دیکھا۔ محمود کریم چیف سیکریٹری کا نام لکھا تھا اور نیچے کوئی ایڈریس۔

"سر یہ ایڈریس تو میرے خیال میں شہر سے باہر کسی جگہ کا ہے۔" ایڈریس پڑھتے ہوئے بولا۔ "ہاں' یہ ان کے فارم ہاؤس کا ایڈریس ہے۔ وہ آج کل وہیں ہیں۔ نہ بھی ہوئے تو ان کے ملازم وغیرہ ہوں گے یا پی اے جو پیکٹ وصول کر لیں گے تم سے۔ انہیں ان پیکٹس کی فوری ضرورت ہے نہ جانے گھوڑوں کی کون سی بیماری ہے جس کے لیے انہوں نے یہ ارجنٹ منگوائی ہے بہر حال تم اس کام کو مکمل کر کے بیٹنگ آف کر جانا کیونکہ وہاں سے آتے ہوئے تمہیں ویسے ہی رات ہو جائے گی' اب تم جاؤ۔" وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اور ان کا خیال بالکل درست تھا۔ ایئرپورٹ کارگو لاؤنج سے سامان ڈلیور کرواتے پھر لوڈ کرواتے اور دونوں پیکٹس لے کر نکلتے ہوئے اسے شام ہی ہو گئی تھی، اور جب وہ شہر سے باہر اس جنگل نما فارم ہاؤس میں پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ فارم ہاؤس کا گیٹ بند تھا اور دور تک جاتی پتلی سی سڑک بالکل ویران تھی۔ وہ گاڑی باہر ہی روک کر کسی شخص کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ارے صاحب کس کو ملنا ہے۔" نہ جانے کون سی جھاڑی کے پیچھے سے میلشیے رنگ کا سوٹ پہنے کلاشنکوف کندھے سے لٹکائے وہ بڑی بڑی مونچھے اور آنکھیں لیے پٹھان گارڈ نکل کر اس کے سامنے آیا تھا لمحہ بھر کو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"آں یہ ......میرا مطلب ہے۔ یہ فارم ہاؤس محمود کریم صاحب کا ہے؟ وہ موجود ہیں۔" اس نے کچھ ہکلاتے ہوئے کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ام گیٹ کھولتا ہے۔ سیدھا گاڑی لے کر چلے جاؤ۔ دائیں ہاتھ ان کا بنگلہ ہے اور صاحب اندر ہی ہے۔" اس نے کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے جیسے تسلی کی اور لپک کر گیٹ کھول دیا۔ وہ سیدھی سڑک جو بظاہر چھوٹی سی لگ رہی تھی شیطان کی آنت جتنی طویل ثابت ہو رہی تھی۔ اردگرد گھنی جھاڑیاں اب گھنے گنجان دراز قامت درختوں میں بدلتی جا رہی تھیں اور شام کے گہرے ہوتے سائے چاروں اور چھایا سناٹا شہریار کا دل کچھ کچھ ڈرنے لگا۔ وہ بڑی احتیاط سے ہلکی اسپیڈ میں ڈرائیو کرتے ہوئے جا رہا تھا۔ اچانک دوراہا آ گیا۔ سڑک اب بھی سیدھی جا رہی تھی مگر اس میں دائیں ہاتھ موڑ آ گیا تھا۔ اس خان کے بچے نے کہا تھا کہ دائیں طرف مڑ جانا اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور گاڑی دائیں ہاتھ موڑ دی۔ ایک دم سے منظر بدل گیا تھا۔

دائیں طرف دور تک پھیلا نگاہوں کو فرحت بخشتا ہرا بھرا میدان تھا جس کی گھاس اتنی صفائی اور خوبصورتی سے تراشی گئی تھی کہ اس کے خراب ہونے کے ڈر سے شاید اس کے اوپر کوئی چلتا بھی نہیں ہوگا مگر یہ بھی اس کی خام خیالی تھی۔

اس ہرے بھرے آسٹروٹرف جیسے گراؤنڈ میں دور سے دو گھوڑے کہیں سے بھاگتے ہوئے آئے تھے ذرا نزدیک آنے پر شہریار نے دیکھا ایک گہرے براؤن رنگ اور چمکیلی جلد اور ریشمی گھنے بالوں والا گھوڑا تھا تو دوسرا ایش بلیک کلر کا جس کی ریشمی جلد شام کے گہرے ہوتے سایوں میں بھی دور سے نمایاں لگ رہی تھی۔

دونوں کے اوپر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

لانگ شوز پہنے مکمل ہارس رائڈنگ گیٹ اَپ میں دونوں اچھی خاصی ماہر گھڑ سوار لگ رہی تھیں۔

وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی خود بخود روک چکا تھا اور یک ٹک ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

دونوں گھوڑوں کی رفتار میدان کے درمیان تک پہنچتے پہنچتے سست ہوتے ہوتے تھم چکی تھی۔ اب وہ ان کی باگیں ڈھیلے ہاتھوں میں لیے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شہریار مکمل محویت کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسا منظر اس نے پہلی بار دیکھا تھا تو اس کا محو ہونا لازمی تھا۔

"ہے، ہو آر یو۔" سیاہ گھوڑے والی حسینہ نے دور سے چٹکی بجاتے ہوئے بلند آواز میں اس سے پوچھا تھا اور اس کی محویت ٹوٹی تھی۔

"میں جی......" وہ بولنے لگا تو پھر اسے خیال آیا یوں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جواب دینا تو خاصا احمقانہ پن ہے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہ دونوں بھی اب گھوڑوں سے نیچے اتر چکی تھیں پرلی طرف سے ایک سائیس دوڑتا ہوا آیا اور دونوں گھوڑوں کی لگامیں ان کے ہاتھوں سے لے کر اسی جانب چل پڑا جدھر سے آیا تھا۔ دونوں گہرے گہرے سانس لیتی میدان کے کنارے لگی پھولوں کی باڑ کو پھلانگتیں اس کے سامنے آ گئی تھیں۔

"کس سے ملنا ہے؟" ایک لڑکی جس کا قد پہلی سے دراز تھا اور جو بلیک گھوڑے پر سوار تھی (اسی نشانی کو شہریار کے لیے یاد رکھنا زیادہ آسان تھا) اور اس نے مکمل بلیک آؤٹ فٹ پہن رکھا تھا۔ اس کالے رنگ کے حصار میں واحد جگمگاتی چیز اس کا دودھیا چہرہ تھا جو شام کے اندھیرے میں بھی خوب چمک رہا تھا اس کی سیاہ چمکتی آنکھیں خوب بڑی بڑی اور گھنی پلکوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ شہریار نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ اس کے آگے کر دیا۔

"ہوں، کریم انکل سے ملنا ہے آجاؤ۔" اس نے بڑی نزاکت سے کارڈ انگلیوں کے درمیان پکڑا تھا اور اسے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی جبکہ پہلے والی لڑکی ان سے کافی آگے جا چکی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کین کی کرسیاں اور ٹیبل سجی تھی جس پر ریڈ براؤن آؤٹ فٹ والی لڑکی بیٹھی موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

"آجائیں۔ بیٹھ جائیں۔ میں کسی ملازم کو بلواتی ہوں۔ وہ آپ کو کریم انکل کے پاس لے جائے گا۔" اسے ساتھ لے کر آنے والی لڑکی بڑے اخلاق سے بولی تو وہ متاثر ہوتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکی کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

"مجھے رباب کہتے ہیں اور یہ میری کزن کم دوست شیلا ہے اور آپ؟" وہ بے تکلفی سے

اپنا تعارف کراتے ہوئے اس سے دریافت کرنے لگی۔

"مجھے شہریار کہتے ہیں۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "کہتے ہیں، ورنہ آپ ہو نہیں۔" شیلا فون سے فارغ ہو کر مسکراتے ہوئے بولی شہریار کا اعتماد ڈگمگانے لگا جبکہ رباب کھل کر مسکرا دی۔

"کم آن یار! ان کا نام ہے۔" اس نے پتا نہیں کیوں صفائی دی۔ "میں نے کب کہا ان کا نام بدنام ہے۔ ظاہر ہے خود سے بتا رہے ہیں تو یہی نام ہو گا۔" وہ پھر سے بھونڈے انداز میں بولی شہریار مروتاً مسکرانے لگا۔

"معاف کیجیے گا۔ شیلا کی عادت ہے ایسے ہلکے پھلکے مذاق کرنے کی۔" رباب فوراً معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ شہریار کو وہ اور بھی اچھی لگی۔ اس کی خفت کم ہونے لگی۔ اس وقت ملازم لیمونیڈ لے کر آ گیا اور ان تینوں کو سرو کرنے لگا۔

"دیکھو، اندر جا کر کریم انکل کو اطلاع دو...... آپ کا کوئی کارڈ۔" رباب ملازم سے بات کرتے ہوئے اچانک اس سے پوچھنے لگی تو شہریار نے اپنا کارڈ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ "کہنا یہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" وہ کارڈ ملازم کو دیتے ہوئے بولی۔

"مجھے رضا حامدی صاحب نے بھیجا ہے، بتا دیجیے گا۔" وہ سر ہلاتے ہوئے تھوڑی دور واقع رہائشی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ لیمونیڈ کے سپ لینے لگا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگیں اور وہ کوشش کے باوجود ان کی ایک بات نہیں سمجھ سکا اگرچہ دونوں انگلش میں بات کر رہی تھیں مگر وہ کون سا انگلش سے نابلد تھا مگر جس ایکسنٹ اور جس کانونٹ لب و لہجے کے ساتھ رواں انداز میں وہ بول رہی تھیں۔ شہریار کا دماغ ابھی ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوتا کہ دوسرے کے تعاقب میں ڈورنے لگتا۔ ان کی سیل رواں کی روانی کے آگے بے بس ہو کر وہ بت سا بن کر بیٹھ گیا اور صرف لیمونیڈ کو انجوائے کرنے لگا۔ گراؤنڈ کے گرد لگیں پول لائٹس جل اٹھیں جیسے کسی نے دیے سے روشنی کر دیے ہوں۔ فارم کی مرکزی عمارت بھی دودھیا روشنیوں سے جگمگانے لگی تھی صرف وہی روش جس کے ایک طرف وہ بیٹھے تھے اس کی روشنی مدھم تھی۔

"آپ کو نوید صاحب بلوا رہے ہیں۔" اسی وقت ملازم نے آ کر اس سے کہا تو وہ اجازت طلب نظروں سے دونوں کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا جو ابھی تک محو گفتگو تھیں اور اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھیں۔ وہ ملازم کے ساتھ چلتا ہوا مرکزی عمارت کے مختصر سے ماربل کاریڈور کے بیرونی کمرے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ روم سیٹنگ بالکل سادہ تھی صرف ایک ویلوٹ کا صوفہ سیٹ اور سینٹرل ٹیبل تھی۔ کمرے میں لگے فانوس کی وجہ سے کمرہ جگمگا رہا تھا۔

"جی آیئے شہریار صاحب!" اس کا ہم عمر نوجوان کمرے کے ایک طرف سے نکل کر اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا تو اس نے مصافحہ کیا۔

"وہ پیکٹ نہیں لائے آپ؟" وہ اس کے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جی' وہ گاڑی میں ہیں۔"

"سر تو آرام کر رہے ہیں ورنہ وہ خود آپ سے ملاقات کرتے۔ گاڑی ان لاکڈ ہے تو ملازم جا کر لے آتا ہے۔" اس نے سر ہلا دیا تو ملازم باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں پیکٹ ان صاحب کے حوالے کر کے وہ باہر نکل آیا۔ باہر مکمل رات ہو چکی تھی۔ وہ باہر نکل رہا تھا اور رباب اندر داخل ہو رہی تھی۔ شیلا اس کے ساتھ نہیں تھی۔

"جا رہے ہیں آپ۔" وہ اسی خوش دلی سے بولی اور جس سے پہلے بات کرتی رہی تھی۔

"جی بالکل خدا حافظ۔" نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا وہ اسے روک لے کچھ دیر کے لیے اور یہاں کھڑا رہے یا اور اسے کچھ نہیں تو دو چار جملوں کا مزید تبادلہ ہو جائے۔

"او کے جی خدا حافظ۔" وہ ہاتھ ہلاتی اندر کی طرف مڑ گئی اور اپنے دل کی حسرت دل میں لیے باہر نکل آیا۔ "آخر میں کیوں یہ چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر اور میرے پاس کھڑی رہے۔ سلسلہء کلام کچھ اور دراز ہو جائے۔ آخر کیوں؟" وہ واپسی کے طویل راستے میں خود سے بار بار یہ سوال کرتا رہا اور نہ جانے کیوں واپسی کا سفر اسے اور بھی زیادہ طویل محسوس ہو رہا تھا اور خالی خالی سا بھی۔

"جیسے اپنی کوئی قیمتی چیز کہیں پیچھے بھول آیا ہو۔"

اس خیال پر اس کے دل نے سرزنش بھی کی مگر دل...... دل نہ جانے کیا چاہتا تھا وہ سمجھ نہ سکا۔

☆☆☆

پھر سے وہی بے کیف دن اور بے کیف راتیں۔

وہ ایمن اور اس سے منسلک ہر جذبے اور ہر رشتے کو کسی برے خواب کی طرح بھلا دینے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ بھلا چکا تھا۔

وہ کئی روز بعد اپنی ذاتی شاپنگ کے لیے "Pace" آیا تھا۔ شاپرز ہاتھ میں لیے باہر نکل رہا تھا جب بری طرح کسی سے ٹکرایا اس کا آہنی کندھا کسی نازک کندھے سے ٹکرایا تھا۔

وہ تو پورا گھوم کر رہ گئی تھی۔

کچھ سخت بولنے جا رہی تھی کہ شہریار کی شکل دیکھ کر اس کے لب ادھ کھلے رہ گئے۔

"ارے رباب آپ۔" شہریار کو حیرت کے ساتھ سرپرائزنگ خوشی ہوئی تھی۔

"ارے کمال ہے۔ آپ کو میرا نام یاد ہے۔ شاید پندرہ کہ بیس دنوں کے بعد ہم ملے

ہیں۔" وہ بھی خوشگوار حیرت سے بولی۔

"ملے نہیں ٹکرائے ہیں۔" اس نے خوش مزاجی سے تصحیح کی۔

"بالکل' آپ نے تو میرا کندھا اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" وہ اپنا کندھا دباتے ہوئے بولی۔

"اوہ سوری' میں بالکل نہیں دیکھ سکا۔ زیادہ زور سے لگ گیا۔" وہ شرمندہ سا ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ کم زور سے لگا ہے ایک بار پھر لگا کہ دیکھیں۔"

وہ بے تکلیف لہجے میں بولی جیسے وہ دونوں مدتوں سے ایک دوسرے سے یوں ملتے رہتے ہوں۔

وہ دوبارہ سوری کرنے لگا۔

"اٹس او کے ہو جاتا ہے کبھی ایسے بھی۔" وہ مروتاً مسکرائی۔

"آئیں کہیں بیٹھتے ہیں۔" اس روز جو خواہش اس کے دل میں حسرت بن کر رہ گئی تھی آج زبان پہ آ ہی گئی۔

"کہاں؟" وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوپر کیفے میں چلتے ہیں۔" وہ فوراً بولا وہ متذبذب سی کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا سوچنے لگیں اگر دل نہیں کر رہا تو کوئی بات نہیں۔"

"نہیں' وہ اصل میں......" وہ رکی اور ہینڈ بیگ سے اپنا سیل نکالنے لگی۔

"آپ کی وہ کزن کم دوست نہیں آج آپ کے ساتھ؟" شہریار کو یاد آیا تو پوچھنے لگا۔

"وہی ساتھ ہے نا' اپنی شاپنگ کو نکلی ہے۔ میں ذرا اسے کال کر کے کہہ دوں کہ وہیں آ جائے جہاں ہم جا رہے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے ایک طرف ہو کر کال کرنے لگی۔

شہریار کے دل کی کلی کھلنے لگی۔

"کریم محمود آپ کے کون ہیں؟" وہ پہلی ٹھوکر سے سنبھل چکا تھا اس ٹھوکر کی ضرب نے اس سبق کو اسے بھولنے نہیں دیا تھا سو یونہی تعلقات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"انکل ہیں میرے' چاچو۔ میں اور میرے پیرنٹس اصل میں مڈل ایسٹ میں ہوتے ہیں بلکہ پاپا تو سمجھیں ابھی لندن میں ہیں ابھی روم ابھی پیرس سڈنی ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس کے بارے میں ہم شیور ہو کر کہیں آج پاپا وہاں پائے جائیں گے۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔

شہریار کو اس کی ہنسی بہت خوبصورت لگی جیسے کانچ کے برتن سے کوئی دوسرا کانچ ٹکرایا ہو۔

’’میں ویسے ادھر ویکیشنز میں آئی ہوں۔اپنے چاچو کے پاس۔بچپن سے اب تک اپنی تمام چھٹیاں چاچو کے ساتھ ان کی فیملی کے ساتھ سپنڈ کرنا پسند کرتی ہوں اور شیلا میں تو سمجھیں میری جان ہے۔‘‘ وہ خاصی باتونی لگتی تھی۔

’’آپ اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتایئے؟‘‘ اسے خیال آ ہی گیا کہ شہریار صرف اسی کو سن رہا ہے۔

’’مجھے اچھا لگ رہا ہے۔آپ بول رہی ہیں، میرے پاس یوں بھی کچھ خاص بتانے کو ہے نہیں ۔آپ کی طرح کوئی اسپیشل رشتے یا کوئی رشتہ جس میں میری یا اس کی بات ہو بس عام سا انسان ہوں اور عام سی زندگی۔‘‘ وہ دھیرے دھیرے ایسے متاثر کن انداز میں بولا کہ رُباب چپ سی ہوگئی۔

’’دیکھنے میں تو عام نہیں بے حد خاص لگتے ہیں آپ ۔‘‘ ٹیبل کی گلاس ٹاپ پر انگلی سے ڈیزائن بناتے ہوئے اس نے مدھم سی آواز میں کہا تو شہریار نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

’’دونوں کی نگاہیں ملیں اور کتنے ہی لمحے گم ہوتے چلے گئے۔

’’ہیں نا خاص آپ۔‘‘ پھر دو کانچ ٹکرائے۔

’’وہ کیسے؟‘‘ وہ بے خود سا بولا۔

’’میری نظروں میں دیکھ تو رہے ہیں۔کتنے خاص الخاص ہیں آپ۔‘‘ وہ بے باکی سے کہتے ہوئے بے اختیار پلکوں کی باڑ گراتے ہوئے بولی تو شہریار کو لگا کہ ایک بار پھر قسمت اسے آزمانے کا ٹھان چکی ہے۔

اس نے ہیجان کے دریا میں ڈوبتی ابھرتی دل کی دھڑکنوں کو سرزنش کرتے ہوئے تنبیہ کی۔

’’ایک بات کہوں رباب!‘‘ وہ چند لمحوں بعد اسی فسوں خیز آواز میں بولا۔

’’ہوں ۔‘‘ وہ ابھی بھی گلاس ٹاپ ڈیزائن بنانے میں مگن تھی مگر اس کے کھلے کھلے سے مسکراتے لب اس کی کسی اور ہی محویت کی کہانی سنا رہے تھے۔

’’اس شام جب ہم پہلی بار ملے تھے اور میں واپس لوٹنے لگا تھا تو پتا ہے میرے دل نے کیا تمنا کی تھی؟‘‘ وہ اس کے خوبصورت نقوش والے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں بتاؤں۔‘‘ وہ تیزی سے پلکوں کی باڑ اٹھاتے ہوئے روشن دیئے سی نظریں اس پر جماتے ہوئے بولی۔

’’ہوں‘‘ وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا۔ ’’کہ ہم دونوں کچھ دیر اور ایک دوسرے کے ساتھ رہیں کچھ وقت ایک دوسرے کی کمپنی میں اور گزاریں۔ نا!‘‘ وہ کچھ اس طرح بے ساختہ شہریار

جواب میں پرجوش سی تائید بھی نہ کر سکا۔بس یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔

’’میں نے غلط کہا؟‘‘ وہ اس کی چپ پر بولی۔

’’اگر یہ درست ہے تو اسے کیا کہتے ہیں؟‘‘ خوابناک سی کیفیت میں پوچھ بیٹھا۔

’’اسے آئس کریم کہتے ہیں۔وہ بھی میری پسندیدہ چاکلیٹ فلیور۔‘‘ وہ ایک دم سے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کھلکھلائی۔

اور شہریار جیسے کسی اور ہی جہاں کی سیر سے لوٹ آیا۔

’’ابھی جا کر محمود کریم اور اس کے بھائی کا سارا بائیوڈیٹا معلوم کرواؤں گا۔مگر ایکوریٹ پہلے کی طرح بوگس بندے سے نہیں پھر دل لگنے میں محبت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔‘‘ وہ آئس کریم کھاتے ہوئے آگے کی پلاننگ کر رہا تھا۔

اگرچہ اندر ہی اندر اس کا دل تنبیہ کر رہا تھا کہ ابھی پہلے زخم پر کھرنڈ نہیں آئے سوئی منصوبہ بندی سے پرہیز کرنا چاہیے مگر دوسری طرف وہ ہاتھ آئے اس گولڈن چانس کو مس کرنے کے حق میں بھی نہیں تھا۔

واپسی پر دونوں ایک دوسرے کے سیل نمبر لے چکے تھے۔شیلا بھی آ گئی اور ان دونوں کو یوں ایک دوسرے سے محو گفتگو دیکھ کر اسی طرح بھونڈے مذاق کرنے لگی۔

’’اوکے سی یو۔میں رات کو تمہاری کال کا ویٹ کروں گی۔دس بجے کے بعد۔وہ اپنی پراڈو میں بیٹھنے سے پہلے ذرا مدھم آواز میں اسے تاکید کرتے ہوئے بولی تو وہ کھل کر مسکرا دیا۔

’’آج کتنے دِنوں بعد اس نے زندگی کو زندگی کی طرح محسوس کیا تھا ورنہ انہیں چھوڑنے کے بعد سے اب تک تو کسی بے حس لاش کی طرح اس نے سپاٹ بے کیف دن گزارے تھے۔

☆☆☆

رباب کے پاپا سابق ہوم سیکریٹری رہ چکے تھے۔اس کے دوسرے چچا فنانس سیکریٹری تھے۔اس کے ماموں صوبائی وزیر خزانہ رہ چکے تھے۔یہ تو اس کے خاندان کے لوگوں کے گورنمنٹ رینکیس تھے جبکہ بزنس کی سطح پر ان کی پوری بزنس ایمپائر تھی جس کا شمار کرنا مشکل تھا کیونکہ بہت کچھ پیپرز میں تھا اور بہت کچھ بی ہائنڈ دا سین بھی تھا۔

محمود کریم کی دو شوگر ملیں جن میں رباب کے والد کے ففٹی پرسنٹ شیئرز تھے۔اس کے علاوہ ان کی کاٹن ملز' گلاس فیکٹریاں تھیں جن میں ساری فیملی کے مختلف ایشوز میں شیئرز تھے۔دبئی میں ان کے سارے بزنس کی دیکھ بھال رباب کی ماما کرتی تھیں اور رباب اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد تھی۔

"پارس تو اب ہاتھ لگا۔" وہ ساری معلومات پڑھتا جاتا تھا اور سر دھنتا جاتا تھا۔

اس نے دِنوں میں ہی رباب سے تعلق بڑھانے میں دیر نہیں لگائی۔

"میری جان بہت اونچا اڑ رہے ہو ذرا سنبھل کے۔"

یہ رضوان کو نہ جانے کیسے خبر ہو جاتی تھی ہر بات کی۔ دو بار جاتے جاتے اسے ذومعنی انداز میں تنبیہہ کر گیا۔

"جلتا ہے کمبخت' خود جو جہاں تھا وہیں پڑا سڑ رہا ہے تو پھر دوسروں کی قسمت سے تو اس جل ککڑے نے خائف ہونا ہی ہے۔ بدنظر انسان پہلے بھی اس کی نظر لگی اور بنا بنایا کھیل الٹا ہو گیا۔ اب کے اسے کسی "معاملے" میں شامل نہیں کرنا۔" وہ رضوان کی تنبیہہ سے اچھا خاصا چڑا ہوا تھا۔

ایک دن رباب نے اسے اپنے چاچو کے اس فارم ہاؤس پرانوائٹ کیا کوئی فنکشن تھا۔

گیٹ ٹوگیدر کی کوئی تقریب جو اس نے وہاں دیکھی ایسی تو شاید اس نے ہمسایہ ملک کی فلموں میں دیکھ رکھی تھی کیا بے تکلف بے حجابانہ انداز محفل تھا اور جو محفل کا رنگ تھا اس رنگ میں ہر کوئی رنگا ہوا تھا۔

خود رباب نے اتنا مختصر لباس پہن رکھا تھا رات کی مناسبت سے بلیک لانگ اسکرٹ کے ساتھ بلیک ٹاپ جس پر خوبصورت سلور ہیروں جیسے رنگ لگے تھے میچنگ جیولری اور نازک بلیک سینڈل وہ پہلے دن والی اور روز ملنے والی رباب سے بالکل مختلف اور منفرد نظر آ رہی تھی۔

شیلا کے تو رنگ ہی جدا تھے۔ اس نے لباس کے نام پر دو دھجیاں ہی باندھ رکھی تھیں اور وہ جو ماڈرن سوسائٹی فیشن ایبل سیٹ اَپ میں مکس اپ ہونے کا متمنی تھا اس وقت اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

سادہ ڈنر سوٹ جو اسے رباب نے ہی گفٹ کیا تھا امپورٹڈ جوتے نہ جانے کس مہنگے برانڈ کے تھے وہاں کسی اور کے پیروں میں اتنا شاندار لیدر نہیں دیکھا تھا۔

ایک دوسرے کی بانہوں میں جھومتے گھومتے کپلز اور بیک گراؤنڈ میں چلتا لائٹ میوزک' مشروبات' کھانے' ویٹرز کی سرونگ' یہ سارا ماحول ہی اس کے لیے بے حد نیا اور انوکھا تھا۔

وہ بار بار ماتھے پر آتا پسینہ ٹشو میں جذب کر رہا تھا۔

"تم ادھر کونے میں کیوں کھڑے ہو؟ تمہیں اپنے انکل اور آنٹ سے ملواتی ہوں۔" رباب بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑے وہاں سے لے گئی۔

اس کے انکل اور آنٹ دو مختلف انکل اور آنٹ کے پہلو میں ڈانس کرتے مدہوش تھے انہوں نے رباب کے کرائے گئے زبردستی تعارف پر مسکرا کر اسے دیکھا اور ہاتھ ہلا کر روش کیا۔

"لگتا ہے ایسی کسی بھی گیٹ ٹوگیدر میں فرسٹ ٹائم آئے ہو۔" رباب اس کی بار بار بھیگتی پیشانی دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ دبا کر بولی وہ کھسیا کر سر ہلا بیٹھا۔

"آج کل کے زمانے میں تم جیسے "عجوبے" نوجوان واقعی دیکھنے بلکہ پریزرو کرنے کے قابل ہیں۔" وہ کھلکھلائی تھی۔ مسکرایا تو شہریار بھی تھا مگر اسے رباب کی بات کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی تھی۔ "آؤ تمہیں ایک زبردست چیز پلواؤں۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر بار ٹیبل کی طرف لے گئی جس پر ہر طرح کا "مشروب" سجا تھا۔

اس نے بڑی نزاکت سے اپنے ہاتھوں سے شہریار کے لیے نہ جانے کون سا مشروب تیار کیا تھا جبکہ شہریار کو تو وہ ساری صراحی دار رنگین بوتلیں ایک جیسی لگ رہی تھیں اس وقت گھبراہٹ میں اس سے ٹھیک طرح سے ان پر لکھے لیبل بھی نہیں پڑھے جا رہے تھے۔

"لو پیو۔ یہ میں نے فسٹ ٹائم صرف تمہارے لیے بنایا ہے۔ خاص اپنے ہاتھوں سے۔" اس نے آدھا بھرا جام اس کی طرف بڑھایا اور ساتھ جتا کر کہا۔

"سس ...... سوری .... میں نہیں پیوں گا۔" وہ بے طرح گھبرایا تھا۔ اس نے تو ایک بار بھی تنہائی میں اپنی تمام تر پلاننگ کے دوران اس مرحلے کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ اگر ایسا کوئی مرحلہ آ گیا تو وہ کیا کرے گا۔

"کم آن ایسٹرن بوائے' یہ وہ برانڈ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ یار یہ لائٹ اتنا پلیزنٹ ہے کہ تم اس کا ایک گھونٹ کیا پوری بوتل چڑھا جاؤ تمہیں ایسا اطمینان سکون ملے گا کہ تم تصور نہیں کر سکتے۔"

وہ ابھی بھی متذبذب تھا۔

"شہری ڈارلنگ! کم آن' ہماری سوسائٹی میں سیٹ ہونا ہے تو اس کی کسٹمز کو بھی اون (Own) کرنا پڑے گا ورنہ ...... ورنہ تو بہت مشکل ہو جائے گی میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔" اس کے سیاہ لباس کا تاریک سایہ یک دم اس کے چہرے پر چھا گیا تھا۔

"ایسا تو وہ مر کر بھی نہیں چاہ سکتا تھا مگر یہ ...." اس نے کنکھیوں سے سرخ جام کی طرف دیکھا۔

"کون سا میں ایک پینے سے عادی ہو جاؤں گا۔ اس کا دل رکھنے کی تو بات ہے۔ ضروری ہے کہ یہ ہر بار مجھ سے یونہی اصرار کرے اور میں پی ہی لوں پہلی بار اتنے مان اور چاہ سے کہہ رہی ہے تو مجھے بھی اس کے دلی جذبات کا خیال رکھنا چاہیے پھر وہ بھی تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس طرح میں کس طرح ان کے سرکل کا حصہ بن پاؤں گا۔ اسے بھی مشکل ہو جائے گی

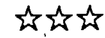
اور مجھے تو ہو گی ہی۔"

اس نے یہ ساری باتیں سوچنے کے لیے چند سیکنڈز لیے اور پھر جبراً ایک مسکراہٹ چہرے پر سجا کر رباب کو دیکھنے لگا۔

"اوکے تم نہیں پینا چاہتے تو کوئی بات نہیں، نو پرابلم۔" وہ بد دل سے ہو کر مڑنے لگی تھی جب شہریار نے ہاتھ پکڑ کر اس سے جام لیا اور لبوں سے لگالیا۔

رباب ایک دم ہنس پڑی اور اسے لگا اس کے دل کی کلی بھی کھل گئی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں سے دل میں اتارنے لگے۔



اور یہ انہیں نظروں کا اثر تھا یا اس جام کا کہ رباب کچھ ہی دنوں میں اس کے دل کے اتنے پاس آگئی کہ اسے کئی دھڑکنوں میں دھڑکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"شہری! میں جا رہی دبئی واپس۔" اس کی اطلاع تھی یا بم بلاسٹ۔

کچھ شہریار کے تاثرات بھی ایسے تھے کہ وہ خود ہی ہنس پڑی۔

"کم آن یار! تم تو پیلے پڑ گئے۔ ماما پاپا آرہے ہیں ان کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے جانا ہے اور انہیں میں نے بطور خاص یوں بلوایا ہے کہ ڈیئر تمہیں ان سے متعارف کرواسکوں کہ میں نے...... تم میرے بارے میں کہاں تک سوچ چکے ہو بتاؤ نا؟" وہ ایک دم سے بولی تو وہ فوری جواب نہ دے سکا۔

"یوں ہونقوں کی طرح کیا دیکھ رہے ہو۔ پسند کرتے ہو نا مجھے۔" وہ اس کی ناک ہلا کر بولی تو وہ بھی ہنس دیا۔

"ابھی شک ہے اس پسندیدگی میں۔" وہ براسامان کر بولا۔

"شہری! تم میرے ہو نا" وہ اچانک سے بولی۔

"بالکل......" وہ فوراً بولا۔

"مکمل میرے۔ ہے نا؟"

اس کے دوبارہ پوچھنے پر شہریار کا دل دھڑکا۔

"ہاں یار! مکمل طور پر تمہارا۔"

"تم انگیجڈ تو نہیں ہو نا' یا میرڈ؟ ہے نا' میں نے ٹھیک کہا نا؟"

وہ پوچھ رہی تھی اور وہ اسے پورے یقین سے جواب دینا چاہ رہا تھا مگر چاہنے کے باوجود نہ جانے کیوں تھوڑی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکا۔

"بولو نا' کیا پوچھا میں نے......" اس کے یوں چپ کھڑے رہنے پر وہ ہراساں ہو کر بولی۔

"اگر میں کہوں......" وہ رُک گیا۔ رباب خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ شہریار کی نظروں کے سامنے بے اختیار اپنے پیچھے آتی' اسے پکارتی ایمن کا چہرہ آگیا۔

رباب کہیں گم ہو گئی۔ اس کے سامنے ایمن کھڑی تھی صرف ایمن!



ایسا منظر اس کی نگاہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیران و ششدر تھی۔

منیا اس چوکور احاطے میں جہاں ساری کٹڑی کا کئی کئی دنوں کا کوڑا کرکٹ ایک غلاظت کی شکل اختیار کرتا جمع رہتا تھا۔ اس بے انتہا غلیظ، بدبودار ڈھیر پر جھکی اس کے اندر ہاتھ ڈالے کوئی سفید سفید سی چیز چن کر نکالتی اور بڑی رغبت سے منہ میں ڈال لیتی، وہ اس کام میں اس طرح محو تھی کہ اسے اردگرد کسی اور کی تو کیا شاید یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں سے کیا چیز اٹھا کر منہ میں ڈال رہی ہے۔

چند لمحوں سے زیادہ ایمن اس کریہہ منظر کو برداشت نہیں کر سکی اور اندھا دھند وہ اندھیری اونچے پائیدانوں والی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

اس کا ایک ہاتھ اپنے گلے پر تھا اور دوسرا پیٹ پر۔

وہ پاگلوں کی طرح بھاگتی اوپر آئی، راستے میں زاہدہ باجی کے پہاڑ سے وجود کو نظر انداز کرتے اندرونی کمرے کے عقب میں سے اس غسل خانے کی طرف بھاگ گئی۔

اس کا معدہ بری طرح سے الٹا تھا۔

اسے الٹی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی، اپنے شعور میں اس نے ہمیشہ کوشش کی کہ اسے کبھی الٹی نہ آئے۔ میڈیسن لے لیتی مگر تے ...... اور آج ان لمحات میں کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

''اے کیا ہوا، کیا ہو گیا؟ طبیعت تو اچھی ہے؟'' زاہدہ باجی اندر تو نہ آئیں وہیں پیڑھے پر بیٹھی چلا کر پوچھنے لگیں۔

ایمن ہانپتی ہوئی اندر آ کر اس جھلنگا مسہری پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی رواں تھا اور ڈھلمل کرتے پنکھے کو تکے جا رہی تھی۔

اسے پھر ابکائی آئی وہ غسل خانے کی طرف دوڑی۔

''اے منیا! دوڑ دیکھ ذرا مامی کو کیا ہو گیا۔ اللہ خیر کرے لگتا ہے کوئی خوشی کی خبر ہے۔''

زاہدہ باجی پیڑھا گھسیٹتے ہوئے ذرا سی آگے ہو کر چلائیں۔

''اے منیا! کہاں گئی۔ دفع ہو اوپر مر......'' زاہدہ باجی پوری دقت سے چلائیں۔

''کیا ہے، ماں! کیوں حلق پھاڑ رہی ہو۔'' منیا کی آواز سنتے ہی ایمن کا کلیجہ جیسے اچھل کر گلے میں آ گیا۔

''نامراد! صبح صبح نیچے کس ماں کو سلام کرنے جاتی ہے مردود...... تجھے تو میں پیدا ہوتے مار ڈالتی تو بڑا نفع کماتی ......'' زاہدہ باجی نے اسے دیکھتے ہی چلا کر کہا اور پاس پڑا اسٹیل کا گلاس اسے دے مارا وہ سائیڈ بچا کر کھی کھی کرنے لگی۔

''ہاں جیسے ان منحوس کاغذوں کو لئی لگا کر بڑا نفع کماتی ہے۔ تو اماں!'' وہ بے شرمی سے ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔

''اگر تھوڑا کام کروا دے، چار پیسے مل جائیں گے ورنہ آج پھر سب کو فاقے سے رہنا پڑے گا۔'' اب کے زاہدہ باجی نے ذرا ملائم لہجے میں کہا۔

''کون سی نئی بات ہو گی۔ روز ہی فاقہ کرتے ہیں۔ آج بھی کر لیں گے۔ رات پنکھے کے بغیر سوئے۔ مچھر اور کھٹملوں نے جو بدن میں رہا سہا خون تھا، وہ بھی چوس چوس کر نکال دیا۔ ساری رات میں سو نہیں سکی اور اماں تیرا یہ مفت خورا بدمزاج کریلے جیسا بھائی کب یہاں سے دفعان ہو گا۔ اوئے اوئے کر کے یوں بلاتا ہے جیسے ہم اس کے نوکر ہوں یا زمین پر رینگتے کیڑے ...... پتا نہیں کدھر سے ماموں بن کر آ گیا۔ ماموں چھوڑ مجھے تو کوئی ظالم قصائی......'' ابھی منیا کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ زاہدہ باجی نے چولہے کے پاس پڑا پتھر اٹھا کر اسے پوری طاقت سے دے مارا۔

اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ سی نکلی۔

پتھر اس کے کندھے کی ٹھیک ٹھاک مزاج پرسی کر گیا تھا۔

''تیری زبان میں کیڑے پڑیں جو میرے بھائی کو ایسے کہا کیسے بدبخت کدھر سے میرے گھر میں پیدا ہو گئی آستین کا سانپ تو کیوں نہیں کہیں دفعان ہو جاتی، جو اس کے بارے میں ایسے سوچے۔ نکل...... نکل یہاں سے دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے ...... تیری شکل نہ میں دیکھوں......'' وہ اب نان اسٹاپ گالیاں بک رہی تھیں۔

منیا ڈھٹائی سے کندھا سہلاتی اندر آ گئی۔ ایک نفرت بھری نظر ایمن پر ڈالی اور مسہری سے وہ میلا کچیلا تکیہ کھینچ کر نیچے لیٹنے لگی۔

ایمن کی نظروں سے وہ کریہہ منظر ہٹا ہی کب تھا، جو منیا کو دیکھ کر نئے سرے سے ابھرتا۔

تم...... تمہیں شرم نہیں۔ کوئی کس قدر غلیظ ہو تم گندی...... اس گندگی کے ڈھیر سے کیا نکال کر کھا رہی تھیں۔'' ایمن کو پتا نہیں چلا کب وہ درشت لہجے میں بولتے ہوئے اسے للکار بیٹھی۔

"ہم گندے غلیظ کوڑے کا ڈھیر، ٹھیک کہا تو تمہیں پاک صاف شہد لگے جسموں کو لے کر اس گندگی کے ڈھیر پر آ بیٹھنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ہم تو اسی گندگی میں پیدا ہوئے ہیں اور اسی ڈھیر میں مر جائیں گے تمہیں کیا تکلیف ہے۔" وہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر یوں بول رہی تھی جیسے ایمن کو کچا ہی چبا جائے گی۔

زاہدہ باجی کی گالیوں اور مغلظات کا طوفان اسی رفتار سے جاری تھا اور منیا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر مزے سے لیٹ گئی۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا۔" وہ دن بھر میں کئی کئی بار کبھی زیرلب کبھی دل میں اور کبھی سرگوشی میں خود کو یقین دلاتی رہی۔

"یہاں نہیں رہنا تو کہاں جاؤ گی؟" ہر بار اس یقین دہانی کے ساتھ یہ سوال بھی ضرور سر اٹھاتا رہا، جس پر وہ بے بس سی ہو کر رہ جاتی۔

"اماں! کھانے میں کیا ہے۔ بھوک لگی ہے؟" وہ کافی دیر اس کرسی پر بیٹھی رہی تھی۔ دو بار شہریار کے موبائل پر کال کرنے کی کوشش کی۔ اس کا موبائل مسلسل بند تھا۔

باہر سے شاید جگنو روہانسی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"اتنی بڑی پہاڑ سی ماں بیٹھی ہے، چھری پکڑو اور اس کو کاٹ کاٹ کر نمک مرچ لگا کر کھاتے جاؤ۔" زاہدہ باجی جلی بھنی آواز میں سنگ دلی سے بولیں کہ ایمن کرسی پر بیٹھی اور بھی سکڑ گئی۔

منیا اسی طرح ہاتھ پاؤں چھوڑے بے سدھ سو رہی تھی دو، تین بار زاہدہ باجی نے مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر اسے ماریں، وہ دوسری طرف کروٹ لے لیتی مگر اٹھی نہیں کیونکہ اسے معلوم تھا ماں یہاں تک تو اٹھ کر آ نہیں سکتی۔

"تھوڑے سے اور لفافے بنا لو تو جا کر چاچے کو دے آنا اور تھوڑے بہت پیسے لے آنا۔" یہ کوکو تھی اسکول سے آنے کے بعد بیٹھی مسلسل ماں کے ساتھ ان ڈائریکٹری کے صفحوں کو لئی کے ساتھ جوڑ جوڑ کر مہارت سے لفافے بنا رہی تھی، جگنو کو اپنے ساتھ لگانے کے لیے بولی۔

"ہرگز نہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔" جگنو تڑپ کر پیچھے ہٹا تھا۔

"بھوک تو جگنو! سب کو لگی ہے مگر بھوک بھوک پکارنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ ہاتھ پاؤں ہلائیں گے تو بھوک کا کچھ انتظام ہو سکے گا۔"

ایمن کو وہ ڈھانچہ سی کمزور لڑکی اس سارے ماحول میں متحمل مزاج اور حوصلے میں ان سب سے بڑھ کر صحت مند لگی تھی۔

"نہیں پہلے کچھ کھانے کو پھر کام کروں گا۔" وہ اڑیل لہجے میں بولا۔

"اماں! سلو کہاں ہے۔"

"اللہ جانے کہاں صبح سے دفعان ہوا ہے، ایک وہ مردود حرام خور پڑی اینٹھ رہی ہے۔ ایک وہ کام چور نوکری کو لات مار آیا ہے۔"

وہ سر پر بندھی ململ کی پٹی پر ہاتھ رکھ کر دبانے لگیں۔ پھر بہت سا وقت گزر گیا۔ کوکو تیزی سے لفافے بنا رہی تھی۔ جگنو وقفے وقفے سے بھوک کا راگ الاپ رہا تھا، منیا اب کروٹ پر کروٹ لیے جا رہی تھی۔ بھوک نے شاید اسے بھی اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اور ایمن وقفے وقفے سے شہریار کا نمبر ملائے جا رہی تھی، جو مسلسل بند تھا۔

"آخر میں اس کو کیوں فون کر رہی ہوں جب صبح وہ اپنے منہ سے دل کی بات کہہ کر ایک طرح سے اس تعلق کو لات مار کر چلا گیا تو پھر میں کیا اتنی بے شرم ہوں کہ ڈھیٹوں کی طرح اس کے آسرے کی طلب کر رہی ہوں جبکہ وہ مجھے کھلے لفظوں میں دھوکے باز کہہ گیا کہ اس کے ساتھ ہاتھ ہوا ہے تو اب وہ میرا فون کیوں ریسیو کرے گا۔ اگر میں ادھر پڑی رہوں گی تو اپنی مرضی سے وہ میری پروا کرنے نہیں آئے گا۔ وہ تو پہلے ہی اس جگہ سے متنفر تھا، اور دوبارہ یہاں کیوں آنے لگا، پھر میں کیوں اسے فون کر رہی ہوں۔ کس آس پر؟" اس نے بڑے تحمل بڑی بردباری سے خود کو سمجھایا تھا۔

"اب جو بھی فیصلہ کرنا ہے مجھے کرنا ہے یہاں رہنا ہے کہ......" اس کے خالی معدے میں مروڑ سا اٹھا۔

"ہرگز نہیں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا، میں......"

"اماں بھوک...... ہائے چکر آ رہے ہیں۔ رات بھی تین لقمے دیے تھے۔ ان کمینوں نے مجھے۔" جگنو کہتے کہتے ایک دم سے رونے لگا۔

منیا اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور متوحش نظروں سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کوکو کے ہاتھ بھی اب بالکل سست پڑ چکے تھے۔ زاہدہ باجی بے بسی سے روتے ہوئے جگنو کو دیکھ رہی تھیں۔

"اماں! کچھ کھانے کو ہے؟" اسی وقت سلو کی انٹری ہوئی۔

"ہاں ہے جوتے، مکے، لاتیں، گالیاں اور کوسنے کیا کھانا پسند کرو گے سلو بھائی؟" منیا کی زبان میں بے اختیار کھجلی ہوئی تھی، وہیں بیٹھی بیٹھی تڑخ کر بولی۔

اسی وقت سلو کی ٹوٹی پھوٹی پلاسٹک کی چپل ہوا میں اڑتی ہوئی آئی اور سیدھی منیا کے سر پر لگی وہ روتی روتی سر پر ہاتھ رکھ کر کمرے میں ناچنے لگی۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے بے دھڑک

گالیاں نکلنے لگیں۔

سلو بے نیاز سا چارپائی پر بیٹھ کر امید بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"اماں پانچ درجن ہوگئے ہیں، تیس روپے تو دے دے گا، چاچا۔ جاؤ سلو لے جاؤ۔" کوکو نے لفافوں کے دھاگے سے بندھے پانچ چھوٹے چھوٹے بنڈل آگے بڑھائے۔

"تیس روپے کا کیا کروں گا۔ اس نے اپنا ادھار ان پیسوں میں کاٹ لینے ہیں۔ وہ بنیا کبھی بھی نہیں دے گا پیسے مجھے۔ پتا ہے۔" سلو نے چارپائی سے کمر لگاتے ہوئے کہا تو کوکو نے آہستگی سے بنڈل اپنی طرف کھسکا لیے۔

اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ شاید صبح آنے والی ابکائیوں اور ان کے مسلسل جھگڑے اور صبح سے اب تک چلنے والے فاقے کی وجہ سے۔

"آخر یہ لوگ چپ کیوں نہیں ہو جاتے؟" اس نے جھنجلا کر سوچا۔ "کس سے جھگڑ رہے ہیں، بھوک کے لیے......اور بھوک...... کس سے مٹے گی...... بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

"کوکو! ادھر آؤ۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔

کوکو کچھ حیران سی پہلے اسے دیکھے گئی پھر ماں کو دیکھنے لگی، ماں نے بات سننے کا اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر آگئی۔

"یہ لو پیسے۔ ان کو کچھ کھانے کو منگوا دو۔" اس نے کرسی پر اپنے نیچے دبے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر کوکو کی طرف بڑھایا وہ ہچکچا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی جبکہ منیا اور سلو چمکتی آنکھوں کے ساتھ دو قدم آگے آگئے تھے۔

نا۔ نہیں رہنے دو۔ تم یہ تو یونہی شور کرتے ہیں ابھی تھوڑے لفافے اور بنیں گے تو دے آئے گا اور جا کر کچھ لے آئے گا؟"

زاہدہ باجی دبی دبی سی، کچھ قبول کر لینے والی آواز میں بولیں نیم رضامندی سی...... کوکو شرمندہ سی ماں سے نظریں پھیر کر ایمن کو دیکھنے لگی۔

"لے لو اور پلیز کچھ منگواؤ کھانے کو تو مجھے بھی دے دینا۔ میرے سر میں درد ہے اگر سر درد کی گولی بھی مل جائے یہ اور لے لو۔"

اسے خیال آیا۔ سو روپے تو بہت کم ہیں۔ اس نے سو کا دوسرا نوٹ بھی پہلے کے ساتھ ملایا تو کوکو اور بھی پریشان ہوگئی۔

"لائیں جی۔ میں لے آتا ہوں کیا کھائیں گی آپ؟ تکے کباب، نان یا مرغ چھولے ادھر سب کچھ ملتا ہے یا بریانی لے آؤں۔" سلو نے کوکو کے نوٹ پکڑنے سے پہلے جھپٹ لیے تھے۔

"ادھر آ میرے پاس میں۔ بتاتی ہوں کیا منگوانا ہے؟" زاہدہ باجی نے پیڑھے کے نیچے پڑی سوٹی سے سلو کی پنڈلی کو اپنی طرف کھینچا تو وہ منہ بناتا ہوا اماں کی طرف مڑ گیا۔

ایک گھنٹے ......طویل ایک گھنٹے بعد کھانا مل گیا۔

گرم گرم چپاتی کے ساتھ چنے شاید بازار سے منگوائے گئے تھے، پہلے لقمے پر ہی اس کی آنکھوں میں جیسے نئی روشنی اترنے لگی، ہر ہر لقمہ اسے زندگی سے جینے سے امید اور خواہش سے بھر پر زندگی کی امنگ جگا رہا تھا۔

وہ اکیلی بیٹھی کھا رہی تھی اور پانچویں باہر......

باہر بھی ایسا ہی سکون ایسی خاموشی خوشی سرسرا ہی تھی، کسی جھگڑے گالی گلوچ دنگے کے بغیر...... منیا، ایمن کے سامنے بیٹھی بے صبری سے بڑے بڑے لقمے اپنے منہ سے بھی بڑے دونوں جبڑوں میں کھائے جا رہی تھی۔

یہ لوگ پہلے کیسے کھاتے ہوں گے، کہاں سے کھاتے ہوں گے، بغیر کسی معقول ذریعہ آمدنی کے بغیر...... یہ لوگ جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں اور شہریار...... ایسا انسان ہے جس کا ان سے خون کا تعلق ہے اور وہ انہیں شاید جانور بھی نہیں سمجھتا، یہ مکمل انسان ہیں مگر غربت کا ناکردہ جرم انہیں جانور بنا رہا ہے شاید بنا بھی چکا ہے۔ کیا دولت خون کے رشتوں کو بھی بدل دیتی ہے۔

"یہ ناقابل یقین کیسے ہوسکتا ہے ایمن طاہر حفیظ! جبکہ تم خود۔ تمہاری اس جگہ موجودگی اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

آج تم دولت مند ہوتیں، تمہارے ماں باپ تمہارے لیے دولت جائیداد چھوڑ گئے تو کیا اس شہریار کی جرأت ہوتی کہ وہ تمہیں اپنی شرٹ پر پڑی گرد کی طرح جھاڑ کر چلا جاتا اور مڑ کر بھی نہ دیکھتا۔ تم یوں گٹر کے کنارے پڑی ہوتیں اگر تمہارے پاس پیسہ ہوتا سوچو ذرا۔"

کیسی کاٹ دار سوچیں تھیں کہ اسے کھانا کھانا بھول گیا۔

"تو کیا یہی وہ مضبوط سہارا تھا جس کے بارے میں ماما کا خیال تھا، میرے پاس ہونا چاہیے اس کے بغیر میں کیسے سروائیو کر پاؤں گی۔

ایگزیکٹلی ...... یہی وہ سہارا تھا جس کے نہ ہونے کی وجہ سے میں آج یہاں بے آسرا بے یار و مددگار پڑی ہوں، جس کے نہ ہونے کے سبب خالہ بی نے آنکھیں پھیریں۔ گولڈی بنٹی اور دوسرے سارے فرینڈز میری زندگی کے منظر نامے سے یوں غائب نہ ہو جاتے اور سب سے بڑھ کر شہریار...... جس سے میں نے دل کا ہی نہیں زندگی کا بھی ناتا جوڑا تھا، ہمیشہ کے لیے محض کاغذ کے

بے جان ٹکڑوں کے نہ ہونے کے سبب مجھے لات مار گیا۔ نہیں ......نہیں شہریار مجھے صرف مفلس قلاش ہونے کے خیال سے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر نہیں جاسکتا...... اسے صرف غصہ آیا ہے، ذہنی صدمہ...... جیسے ہی وہ اس شاک سے نکلے گا، وہ ضرور آئے گا ہمارا تعلق کوئی کچا دھاگا نہیں جسے توڑ دیا جائے...... مجھے بے صبرا نہیں ہونا چاہیے اس کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ...... خود سے اسے کال کرنی چاہیے وہ ضرور میرے بار بار کال کرنے سے اس وقتی صدمے سے نکل آئے گا اور...... مجھے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ کھانا پرے کر کے اپنا سیل ہاتھ میں لیے شہریار کو کال کرنے لگی شہریار کا موبائل آف تھا، اس نے مایوس سا ہو کر سیل کرسی پر رکھ دیا۔

سلو نے ایک نظر آگے ہو کر ایمن کو دیکھا، لمحہ بھر کچھ سوچا اور پھر سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

ایمن کی وہ رات کانٹوں پر گزری۔

صرف بستر کی بے آرامی نہ تھی۔ وہ نہ کبھی زمین پر سوئی تھی نہ سو سکتی تھی، زمین بھی ٹوٹی پھوٹی جس پر جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوں، وہ مسہری کے کنارے ہی گٹھڑی سی بن کر پڑی رہی مگر مسہری بھی کھٹملوں کا پسندیدہ ٹھکانا تھی۔ دوسرے بدن میں کھبتے ہوئے اس سال خوردہ مسہری کے اسپرنگ، روئی، فوم نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس میں اوپر بچھی اتنی گندی بدبودار شیٹ...... اسے کیسے نیند آسکتی تھی۔

رات بھر وہ بار بار شہریار کے سیل پر ٹرائی کرتی رہی۔

اس کے دل نے جو آس کے دھاگوں کو گرہیں لگا لگا کر اپنے حساب سے بڑا مضبوط اٹوٹ رشتہ اس سے جوڑا تھا، جوں جوں رات بھیگتی جا رہی تھی، اس دھاگے کی گرہیں ڈھیلی پڑتی پڑتی، اب بس کھلنے کو ہی تھیں اور اسے لگ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے حوصلے کے بند بھی ٹوٹ جائیں گے۔

اور اس ٹوٹتے بند کے ساتھ اگر وہ خود بھی ٹوٹ گئی۔ بکھر گئی تو......تو اسے کون سمیٹے گا۔ وہ یہ سوچتے ہی گھبرا کر کہنی کے بل ذرا سا اٹھ بیٹھی۔

''جو واقعی شہریار نہ آیا تو میں کیا کروں گی؟'' ڈوبتی رات کے آخری پہر میں یہ سوال کسی سانپ کے پھن کی طرح لہرا کر اٹھا تھا اور اسے لگا سارے بند ٹوٹ گئے۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی چپکے چپکے بہت دیر تک بے آواز آنسوؤں سے روئی۔

وہ پانچوں اس کے اردگرد فرش پر اِدھر اُدھر پھیلے سمٹے بے ہوش سوئے ہوئے تھے شہریار کے نہ آنے کی وجہ سے دن کے مختلف اوقات میں ایک ایک کر کے اس بیمار سال خوردہ پنکھے کی کشش

میں وہ کھنچے چلے آتے تھے چھ افراد کے تنفس کے کمرے میں اچھی خاصی گھٹن ہوگئی تھی۔

رات بھر ان سوچوں اور بے آرامی سے لڑتے لڑتے وہ صبح کاذب کے قریب سو ہی گئی۔

اور یہ سونا ہی غضب ہوگیا۔

وہ دن چڑھے اٹھی تھی جب سورج اوپر کے کناروں کو سلگاتا ہوا زوال کی طرف بڑھ رہا تھا۔

غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر آنے کے بعد اس نے موبائل کی تلاش میں مسہری کا جائزہ لیا۔

اس کے دوپٹے کے نیچے اس کا پرس جھانک رہا تھا۔ رات بھر اس کے نیچے ہی دبا رہا تھا، موبائل شاید تکیے کے نیچے تھا۔

اس نے تکیہ اٹھایا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اور بہت چھاننے پھٹکنے کو وہ کمرہ بہت بڑا بھی نہیں تھا۔ اس نے سب جگہ دیکھ لیا۔ سیل کہیں بھی نہیں تھا۔

پریشانی میں گھبرا کر باہر سے گزرتی مینا کو پکارا پوچھا۔ اس نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیئے۔ پھر سارے گھر میں ڈھنڈوریا مگر موبائل گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

وہ روہانسی ہو کر کرسی پر ڈھے گئی۔

اسے لگا، اب وہ شہریار سے کبھی رابطہ نہیں کر سکے گی۔

''کیا میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا؟'' اس کے دھڑکتے دل نے ان چاہا......سوال پوچھا تو لگا دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

''اماں! یہ سلو کہاں ہے؟'' کو کو خیال آیا تھا۔

''کام کی تلاش میں گیا ہے'' زاہدہ باجی تھکن زدہ لہجے میں بولیں۔

''کام!'' مینا زور سے ہنسی۔ ''میری بھولی ماں ''کام'' تو اسے مل گیا اب نہیں آتا وہ رات سے پہلے۔'' وہ چھوٹا سا کچا امرود کچر کچر کھا رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' زاہدہ باجی نے اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں اور سکیڑیں۔

''مطلب بتاؤں گی تو جوتا ماروگی۔ شام تک خود سمجھ جاؤ گی، آج کچھ پکے گا نہیں گھر میں۔'' اسے صرف ایک ہی بات سوجھتی تھی۔

اور شام تک ایمن سمیت سبھی کی سمجھ میں آگیا سلو کس کام کی تلاش میں گیا ہوگا۔

☆☆☆

ایمن کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر مسہری کے نیچے گھسا سوٹ کیس کھینچ کر دیکھنے لگی۔

سوٹ کیس میں صرف کپڑے اور جوتے تھے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کاونیٹی باکس جس میں اس نے اپنی چیک بک ڈپازٹ بک، اے ٹی ایم کارڈ، دوسرے بینک ڈاکومنٹس اور اپنا آئی ڈی کارڈ، تعلیم سرٹیفکیٹ رکھے تھے وہ باکس اس میں موجود نہیں تھا۔

''خالہ بی نے وہ باکس مجھے علیحدہ سے پکڑا دیا تھا کہ اسے احتیاط سے اپنے ساتھ رکھوں اور میں نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا اور پھر وہ گاڑی سے شہریار کے ساتھ صرف اپنا یہ پرس اور سیل فون لے کر آئی تھی۔''

شہریار کے جانے کے بعد اس نے دیکھا تھا کہ مسہری کے پاس یہ سوٹ کیس پڑا تھا۔ شہریار کا سوٹ کیس بیگ اور وہ باکس تینوں چیزیں گاڑی میں تھیں۔

''اب کیسے پوچھوں شہریار سے سیل کے بغیر...... اس کا نمبر آف تھا۔ کبھی نہ کبھی وہ ملتا ہی ......اور چیک بک، اے ٹی ایم کارڈ...... کچھ بھی نہیں میرے پاس......''

اسے لگا وہ ایک بار پھر تپتی دوپہر میں اکیلی تنہا کھڑی رہ گئی ہے۔ اس نے جھپٹ کر پرس اٹھایا اور کھول کے دیکھنے لگی۔

ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ، ایک پانچ سو اور تین سو سو کے نوٹ تھے کل آٹھ ہزار آٹھ سو روپے...... اور اس نے بے قراری سے اپنے کانوں میں پڑے ٹاپس، گلے کی چین اور ہاتھ کی دونوں انگوٹھیوں کو چھو کر دیکھا اور پرس مضبوطی سے بند کر دیا۔

اس کا کل اثاثہ اب یہی رہ گیا تھا۔

اس نے بے دلی سے سوٹ کیس بند کر کے مسہری کے نیچے دھکیل دیا۔

''بول کدھر تھا سارا دن؟ کیا چرا کر بھاگا تھا جو یوں رات کے اندھیرے میں لوٹا ہے بول نامراد، کہاں سے اس وقت آرہا ہے؟''

وہ اندھیرے میں اسی طرح گٹھڑی بنی سود وزیاں کے جوڑ توڑ میں گم تھی جب آدھی رات کے سناٹے میں زاہدہ باجی کی پاٹ دار آواز اور برستی سوٹی کی للکار گونجنے لگی۔

''میں کہاں گیا تھا۔ کام کی تلاش میں دوستوں کے ساتھ ذرا آتے ہوئے پھٹے پر بیٹھ گیا اور کدھر جانا تھا مجھے؟''

گھنٹے بھر کی تکرار، گالی گلوچ اور مار پیٹ کے بعد بھی وہ یہی کہتا رہا اس کا لہجہ کچے چور کا سا تھا اور انداز ڈھٹائی والا۔ اندر لیٹی ایمن کو اس کے لہجے سے پتا چل گیا کہ سیل فون وہی لے کر گیا تھا۔

اس نے بے دلی سے اپنا دھیان باہر کے غل غپاڑے سے ہٹالیا۔ اتنی تھوڑی سی رقم سے میں کیا کروں

گی۔ کیا؟ آج کی رات تو کل سے بھی دشوار لگ رہی تھی۔

آج تو بستر کی بے آرامی اور کھٹملوں کے کاٹنے کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔

''یا تو میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤں یا......'' اس دوسرے ''یا'' کے بعد اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

شہریار اتنا خود غرض اتنا بے حس نکلے گا اسے اب بھی یقین نہیں آیا تھا اگرچہ اس نے لمبی چوڑی امیدیں تو اس سے نہیں باندھی تھیں۔ مگر دل، یہ دل نہ جانے کیوں اس کی ہمیشہ کی جدائی کا سوچ کر پھٹا جا رہا تھا۔

اس کی آنکھ کے کنارے سے ایک آنسو ٹپکا اور گال کے نیچے رکھے ہاتھ میں پڑی اس انگوٹھی میں جذب ہو گیا جو شہریار نے اسے پہنائی تھی۔

کیا دولت کے لیے اس نے مجھے چھوڑ دیا...... صرف دولت کے لیے...... آج اگر میں دولت مند ہو جاؤں تو کیا وہ پلٹ آئے گا...... اور پھر سے دوبارہ کنگال ہو جاؤں تو پھر چھوڑ جائے گا...... ایسے کچے تعلق ایسے بودے رشتے کے لیے کیا رونا جو کاغذ کے ٹکڑوں سے بندھا ہو۔ دولت جیسی ناپائیدار گارنٹی کے ساتھ مشروط ہو۔

میں اس کے لیے کیوں روؤں جو میرے لئے افسردہ بھی نہیں ہوگا۔ اسے معمولی سا پچھتاوا بھی نہیں ہوگا مجھے چھوڑ کر چلے جانے کا ورنہ تیس بتیس گھنٹوں میں وہ ضرور رابطہ کرتا...... اور ان رستوں سے وہ ناواقف نہیں ہے پلٹنا چاہتا تو آ بھی سکتا تھا جو خود سے نہیں آنا چاہتا میں اس سے رابطے کے لیے کیوں مری جا رہی ہوں...... اگر وہ ایسا چاہتا ہے تو ایسا ہی سہی۔ میں اب اس ظالم بے وفا کو یاد کر کے نہیں روؤں گی۔ میرے آنسو نہ تو اتنے فالتو ہیں نہ بیکار۔

وہ آنسو صاف کرنے لگی۔

''آں!'' اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔

اندھیرے میں کوئی چیز اس کے ہاتھ پر گری تھی اور پھر...... کوئی اس کے پاس بیٹھا پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔ وہ خوف زدہ سی ہو کر اٹھ گئی۔

''کک کون...... کون ہے؟'' اس نے تاریک اندھیرے میں آنکھیں پھاڑیں۔

''میں ہوں تمہاری مجرم گناہ گار ہمیں معاف کر دینا۔ وہ بدبخت شاید بیچ آیا ہے تمہارا فون ......کہاں سے بھروں گی پہلے ہی زندگی وبال بنی ہوئی ہے...... مجھے معاف کر دو، وہ مسہری کی پٹی پر سر رکھے زمین پر بیٹھی روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بیٹھی زاہدہ باجی کو بدقت دیکھ پا رہی تھی۔

اس سے کوشش کے باوجود کچھ بولا نہیں گیا۔

"بہت مارا ہے میں نے اسے پر کیا فیدہ۔ وہ تو بیچ آیا...... شہریار نہیں آیا ...... مجھے نہیں پتا۔ تم دونوں کے بیچ کیا معاملہ ہے پر اگر تم یہاں رہنا چاہتیں ہو تو سو بسم اللہ یہ گھر تمہارا ہے پر میرے بچے بڑے خبیث .... سارا دن ایک ایک نوالے کے پیچھے کتوں کی طرح لڑتے ایک دوسرے کو کاٹتے نوچتے گالیاں بکتے ہیں۔ تمہارے شایان شان نہیں یہ ماحول ...... پر کیا کروں؟ انہوں نے بھی کچھ دیکھا ہی نہیں ...... آنکھ کھولی اور بھوک ننگ دیکھی ایک ایک دانے کے لیے لڑیں گے بس ...... اگر تمہیں نہیں رہنا ہے تو اپنی چیزوں کی راکھی خود ہی کرلینا۔ اگر جانا ہے ...... شہریار کو نہ بتانا کہ سلو تمہارا فون بیچ آیا وہ تو پہلے ہی ان سے اتنی نفرت کرتا ہے، ایک بار آیا تھا اور سلو نے اس کے پرس سے دس روپے چرا لیے تھے۔ اس نے اتنا مارا تھا بچے کو...... ساری کٹڑی کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے ...... کیا کروں کمبختوں کو چوری چکاری کی لت پڑ گئی ہے۔ جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو اس پر اتر آتے ہیں۔ میری حالت تمہارے سامنے ہے کہاں تک بھاگوں ان کے پیچھے۔ خود اپنی سانسیں نہ معلوم کیسے چل رہی ہیں۔ آج آنکھیں بند ہوں آج یہ سڑکوں، فٹ پاتھوں پر آجائیں۔ غنڈے موالی بن جائیں اور اب تک آ بھی چکے ہوتے اگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"میں تمہاری تھوڑی بہت رقم کچھ مرحلے میں بھر دوں گی" وہ ایمن کی چپ پر لجاجت سے پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

ایمن تو پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔

وہ کتنے چھوٹے چھوٹے دکھوں کو رو رہی تھی، وہ دکھ جو کسی کو نظر بھی نہیں آتے اور یہ جو اتنے بڑے بڑے المیے چلتے پھرتے جیتے جاگتے پھر رہے ہیں ہمارے معاشرے میں۔ ان پر تو پھر دن رات دھاڑیں مار مار کر رونا چاہیے۔

یہ گوشت کا پہاڑ سی عورت، یہ بھوکے، ننگے لڑتے جھگڑتے بچے اپنے بنیادی حقوق سے محروم، ایک دوسرے کو نوچیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے آج ایک دوسرے کو نوچ رہے ہیں۔ کل پورے معاشرے کا گلا کاٹیں گے پھر...... پھر کون ذمہ دار ہوگا ان پنپتے ناسوروں کا۔ یقیناً کوئی بھی نہیں۔

"آپ سو جائیں جا کر۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ ہاتھ باندھے معافی کی منتظر بیٹھی تھیں ایمن آہستگی سے کہہ کر وہیں دہری ہو کر لیٹ گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اب اپنے دکھوں کے لیے نہیں اپنی بے سائبانی، تنہائی اور شہریار کی جدائی بے وفائی کے دکھوں پر نہیں، اپنے اردگرد پڑے ان پانچ المیوں کے لیے اس کی آنکھیں نم ہوتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ خود میں عجیب سا بدلاؤ محسوس کر رہی تھی۔

"کتنے میں بیچا ہے تم نے وہ سیٹ؟ بولو۔" وہ بیرونی کمرے کے وسط میں سوئے سلیمان پر جھکی خوفناک تیوروں سے پوچھ رہی تھی۔

سلو کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا خوف و ہراس تھا جیسے ایمن ابھی اسے مارنے کے لیے پل پڑے گی اپنی لم ڈھینگ ٹانگوں اور تختہ جسم کو سکیڑتے ہوئے وہ خوف زدہ سا پرے کھسکنے لگا۔

"بولو کتنے میں بیچ کر آئے ہو۔ بتاؤ مجھے؟" وہ زور سے غرا کر اس کی طرف لپکی اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ اب گھٹنے سکیڑے اٹھ بیٹھا تھا اور گنگ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"بولو گونگے ہو گئے ہو، کتنے پیسے لیے تھے بیچ کر۔" اس نے جھٹکے سے سلو کا گریبان کھینچا اور اسے تھپڑ مارنے کو ہاتھ ہوا اٹھا کر روک لیا۔

زاہدہ باجی شور سن کر گھسٹتی ہوئی غسل خانے سے نکلیں اور بیرونی کمرے میں آگئیں، منیا اور جگنو بھی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت اور خوف لیے ایمن اور سلو کو دیکھ رہے تھے۔

"بولو ورنہ اتنا ماروں گی کہ یاد کرو گے کتنے میں دے کر آئے ہو؟" نہ جانے کیسے اس کی آواز میں اتنا جلال اتر آیا تھا۔

"پا...... پا...... پانچ سو روپے میں۔" سلو گھگھیا کر بولا تو ایمن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور اس کے گریبان پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"صرف پانچ سو روپے میں؟" وہ بے ہوش ہونے کو تھی۔

سلو نے موقع غنیمت جانا اور جست بھر کر کمرے سے باہر چھلانگ لگائی اور بھاگ گیا۔

"ارے رکو پاگل بے وقوف لڑکے! مجھ سے پانچ سو لے جاؤ ہزار روپے میں وہ سیٹ مجھے لا دو سنو رکو......" وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے چلاتے ہوئے لپکی مگر وہ اتنی دیر میں سیڑھیاں اتر کر فرار ہو چکا تھا۔

"مائی گاڈ! اتنا بیوقوف گدھا نکلا یہ امپاسبل ناقابل یقین میرا پندرہ ہزار کا سیٹ اور پانچ سو روپے میں ...... مائی گاڈ!" وہ وحشت بھرے انداز میں اپنے بال نوچنے کو تھی۔

"کیا ہوا؟" زاہدہ باجی اس کے انداز دیکھتے ہوئے ڈر کر بولیں۔

"کچھ نہیں احمق پاگل بھاگ گیا۔ جگنو...... جگنو سنو اسے بلا کر لاؤ۔"

"منت سے لالچ دے کر جیسے بھی۔ اسے بلا کر لاؤ، مجھے وہ سیٹ چاہیے اس میں میرے اتنے اہم نمبرز فیڈ ہیں۔ اور ...... اوہ جاؤ نا۔" وہ جگنو کو گم صم کھڑے دیکھ کر زور سے چیخی تو وہ سرپٹ

بھاگ گیا۔

''وہ کہیں بھی نہیں ہے، سارے میں ڈھونڈ آیا ہوں۔'' آدھے گھنٹے کے قیامت خیز انتظار کے بعد جگنو ناکام لوٹا تھا۔ ایمن تاسف بھرے انداز میں ہاتھ ملنے لگی۔

''منیا آٹا گوندھ دے ناشتہ تو بنا دوں تم سب کو۔ وہ پتا نہیں کدھر چلا گیا۔ رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا اس کرم جلے نے پتا نہیں اللہ نے انہیں پیدا کیوں کر دیا کیڑے مکوڑے ہوتے تو کسی نالی میں بہا چکی ہوتی۔ جیتے جاگتے ایسے منحوس اعمالوں کے ساتھ زندہ ہیں کہ مجھے جیتے جی قبر میں اتار رہے ہیں، موت بھی ہم جیسوں کے لیے عیاشی ہی ہوگی۔''

زاہدہ باجی دکھی نمناک لہجے میں کہہ رہی تھیں، ایمن کو شرمندگی سی ہوئی وہ ذرا آرام سے سلو سے پوچھ لیتی ذرا طریقے سے تو شاید وہ اس طرح ڈر کر نہ بھاگتا۔

شہریار کے اور اس کے طریقے میں بھلا کیا فرق ہوا اسے ندامت سی ہونے لگی۔

اور میں احمق جو اس سے کہہ رہی ہوں۔ پانچ سو لے جاؤ اور سیٹ لے آؤ بھلا جس نے وہ قیمتی سیٹ پانچ سو میں اس سے ہتھیا لیا۔ وہ بھلا اسے دوبارہ واپس کرے گا۔ الٹا دیے ہوئے پانچ سو سے بھی ہاتھ دھونے تھے بڑی دیر بعد اسے سامنے کی بات سوجھی تھی۔

گرم چپاتی کے ساتھ ذرا سا اچار کا مسالہ اور ایک لہسوڑہ تھا۔

اس نے کبھی ایسا ناشتہ نہیں کیا تھا کتنی دیر چنگیر سامنے رکھے اسے دیکھتی رہی پھر بے دلی سے دو تین لقمے لے کر باقی منیا کو دے دیا۔

اس کا کل کا دیا ہوا دو سو روپیہ چل رہا تھا جو سب کو روٹی تو مل رہی تھی گالی گلوچ تھی نہ چیخ و پکار نہ مار کٹائی۔

کھانے کے بعد منیا بھی کوکو اور زاہدہ باجی کے ساتھ شرافت سے بیٹھ کر لفافے بنانے لگی۔ جگنو بھی کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔

''تم اسکول نہیں جاتے؟'' وہ کمرے میں آیا تو ایمن یونہی پوچھنے لگی۔

''جاتا ہوں آج چھٹی تھی۔'' وہ جھجک کر بولا۔

''کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟''

''دوسری میں۔''

''اور کوکو؟''

وہ ساتویں میں۔'' وہ اب آرام سے باتیں کر رہا تھا۔

''منیا اسکول نہیں جاتی؟''

''نہیں اسے پڑھنا اچھا نہیں لگتا۔''

''تمہیں لگتا ہے؟'' وہ دلچسپی سے بولی۔

''بہت زیادہ۔'' وہ اپنی پھیلی پھیلی سی آنکھیں اور بھی پھیلا کر بولا۔ ''پر......''

''پر کیا؟''

''امتحانوں کے بعد اماں مجھے فیاض چچا کی دکان پر بجلی کا کام سیکھنے کے لیے ڈال دے گی وہاں تو میں ابھی بھی کسی کسی دن جاتا ہوں پر کام سیکھنا ابھی شروع نہیں کیا۔'' وہ چھوٹا سا بچہ کیسی پختہ زبان بول رہا تھا۔

''تو تم اماں سے کہو، تم نے پڑھنا ہے ابھی کام نہیں سیکھنا۔''

''فیاض چاچا مجھے دیہاڑی پر رکھے گا جب تک کام سیکھوں گا تو بیس روپے روزانہ تھوڑا اور کام سیکھ لوں گا تو چالیس کر دے گا اور دو تین سالوں میں ساٹھ ستر روپے دیہاڑی کم نہیں۔ اچھے بھلے ہیں پھر کام بھی آ جائے گا تو اماں کہہ رہی تھی کوئی کھوکھا بجلی کی چیزوں کا کھلوا دے گی۔'' وہ بڑے مدبرانہ انداز میں اپنے مستقبل کی ممکنہ تصویر کشی کر رہا تھا۔

ایمن کو چھوٹے سے بچے کے منہ سے ایسی باتیں سننا کتنا عجیب لگ رہا تھا۔ اس عمر میں تو اسے ''روٹی کا خرچا'' کا مفہوم بھی شاید نہیں آتا تھا۔

''بھلا یہ سلو کہاں گیا ہوگا اور اس نے پانچ سو روپے کا کیا کیا ہوگا؟'' وہ اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے موضوع بدل کر بولی۔

''وہ بوبی کی دکان پر شرطیں لگا کر بلیرڈ کھیلتا ہے وڈیو گیمز کا پاگل پن جیسا شوق ہے اور اس کا اور......'' وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے ذرا سا آگے ہوا ''اور وہ تھوڑا چرس کا نشہ بھی کرنے لگا ہے اور ساتھ کسی اور چیز کا بھی۔ وہ ناصر اور ٹومی کے ساتھ سگریٹ بھی خوب پیتا ہے۔'' جگنو کے انکشافات سے ایمن کے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔

گویا ایک دو سال میں سلو پوری مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ جرم کی دنیا کا حصہ بن سکتا تھا۔ اور یہ تینوں...... اس نے تاسف بھری نظروں سے جگنو کو اور منیا کی طرف دیکھا۔

''یہ تینوں بھی شاید غلط رستوں کے راہی بن کر اندھیری راہوں میں کھو جائیں اور ان کی ماں...... بیماریوں کی پوٹ کسی بھی لمحے تمام ہو سکتی ہے تو ان تینوں چاروں کا ہاتھ پکڑنے، خیال کرنے، مار پیٹ کر سدھارنے کی ناکام کوشش کرنے والا کوئی بھی نہیں رہے گا۔ کوئی بھی نہیں۔'' اس کی نظروں میں شہریار کا وجیہہ دراز سراپا آ گیا۔

وہ جسے اپنی عیش بھری زندگی کے سوا اور کسی سے کوئی غرض نہیں کیا اس سے کوئی امید رکھی

جاسکتی ہے بالکل نہیں۔"

"آپ ادھر کتنے دن رہیں گی؟" ایمن کے بے تکلف بات کرنے سے شاید اس کی جھجک کم ہوئی تھی۔ اسے سوچوں میں گم دیکھ کر وہ بولا۔

"کتنے دن رہوں؟" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی تو وہ گڑ بڑا گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کندھے اچکا کر مسکرانے لگا۔

اس بچے کی مسکراہٹ کتنی پیاری ہے اور شاید اسے کسی بچے کی مسکراہٹ کو یوں قریب سے دیکھنے کا موقع بھی تو پہلی بار ملا تھا۔

"تم اس طرح مسکراتے اچھے لگتے ہو۔ کون سا کھیل پسند ہے تمہیں؟" ایمن کی نظریں اس کی پھٹی پرانی رنگ اڑی بشرٹ اور خاکی نیکر سے اوپر معصوم چہرے پر پھیلی پھیلی آنکھوں اور چھب دکھاتی مسکراہٹ پر ٹک گئی تھیں۔

"کھیل؟" وہ اچنبھے سے بولا۔ "کوئی بھی نہیں۔ بیٹ بال اچھا لگتا ہے پر کوئی لاکر ہی نہیں دیتا پھر یہاں جگہ بھی نہیں کھیلنے کی۔ پہلے کہیں بھائی اپنے ساتھ وڈیو گیم پر لے جاتا تھا، بہت دن پہلے، اب تو بالکل بھی نہیں۔" وہ سر ہلا کر مایوسی سے بولا۔

"ماموں آئیں گے تو آپ چلی جائیں گی؟" وہ لمحہ بھر بعد پھر بولا تو وہ جواب دیے بغیر مسکرانے لگی۔

"پھر تو ماموں کبھی نہ آئیں۔" وہ بہت آہستگی سے لبوں میں بولا تھا۔

"اوں کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"جگنو ادھر آ۔ اندر بیٹھا کیا باتیں مٹھار رہا ہے۔" زاہدہ باجی کی آواز پر دونوں چونکے۔

"میں جاؤں جی؟" وہ اجازت طلب انداز میں بولا۔ فرماں برداری سے اس کی طرف دیکھتا۔ ایمن کو بے ساختہ اس پر پیارا آگیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ہاتھ پھیلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ بچہ اسے تھوڑی سی توجہ، تھوڑا پیار اور بنیادی زندگی کی ضرورتیں مل جائیں تو کیا کیا نہیں بن سکتا۔ اس کا ذہن کسی اور ہی لائن پر سوچ رہا تھا۔

وہ بے چین سی ہو کر کھڑی ہوگئی اور غسل خانے کی بیرونی دیوار کی منڈیر سے نیچے اس تنگ اندھیری گلی میں دیکھنے لگی۔ آگے کو سر کر کے اس نے آسمان دیکھنے کی کوشش کی۔

جتنے دنوں سے وہ ادھر تھی۔ آسمان تو کہیں نظر نہیں آیا تھا آسمان باریک روشنی کی لکیر کی

صورت میں نظر آیا۔ وہ تھک کر اندر آگئی یہاں سے نکل کر میں کسی ہاسٹل میں چلی جاؤں ایک مناسب طرزِ رہائش میسر ہوسکتا ہے اور اس کے بعد جانے ...... اور اگر جاب ملنے میں بہت دن لگ گئے تو یہ جو تھوڑی جمع پونجی ہے۔ یہ ہاسٹل کے اخراجات میں اٹھ جائے گی۔

وہ بال سلجھاتے ہوئے اپنی سوچوں کو کسی نکتے پر مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا میں ان حالات کو مقدر جان کر صبر کرلوں؟"

اور نصیب ...... میرے نصیب کی بھی تو یہی سازش ہے بلکہ شاید مجھے چیلنج کیا جارہا ہے۔ بینک اکاؤنٹ کا سہارا بھی گیا موبائل بھی گھر بھی ...... یعنی زیرو ...... صفر سے اسٹارٹ ...... مجھے گویا آزمایا جارہا ہے تقدیر میرا ٹرائل کرنے پر تلی ہوئی ہے تو مجھے بھی خود کو آزمانا چاہیے۔

مجھے اپنی ذات کے مضبوط سہارے کو تھام کر مشکلات بھری اس زندگی کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دینی چاہیے۔

اور پاپا ...... پاپا بھی تو یہی کہتے تھے کہ مجھے اتنا بہادر ہونا چاہیے کہ میں اپنے سوا اور کسی پر بھروسا نہ کروں ...... مجھے ایک بار فقط خود پر بھروسا کر کے دیکھنا تو چاہیے ...... وہ سب کچھ جو میرا نہیں تھا۔ مجھ سے چھنا جاچکا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ میں خود سے کیا کچھ اپنے لیے کرسکتی ہوں۔

اپنے لیے نہ سہی مگر ان ضائع ہوتی برباد ہوتی پانچ زندگیوں کے لیے مجھے اپنی خام یا خوابیدہ صلاحیتوں کو آزمانا تو چاہیے یوں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر مایوس و بے دم ہو کر بیٹھنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا اتنا پتا تو ان تین چار دنوں میں چل ہی گیا ہے۔

صرف ایک رات ...... شہریار احمد! میں صرف ایک رات اور تمہارے پلٹنے کا انتظار کروں گی اور کل صبح ...... کل کی صبح ایک پُر جوش پر عزم ایمن کو اس میدان کارزار میں اترتے ہوئے دیکھے گی۔

اس کے پورے بدن میں نئی توانائی کی چنگاریاں سی دوڑنے لگی تھیں۔ وہ اس مختصر سے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے جارہی تھی۔

"چلو اپنی زندگی کا تو جو حشر ہوا سو ہوا، اگر میں ان کی زندگی میں کچھ آسانیاں کچھ بہتری لاسکوں تو شاید مجھے خوشی اطمینان قلب مل ہی جائے وہ جو کہتے ہیں دوسروں کے دکھ بانٹنے سے راحت ملتی ہے مجھے اس مقولے کو آزمانا چاہیے۔

"یہ کس طرح لفافے بناتے ہیں میں بھی بناؤں۔" وہ اگلے پل ان تینوں ماں، بیٹیوں کے پاس بیٹھی ڈائریکٹری کے پھٹے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیے پوچھ رہی تھی۔ ان تینوں کے ہاتھ جہاں تھے وہیں تھم گئے۔

''نن۔نہیں ایمن! تم نہیں کرسکتیں اور کیوں کرو۔ ہم کرلیں گے تم اندر جا کر آرام کرو۔''
زاہدہ باجی گھبرا گئیں۔

''آرام کروں؟ میں کیا بیمار ہوں جو ہروقت آرام کروں؟'' وہ چڑ کر بولی۔

اسے رات گزرنے کا انتظار تھا۔ ایک پورا دن ایک پوری رات شہریار کے انتظار کی آخری حجت تمام کرنی تھی اور اس انتظار کو تکلیف وہ بنانے کے بجائے وہ کسی کام میں گزارنا چاہتی تھی، اسی لیے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

منیا اور کوکو بھی حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

یہ چہرے اتنے بھی بدصورت نہیں کہ ان سے صرف نفرت ہی کی جائے۔

وہ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس کی انگلیاں لئی کے ڈبے سے لئی ٹٹول رہی تھیں۔

اس کا رات بھر کا انتظار بے ثمر ہی رہا۔ شہریار کو نہ آنا تھا نہ آیا۔

اور صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کی ساری خوش فہمی ساری خوش گمانی اور اس خفیف سی محبت کے سارے آثار گم ہوتے چلے گئے۔

''تو وہ نہیں آیا اور شاید ......'' کبھی نہ آئے، کے الفاظ وہ دل میں دُہرانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس کے اتنے گھٹیا اور گرے ہوئے انداز محض پیسے کے لیے ایمن سے محبت کا ڈھونگ رچانے اور پھر شادی کے بعد یوں لات مار جانا ہی اس سے نفرت کرنے کے لیے کافی تھا مگر جہاں اس کی ساری خوش گمانی ہوا ہوئی، وہیں اندر ہی اندر کہیں شہریار کی روٹھی ہوئی محبت اپنے قدم جما کر بیٹھ گئی۔

شاید میری ہی خطا ہو، میری غلطی میں ٹھیک طرح سے اسے حقیقت بتا نہیں سکی، جو وہ اپنے خوابوں کو تراشتا میرے ساتھ اتنا آگے نکل آیا کہ قانونی دستاویز پر دستخط کر کے مجھے اپنا بنا بیٹھا اور خوابوں کو تراشنا اور ان کو تلاشنا یقیناً قابل مذمت ہے نہ قابل نفرت سو مجھے تم سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔

''مامی! ناشتہ کرلیں۔'' ایک بالکل اجنبی سے تعلق سے کسی نے اسے پکارا شہریار کے تعلق سے ...... اس کا دل بے اختیار دھڑکا تھا کوکو اس کے آگے پلیٹ رکھ رہی تھی۔

کل کی طرح ایک سوکھی چپاتی اور کٹوری میں تھوڑا سا دہی۔

''تم آج اسکول نہیں گئیں؟'' اس نے پلیٹ کو سرسری نظر دیکھ کر کوکو سے پوچھا۔

''اماں کی طبیعت اچھی نہیں، دوسرے میرے پاس سائنس کی کتاب اور کاپی نہیں۔ تین دن سے سائنس ٹیچر مجھے سزا کے طور پر کلاس سے نکال دیتی ہے۔ اس لیے آج میں گئی نہیں، وہ ہلدی جیسی رنگت والی لم ڈھنگ سی کمزور پتلی دبلی لڑکی تھی منیا کے برعکس دھیمی آواز میں بولنے والی۔

''اور جگنو کیا اسکول؟''

''ہاں وہ تو گیا ہے۔ آپ چائے پئیں گی؟'' وہ مڑنے لگی۔

''نہیں اور منیا اسکول کیوں نہیں جاتی؟''

''اسے پڑھنے کا شوق نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''سلو گھر آ گیا رات کو؟'' اسے یکدم خیال آیا۔

''نہیں۔'' وہ رنجیدہ سی آواز میں بولی۔

''اس نے کتنی کلاسیں پڑھی ہیں؟''

''تیسری جماعت میں تھا جب اماں نے اسے کام سیکھنے پر ڈال دیا تھا۔'' وہ جواب دے کر رکی نہیں باہر نکل گئی۔

ایمن نے آدھی روٹی دہی کے ساتھ کھا کر پلیٹ اٹھائی اور باہر نکل آئی زاہدہ باجی چارپائی پر سر باندھے لیٹی تھیں۔

ایمن ان کا پیڑھا گھسیٹ کر چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ لفافے بناتی کوکو نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا منیا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

''آپ سے ایک بات پوچھوں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''ہیں ...... ہاں بولو۔ کھایا کچھ؟''

''جی ...... یہ گھر ...... میرا مطلب ہے یہ کس کے نام ہے۔'' اس کا سوال شاید اتنا خوف ناک تھا کہ ان کا رنگ یک لخت اڑ گیا۔ ''کیوں پوچھ رہی ہو؟'' وہ ہکلا کر بولیں۔

''کیا ہم اسے سیل نہیں کرسکتے؟''

اس نے ہم پر زور دے کر کہا انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ گھر شہریار کے نام ہے رجسٹری وغیرہ سب ابا نے اسی کے نام پر کیا تھا پھر یہاں سے جانے کے بعد برسوں اس نے خبر نہیں لی اور ان بچوں اور بیماری کے ساتھ جب کوئی کمانے والا بھی نہیں تھا، صرف بھیک مانگنے کی کسر رہ گئی تھی بلکہ مہینے میں کئی دن تو کٹری کے مختلف گھروں سے بچا کھچا خراب ٹھیک کھانا آتا تو ہماری حالت بھکاریوں سے بھی بدتر ہوئی پھر اوپر دو چھتی پر رکھی پیٹی میں سے پرانے لحاف نکالتے ہوئے وہ رجسٹری ملی شہریار کے نام تھی، میں اسے کسی طرح بیچنے کی

مختار بھی نہیں تھی، پھر میرے رشتے کے چچا نے وہ رجسٹری کہیں گروی رکھوا کر مجھے اس زمانے میں پندرہ ہزار روپے لا دیے سال ڈیڑھ سال ان روپوں کے بل پر گزرے، اگر چہ اس دوران میں نے چھوٹے موٹے کام کرنے کی بھی کوشش کی نیچے کٹڑی کے دروازے پر سلو کو چھابہ لگا کر دیا کبھی شکرقندی کا، کبھی بسکٹ ٹافیاں یا دو، دو روپے والے بچوں کے کھلونے ...... مگر سب کا نتیجہ پیسے کا ضیاع ہی نکلا، سلو کام تو کرتا ہے مگر پیسے کا سنبھالنا اسے نہیں آتا گھاٹا نقصان ...... اور کام ٹھپ پھر وہ پیسے بھی ختم ہوگئے، چاچا کا انتقال ہوگیا، وہ رجسٹری کس کے پاس گروی رکھوا گئے تھے۔ کئی طرح سے پتا کروانے کی کوشش کی سال بھر پہلے پتا چلا چاچا کے کوئی دوست تھے اور اب وہ پندرہ ہزار پر سود لگا کر اسی نوے ہزار روپیہ بنا چکے ہیں۔ اگلے سال تک جگہ خالی کرنے یا رقم ادا کرنے کا ان کا پیغام اسی مہینے آیا تھا سمجھ میں نہیں آتا یہاں سے کدھر جاؤں اور نہ جاؤں تو رقم کیسے ادا کروں۔''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔

ایمن چپ سی بیٹھی رہ گئی۔

''آپ نے شہریار سے ذکر کیا؟'' اسے اپنے سوال کی بے وقعتی کا علم تھا پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

''مجھ سے بات کرنا، میری طرف دیکھنا کب پسند کرتا ہے جو اتنا لمبا چوڑا فضول قصہ مجھ سے سنتا۔'' وہ آہ سی بھر کر بولیں۔

''کوکو یہاں کوئی قریب ہی انگلش میڈیم اسکول ہے؟'' وہ سر جھکا کر لفافے جوڑتی کوکو سے بولی تو اس نے سر اٹھا کر اسے چھنبے سے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

''مجھے وہاں لے چلو گی۔ میں جاب کرنا چاہتی ہوں گھر میں بے کار بیٹھے رہنے سے مصروف رہنا اچھا ہے۔''

وہ یوں اپنائیت سے کوکو سے بات کررہی تھی جیسے مدتوں سے اس گھر میں رہتی چلی آرہی ہو۔

''کیوں اللہ خیر کرے۔ ابھی تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور پھر شہریار تمہیں یہاں کیوں رکھنے لگا اسے تو خود یہاں رہنا پسند نہیں پھر نوکری کرنے کا فائدہ؟''

زاہدہ باجی اٹھ کر بیٹھیں تو چارپائی نے خوب چوں چوں کر کے دہائی دی۔

''مجھے شاید ابھی کچھ مہینے ادھر ہی رہنا پڑے۔'' وہ نظریں چرا کر بولی۔

''کیوں! خیر تو ہے۔'' وہ اپنی اندر کو دھنسی آنکھیں چندھیا کر بولیں۔

''یونہی۔'' کوشش کے بوجود وہ سچ نہ بول سکی۔

اس کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔

''چلو کوکو چلیں پھر۔'' وہ ایکدم سے اٹھتے ہوئے کوکو سے بولی تو وہ کچھ حیران سی اس کی

طرف اور پھر اجازت طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''اور سلو کو کب پیغام بھجوا دیں وہ گھر آجائے۔ میں اسے کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ کہہ کر اندر آگئی۔

سوٹ کیس سے بلیک جینز اور گرے کرتہ نکال کر دیکھنے لگی، ان کپڑوں کو پریس کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ چینج کر کے باہر نکلی تو کوکو پیلی سی اوڑھنی اچھی طرح لیے کھڑی تھی اسے دیکھ، کر کچھ پریشان سی ہوگئی۔

کچھ یہی کیفیت زاہدہ باجی کی بھی تھی۔

''چلیں تمہاری سائنس کی بک اور کاپی بھی لے لیں گے۔'' وہ پرس کندھے پر ڈال کر آگے چل دی دروازے میں داخل ہوتی منیا اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور پھر متعجب سی ہو کر ایمن کو دیکھنے لگی۔

ایمن اپنی دھن میں تھی اس کی نظروں کی حیرت نوٹ کیے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''مامی ...... مامی!'' کوکو آہستہ سے پکارتی اس کے پیچھے آئی۔

''میں آپ کو یہ کہہ سکتی ہوں نا!'' وہ اس کے پیچھے آرہی تھی۔

''مامی۔''

''ہاں اچھا ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''اسکول یہاں سے کتنی دور ہے۔''

''دو تین ہیں زیادہ دور بھی نہیں۔'' اب وہ دونوں کٹڑی کے احاطے میں آگئی تھیں۔

سبزی کی ریڑھی سے سبزی خریدتی تینوں عورتیں اور سبزی والا پہلے تو منہ کھولے ایمن کو دیکھتے رہ گئے پھر معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا اور مسکرانے لگے۔

''اے کوکو! یہ منڈا لڑکا کون ہے؟'' خالہ بتول نے کوکو، کو آواز لگائی جسے وہ ان سنی کر کے ایمن کے ساتھ جا ملی۔

''او بلے بھئی بلے فوجاں کیتھوں آئیاں۔'' پتا نہیں پیچھے سے کون منچلا تھا جس نے بلند آواز میں نعرہ زنی کی تھی اور پھر راستے میں جدھر جدھر سے وہ گزرتی رہیں۔ مختلف آواز سے فقرے اور شوخ سیٹیاں بجنے لگیں۔

پہلے تو ایمن ان چبھتی نظروں اور پیچھا کرتی آوازوں کو نظر انداز کرتی رہی مگر پھر پاس سے گزرتے ایک دو لڑکوں نے باقاعدہ اس کے ساتھ ٹکرانے کی کوشش کی تو وہ آگ بگولہ ہی ہوگئی۔

''اسٹوپڈ! اندھے ہو یا کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ ال مینرڈ۔'' وہ ٹکر سے بچتے ہوئے

زور سے چلائی تھی۔

کوکو نے زور سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچنے لگی۔

''مامی چلیں یہاں سے پلیز۔''

''ماشاءاللہ کیا چال ہے اور کیا چلن ہے۔'' وہ دونوں اب مسلسل ان کے پیچھے آ رہے تھے۔

''مامی واپس چلیں۔'' کوکو کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

''ہرگز نہیں میں ان سے ڈرتی نہیں کہ بھاگ جاؤں، چلو تم۔'' وہ ڈٹ کر بولی ''آگے چوک میں پولیس کا کوئی بھی آدمی ہوگا دیکھنا تم میں ان کی کیا درگت بناتی ہوں ساری لوفری نکل جائے گی۔''

وہ گردن موڑ کر ان آوارہ لڑکوں کو دھمکاتی ہوئی بولی تو دونوں ڈھٹائی سے ہنسنے لگے اور معنی خیز اشارے کرنے لگے۔

''مامی! ایک یہ اسکول ہے۔'' کوکو اسے گھسیٹتے ہوئے سامنے چھوٹی سی گلی کے اندر دائیں طرف بنے دروازے کی طرف لے کر بڑھی، لعل اینجل انگلش میڈیم اسکول ایمن اندر داخل ہوتے ہوئے صرف یہی پڑھ سکی۔

اسکول کی پرنسپل شکل سے اور حلیے سے نہ تو ہائیلی کوالیفائیڈ لگ رہی تھی، نہ ماڈرن بلکہ ایمن کو وہ پیچھے آتے آوازے کستے جاہل لڑکوں کی جیسی لگ رہی تھی، جو اس کا لباس دیکھتے ہی حیرت اور معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''یہ آپ اسکول میں جاب کرنے آئی ہیں یا کسی شاپ میں، بلکہ اس کے لیے بھی کوئی گارنٹی یا سرٹیفکیٹ چاہیے ہوتا ہے۔'' اس کے پاس تو سرٹیفکیٹ یا ڈگری نہیں اور وہ جاب کرنا چاہتی ہے سنتے ہی پرنسپل گویا اپنی سیٹ سے اچھل پڑی۔

''سوری میں آپ کو جاب نہیں دے سکتی، یوں بھی ہمارے ہاں کوئی ویکنسی نہیں ہے۔''

آخر میں اس نے رکھائی سے ٹھینگا دکھایا تو ایمن جو خاصے ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی ایک دم غصے میں آ گئی۔

''بائی داوے آپ کے پاس کون سی ڈگری ہے جہالت کی یا مس بی ہیو میں ماسٹر کی اور آپ کا یہ سڑا ہوا اسکول اس میں اگر کوئی ویکنسی نام کی چیز ہوتی بھی تو میں ایکسیپٹ نہ کرتی۔ گوٹو دا ہیل۔''

اس نے بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی اور کرسی کو ٹھوکر مارتی باہر نکل آئی۔

کوکو تو پرنسپل کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر پہلے ہی ڈر کر باہر بھاگ آئی تھی۔

بقیہ اسکولوں میں بھی اسی سے ملتی جلتی صورتِ حال پیش آئی۔

البتہ چوتھے اسکول کے ادھیڑ عمر پرنسپل نے اس سے انگلش کا ایک پیراگراف ٹرانسلیٹ کروانے اور دو تین موضوعات پر چند لائن سن کر تھوڑی دیر کو چپ سادھ لی۔

وہ تو ادھر بھی ناکامی ہی سمجھ رہی تھی کہ پرنسپل کے منہ سے بالکل الٹ الفاظ نکلے تھے۔

''ٹھیک ہے ہم آپ کو ٹرائل بیس پر رکھ لیتے ہیں پندرہ دنوں کا ٹرائل ہوگا اس کے بعد ہم کوئی فائنل فیصلہ آپ کے بارے میں کریں گے۔''

وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور وہ بے یقینی سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''اور پے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟'' اس کا مدعا نوکری نہیں تنخواہ تھی۔ سو تسلی کرنا ضروری تھا شاید ان کا ارادہ بھی تنخواہ وغیرہ دینے کا نہیں تھا۔ اس کا سوال سن کر سر ہلانے لگے۔

''اوکے اگر آپ ٹرائل میں کامیاب رہیں تو اسٹارٹ میں آپ کو پندرہ سو روپے دیں گے۔ اس کے بعد آپ کی پرفارمنس دیکھ کر بڑھا بھی سکتے ہیں۔''

''یہ تو بہت کم ہیں۔'' وہ مایوس ہوگئی۔

''نہ آپ کے پاس کوئی سند ہے نا ڈگری ہے نہ تجربہ اس کے باوجود ہم آپ پر ٹرسٹ کر رہے ہیں ورنہ تو شاید کوئی رکھے بھی نہیں۔''

پرنسپل کی بات پر وہ دھیرے سے ''تھینک یو'' کہتی باہر نکل آئی۔

''چلو گھر کے راشن کا کچھ سامان خرید لیتے ہیں اور تمہاری کتابیں۔''

باہر نکلتے ہوئے وہ ہلکی پھلکی سی ہو کر بولی اس وقت یہ معمولی جاب بھی غنیمت تھی۔

''نہیں مامی! ابھی میں تھک گئی ہوں، شام میں یا کل آ جائیں گے''۔ کوکو نے تو واپسی پر دوڑیں لگا دی۔

''اچھا آہستہ تو چلو مجھ سے ان اونچے نیچے رستوں پر اتنا تیز نہیں چلا جاتا۔''

اور کوکو کا دھیان ادرگرد آتے جاتے دکانوں پہ بیٹھے لوگوں کی طرف تھا جو ایمن کا لباس دیکھتے ہی پہلے چونکنے سے ہوتے، دوسرے پل ان کی نظروں کا انداز ہی بدل جاتا۔

وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی، سو ایمن کا ہاتھ پکڑے کھینچتی ہوئی اسے ساتھ لیے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ پندرہ دن تو کیا وہ پانچ دن بھی نہیں گزار سکی۔ اس کی مجبوری پریشانی اور حالت غم یقیناً جینوئن تھی، مگر اس کی تربیت ...... تربیت کا بیڑا شاید وقت کی کرتوں اور زمانے کے تھپیڑوں نے

اٹھایا تھا مگر یہ بیڑا تو ابھی ساحل سے ذرا ہی آگے کھسکا تھا، سو خام تربیت کے ساتھ، اتنی کٹھن منزل کی پہلی سیڑھی پر ہی اس کے قدم ڈگمگا کر رہ گئے۔

اور اس طرح زندگی گزارنا بھی اس کا اپنا منتخب کردہ...... سو وہ اسے کسی بھی وقت سر سے اتار کر پھینک سکتی تھی، جیسے تیسرے ہی دن وہ اس نوکری کو سر سے اتار کر پھینک آئی۔

پہلے دن جب وہ کوکو کے ساتھ انٹرویو کے لیے جینز پہن کر آئی تھی اسکول کے بچوں نے اسے دیکھ رکھا تھا اور بچے بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے، جس سے بڑے جو گلیوں میں آوازے اور شوخ فقرے کستے رہتے تھے۔ ''ٹیچر! آپ پینٹ پہن کر کیوں نہیں آئیں۔'' پہلے ہی دن پہلے پیریڈ میں ایمن نے جس معصوم صورت بھولے بھالے سے بچے کو پاس آنے پہ گال تھپتھپا کر پیار کیا، اسی نے آنکھیں مٹکا کر سوال کیا تو پل بھر کو گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

''مس ایمان سے کیا زبردست لگ رہی تھیں۔'' پہلے بچے سے بھی نسبتاً بھولا دکھنے والا بچہ جس انداز اور اسٹائل میں بولا تو ایمن کو لگا اس کے چودہ کیا سارے کے سارے طبق روشن ہوگئے ہیں۔

''شٹ اپ اینڈ ٹیک یور سیٹس۔'' لے دے کے اس کے پاس ان کا بچکانہ مگر بے ہودہ ترین سوالوں کا جواب یہ ڈانٹ ہی بچی تھی۔

اور اس ڈانٹ کا بدلہ پوری کلاس نے تین گھنٹوں میں خوب لیا کہ بریک تک اس کا سر پھٹنے کے قریب ہوگیا۔

انتہائی بدتمیز، منہ پھٹ، شور کرنے والے لڑنے بھڑنے اور اونچی آواز میں گالیاں بکتے بچوں نے اسے حواس باختہ سا کر دیا۔

انہیں ڈانٹتے ڈپٹتے سیٹ پر بٹھاتے جھڑکتے گھرکتے اور دو تین کو تھپڑ لگاتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ کم از کم ٹیچرنگ اس کے بس کا پروفیشن نہیں۔

اگلی صبح وہ پھر بھی خود کو ذرا تیار ذرا ہوشیار اور تھوڑی متحمل مزاج بنا کر کلاس روم تک لائی تھی۔

جیسے ہی اس نے اپنی کال سننے کے لیے اپنا پرس جو اس نے آتے ہی ٹیبل پر رکھا تھا اسے کھولا۔ اتنا موٹا ہرے مٹیالے رنگ کا مینڈک پھدک کر اس کے ہاتھ پر آ بیٹھا۔ اور اس کی چیخوں سے سارا اسکول تھرا اٹھا۔

اس روز پرنسپل نے ساری کلاس کو دن بھر دھوپ میں کھڑا کیے رکھا پھر اسی کے نازک دل کو رحم آیا اور پرنسپل سے درخواست کر کے انہیں کلاس میں لے آئی۔

مگر نہ وہ بچے نہ وہ کلاس کسی قسم کے رحم کے قابل تھی، اس کا احساس اسے اگلی صبح اپنی چیئر پر بیٹھتے ہی ہوگیا۔ چھوٹا سا بلی کا بچہ کشن کے نیچے اس کے بیٹھتے ہی نحیف آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگا، پہلے تو ایمن کو سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے اور جب سمجھ میں آئی تو وہ ڈر کے مارے کلاس کے دروازے پر کھڑی تھی اور ساری کلاس تالیاں پیٹتی ہنسی روکتی پیٹ دباتی اس کے خوف زدہ چہرے کا مذاق اڑا رہی تھی اور وہ اپنے دھک دھک دھڑکتے دل کو سنبھالتی وحشت زدہ سی پرنسپل کے آفس کا تو کیا رخ کرتی، اسکول کے بیرونی دروازے سے ہی نکل گئی اور دوبارہ اس طرف کا رخ نہیں کیا۔

یقیناً یہ مسائل کا حل نہیں تھا۔ مگر اس معاملے نے تو اس کے حوصلے ہی توڑ کر رکھ دیے۔

''میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔'' وہ سر ہاتھوں میں جکڑ گھنٹوں ایک ہی جگہ پہ بیٹھی رہتی۔

''آخر میں ادھر کیوں بیٹھی ہوں، یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی جیسے وہ چلا گیا مجھے چھوڑ کر۔ بغیر میرا احساس میرا خیال کیے۔'' اس ایک خیال پہ آکر ساری سوچیں ٹھٹک جاتی تھیں۔

کوکو اور منیا غسل خانے کے باہر بنے چھوٹے سے کمرے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر دھو رہی تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے دونوں کمروں کے لمبے بانس کے منہ پر کپڑا باندھ کر جالے اتارے تھے، دیواریں جھاڑو سے رگڑ رگڑ کر صاف کی تھیں، مسہری کے نیچے سے گند اور گرد کا ڈھیر نکالا تھا، فرش دھوئے تھے ان کے گڑھوں میں جمع ہونے والا پانی گندے تولیے میں بھر بھر کر نکالا تھا۔ مسہری کے اندر ٹرنکوں کے اردگرد جالے موٹے موٹے مکڑے، کیڑے، کاکروچ اور جانے کیا کیا نکلا تھا۔ کوکو نے سارے میں ڈی ڈی ٹی چھڑکی تھی اور فنائل کپڑے پر ڈال ڈال کر مسہری اور اس کے اردگرد کا سارا فرش چمکایا تھا۔

ان تینوں میں ایمن کے اکسانے پر تھوڑا خرچ کرنے پر نیا ولولہ سا پیدا ہوگیا تھا، شاید انہیں زندگی کچھ زندگی جیسی رواں ہوتی نظر آنے لگی تھی وہ کل جا کر منیا کا پانچویں جماعت میں داخلہ بھی کروا آئی تھی نئی کتابوں اور بیگ لالچ میں منیا نے پڑھنے کی حامی بھی بھر لی تھی جگنو اور کوکو پہلے بھی پڑھائی سے نہیں بھاگتے تھے۔ ایمن کو اپنے اور گھر کے ساتھ اپنائیت برتتے دیکھ کر ان میں نیا جوش سا بھر گیا تھا۔

زاہدہ باجی کا بیمار، مرجھایا ہوا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ گوشت کے اندر دھنسی آنکھوں میں کیسی ممنونیت بھر گئی تھی۔

صرف ایک سلو تھا، جو اس سے چھپتا پھرتا تھا اگرچہ اس نے کئی بار اسے دوستانہ انداز میں بلانے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ تو اس کی شکل دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا۔

اس نے اسکول کے رستے میں آنے والے دو پراپرٹی ڈیلرز سے مناسب سستے کرائے پر ذرا بہتر گھر کے لیے بھی کہا تھا۔ ان ہی تنگ ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں گھٹے گھٹے تنگ کمروں والے مختصر سے مختصر گھر کا کرایہ سن کر ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ کٹڑی کے ماحول احاطے میں جمع اس غلیظ گند کے ڈھیر سے اٹھنے والی بو سے نجات پانے کے لیے کہیں اور جانا چاہتی تھی کرائے کا سن کر اس نے کچھ عرصے تک جب تک وہ کچھ سیٹل نہیں ہو جاتی یہیں رہنے کا بادل نخواستہ فیصلہ کر لیا۔

مگر اب...... ایک اس چھوٹی سی معمولی نوکری کا آسرا ہوا تھا وہ اسے بھی چھوڑ آئی تھی اور یہ تو طے تھا وہ خود چھوڑ کر نہ آتی تو پندرہ دنوں بعد انہوں نے خود ہی اسے فارغ کر دینا تھا۔

''آخر تو چاہتا کیا ہے نامراد! جب پیٹ کی دوزخ بھڑکنے لگتی ہے تو تجھے گھر یاد آنے لگتا ہے روٹیاں توڑنے کے لیے۔ ایمن بے چاری نے مہینے بھر کا راشن ڈلوا دیا تھا تو روٹی مفت کی ملنے لگی پر میں بتاؤں تجھے آج نہیں ملے گی جا یہاں سے کسی لنگر سے کھا لے جب تجھے ہماری پروا تک نہیں تو ہمیں بھی تیری بھوک کی فکر نہیں۔''

شاید سلو آیا تھا زاہدہ باجی نے اسے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا۔

''نہ دو روٹی جو سارے دن میں دو روٹیاں دے کر احسان کرتی ہو، چار سال کا تھا جب سے اس گھر کی روٹی چلانے کے لیے کمانے میں لگا ہوں، اب چار دن کو بے روزگار کیا ہوا ماں نے آنکھیں پھیر لیں تو باقیوں سے کیا گلہ کروں گا، چلا جاتا ہوں یہاں سے، نہیں آؤں گا دوبارہ جب تمہیں میری ضرورت نہیں۔ پروا نہیں تو میں......'' وہ رندھے ہوئے گلے سے کہہ کر مڑا اور جانے لگا۔

ایمن نے چھلانگ ماری اور پیچھے سے جا کر اس کی قمیص کو کندھے سے دبوچا۔

وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا، خوف زدہ سا مڑا اور ایمن کی شکل دیکھ کر اور بھی ڈر سا گیا۔

''ادھر آؤ۔ میری بات سنو۔ کتنے دنوں سے تمہیں بلا رہی ہوں۔'' وہ اسے گھسیٹتی ہوئی اندر کھینچ لائی۔

''وہ جس کو میں نے موبائل بیچا تھا اس نے آگے کہیں اسے سیل کر دیا ہے تو میں کہاں سے لاؤں؟'' وہ اسے یوں گھسیٹنے کا مطلب سمجھتے ہوئے عاجزی سے بولا۔

''اس کو گولی مارو۔ تم یہ بتاؤ۔ تم کیا چاہتے ہو؟'' ایمن اسے مسہری پر بٹھا کر اس کے آگے

کرسی پر رستہ روک کر بیٹھی تھی کہیں وہ اٹھ کر فوراً نہ بھاگ لے۔

''کیا میں کیا چاہتا ہوں؟'' وہ ذرا بگڑ کر بولا۔

''اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ یونہی آوارہ پھرتے رہو گے؟''

''کام ڈھونڈ تو رہا ہوں۔ نہیں ملتا تو کیا کروں؟'' وہ تیکھے انداز میں بولا۔

''کام کو چھوڑو۔ پڑھو گے؟'' وہ نرم انداز میں اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی تو وہ حیران ہوا جیسے کوئی نہ سمجھ میں آنے والی بات پوچھی گئی ہو۔

''کیا؟'' وہ حیران سا بولا۔

''پڑھو گے اسکول میں؟'' وہ زور دے کر بولی۔

''میں؟'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اچنبھے سے بولا۔

''ہاں تو اور کیا تم نے کون سی جماعت تک پڑھا ہے۔''

''چوتھی کلاس میں تھا جب چھوڑ دیا۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کیوں؟'' ''پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔''

''ہوں۔'' وہ نظریں چرا کر بولا۔

''تو اتنے سال پڑھائی چھوڑ کر بھی تم نے کیا کیا؟ کوئی کام ہنر سیکھا کہ گھر والوں کے لیے نہ سہی اپنے لیے کچھ کما سکو۔''

وہ جواب میں چپ سا رہ گیا۔

''اچھا، اب مجھے بتاؤ مگر سوچ کر تم کیا چاہتے ہو پڑھنا چاہتے ہو یا کوئی کام سیکھنا چاہتے ہو۔''

''نشہ کب سے کر رہے ہو؟'' وہ آہستہ سے بولی تو اس نے یوں چونک کر سر اٹھایا جیسے کسی چیز نے اسے کاٹا ہو۔

''نن۔ نہیں......''

''جھوٹ نہیں بولنا۔ سچ کہو اور مجھے معلوم ہے تم نشہ کرتے ہو، سگریٹ بھی پیتے ہو جوا کھیلنے والے آوارہ لڑکوں کی ٹولی میں بھی بیٹھتے ہو اور......''

''یہ جھوٹ ہے، غلط ہے۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''یہ سب درست ہے مجھے معلوم ہے۔ تم پڑھائی دل لگا کر کرنے لگو تو میں تمہیں پارٹ ٹائم کرنے ہی نہ دوں، دیکھو پڑھ لکھ جاؤ گے تو ایک باعزت باوقار انسان کی طرح سر اٹھا کر زندگی گزارو گے تمہارے...... ماموں کی مثال تمہارے سامنے ہے، کس طرح انہوں نے اس پسماندہ

ماحول سے نکل کر خود کو پالش کیا تعلیم حاصل کی اور......"

"سوری مگر میں ان جیسا کبھی نہیں بننا چاہوں گا میں کوئی کام ڈھونڈ رہا ہوں مل جائے گا اور آپ...... آپ کے بھروسے پر...... معلوم نہیں آپ کتنے دن یا کتنے گھنٹوں کے لیے ادھر آگئی ہیں، جب ماموں جیسے قریبی رشتے نے ہمیں کبھی نظر اٹھا کر دیکھنے یا ہم سے ہمدردی کرنے کی زحمت نہیں کی تو آپ کو بھلا کیا مصیبت پڑی ہے کہ ایک بات پوچھوں سچ سچ بتایئے گا؟" وہ لڑکا نہ تو اتنا چھوٹا تھا نہ اتنا کم عقل اور نادان جتنا وہ اسے سمجھ رہی تھی۔

"ہاں پوچھو۔" اس کا قد ایمن سے بھی نکلتا ہوا تھا۔

"کیا آپ کوئی جرم کر کے ادھر چھپنے کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ کیونکہ عموماً لوگ ایسے علاقوں کا رخ تبھی کرتے ہیں۔ جب انہیں قانون کی نظروں سے چھپنا ہو۔" وہ واقعی اتنا چھوٹا اور نادان نہیں تھا۔

اب کے گنگ ہونے کی باری ایمن کی تھی کہ وہ فوری طور پر تردید بھی نہیں کر سکی۔

"میں نے ٹھیک کہا نا؟" وہ اس کی چپ کو رضامندی سمجھ کر طنز سے بولا۔

"غلط بالکل غلط۔" وہ زور سے سر ہلا کر بولی۔

"جیسے آپ نے میرے سچ پر یقین نہیں کیا تو میں کیسے کرلوں۔"

وہ اس کے یوں سر ہلانے پر آرام سے بولا ایمن تپ ہی تو گئی۔

"تمہاری مرضی۔ میں نے جو کچھ کہا تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے کہا۔ میں نے یہ مشورہ تمہاری بہتری کے لیے دیا تھا ورنہ تم جو جی میں آئے کرو آئی ڈونٹ کیئر۔"

اس کے میں نہ مانوں والے اڑیل سے انداز اور تمسخرانہ نظروں سے بری طرح جھلتے ہوئے کہا اور کرسی پیچھے کھینچ کر بیٹھ گئی۔

وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر باہر نکل گیا۔

یہ جاہل کم عقل سا لڑکا مجھے کیسا آئینہ دکھا گیا۔

وہ بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوگئی اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

اسی شام سلو کی محلے کے لڑکوں سے تاش کھیلتے ہوئے زبردست لڑائی ہوگئی، انہوں نے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔

اس کا سارا جسم نیلونیل تھا سر میں گہری چوٹوں کے ابھار...... وہ سیڑھیوں کے پاس نیم بے ہوش پڑا تھا جب جگنو نے اوپر آکر ماں کو اطلاع دی۔

زاہدہ باجی تو وہیں سینہ پیٹ کر رونے لگیں اِدھر اُدھر سے عورتیں فوراً اکٹھی ہوگئیں۔

ایک تو ان کے لیے ایمن کی موجودگی معمہ بنی ہوئی تھی اور موٹی زاہدہ اس بارے میں ذرا جو منہ سے بھاپ نکالتی ہو اس معمے کی، دوسرے سلو کی محلے کے بدنام ترین بدمعاش لڑکوں کی ٹولی میں شمولیت اور اب اس کی ایسی خستہ حالت پھر سب سے بڑھ کر انہیں یہ تجسس پاگل کردینے کے لیے کافی تھا کہ اتنے دِنوں سے زاہدہ موٹی کے گھر سے بچے ادھار آٹا، چینی، دودھ، پیسے، دال کچھ بھی مانگنے نہیں آئے ایسا کون سا پوشیدہ خزانہ اس کی کوٹھڑیوں سے نکل آیا ہے، جو اسے کٹڑی کے لوگوں کی حاجت نہیں رہی۔

وہ زاہدہ اور سلو کو تسلی کم دے رہی تھیں۔ نظریں اِدھر اُدھر جدھر جدھر جاسکتی تھیں۔ دوڑا دوڑا کر اس تجسس کی تشفی کے لیے کوئی سرا ڈھونڈنے میں جتی تھیں۔

"اے زاہدہ! یہ ادھر ہی ہے خیر سے تمہاری بھرجائی، بھائی تو تمہارا ادھر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ یہ ادھر کا ہے کو بیٹھی ہے؟"

ایک عورت سے رہا نہیں گیا منہ کے آگے دوپٹے کا گولہ سا بنا کر اتنی سرگوشی میں ضرور بولی کہ زاہدہ کے ساتھ جملہ عورتیں اور اندر بیٹھی ایمن بھی سن لے۔

"ہوں آتا ہے۔" زاہدہ باجی نے رونے کے دوران مبہم سالبوں کے اندر باہر زبان کو پھیر دیا۔

"دیکھا تو کبھی نہیں ...... اے کہیں بھگا کر تو نہیں لایا، شکل حلیے سے تو کسی ٹھیک ٹھاک کھاتے پیتے گھرانے کی لگتی ہے عشق مشک کا معاملہ لگتا ہے۔"

"لگتا ہے دونوں گھر سے بھاگ کر آئے ہیں۔ اب ماں باپ کے عتاب سے بچنے کے لیے وہ اسے ادھر چھوڑ کر خود کہیں اور روپوش ہوگیا ہے۔" تیسری نے کہانی کو کلائمکس تک پہنچا دیا۔

"ہوسکتا ہے اس کے ماں باپ کے ہتھے چڑھ ہی گیا ہوا۔ حوالات کی سیر پر ہو، اس کا دماغ بھی اللہ معاف کرے ساتویں آسمان پر رہتا ہے چار حرف کیا پڑھ گیا خود کو کوئی اعلیٰ چیز ہی سمجھنے لگا ہے اے وکیل احمد بخش نے ...... ترس کھا کر، اسے اسکول میں پڑھایا اور اس کا خرچ اٹھایا ورنہ باپ کی طرح آج کھوتا ریڑھی چلا رہا ہوتا، اللہ معافی دماغ میں ایسا تکبر کا کیڑا ہے۔"

ان سب نے اتنے دِنوں کی دل میں چھپائی بھڑاس خوب منہ بھر بھر کر نکالی۔

اور زاہدہ باجی کو تسلی دینے کے بہانے اپنے کلیجے میں سلگتی یہ چنگاریاں ٹھنڈی کیں اور سلو کو رحم بھری نظروں سے تکتی ایک ایک کر کے رخصت ہوئیں۔

جگنو کو ساتھ والے پپو کی ماں کے ساتھ بھیج کر زاہدہ باجی نے سلو کے لیے ڈسپنسری سے

دوائی منگوائی اور اسے گرم دودھ کے ساتھ زبردستی دی اب اسے مارنے پھٹکارنے یا ڈانٹنے کا فائدہ نہیں تھا گھنٹہ بھر میں تو اس کا پنڈہ تیز بخار میں جلنے لگا تھا۔

ایمن اسے دیکھنے باہر نہیں آئی۔

ان عورتوں کی باتوں نے اسے اندر تک جھلسا دیا تھا، وہ از سرنو یہاں سے بھاگ جانے کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

سلو کی ہائے ہائے نے رات بھر کسی کو بھی سونے نہیں دیا۔

صبح پھر محلے کے ڈاکٹر سے اس کی دوائی کیفیت بتا کر منگوائی گئی، گھر کا راشن تمام ہونے کو تھا، اس کے لیے پیسے دیے، ایمن کے پرس سے نیلے نوٹ تیزی سے کم ہوتے ہوئے صرف دو عدد رہ گئے تھے اور اس کی فکر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''مامی! آج مجھے ٹیچر سے شاباش ملی میں نے سبق بھی ٹھیک سنایا تھا اور کام بھی پہلے دنوں کے مقابلے میں اچھا کیا تھا یہ دیکھو۔'' کوکو کی دیکھا دیکھی جگنو اور منیا بھی اسے مامی کہنے لگے تھے۔ منیا نے اپنی اُردو کی کاپی کھول کر اس کے آگے کی۔ اس نے بے توجہی سے دیکھا۔

اس کے لیے اب ادھر وقت گزارنا بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

''بھاگ جاؤں یا رہ جاؤں مجھے جو بھی حتمی فیصلہ کرنا ہے جلد از جلد کرنا ہوگا، بالکل قلاش ہونے سے پہلے۔ وہ پھر اسی کشمکش کے بھنور میں ڈول رہی تھی۔ اسے کبھی ایسی سچویشن کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا جن میں ٹھوس اور حتمی فیصلوں کی ضرورت پڑتی ہے پھر وہ اپنی اندرونی کشمکش کی وجہ سے کسی بھی فیصلے پر بہت دیر تک قائم بھی نہیں رہ پاتی تھی اور سب سے بڑی گڑبڑ اس کا دل کرتا تھا جو کسی کی تکلیف اور دکھ کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا اور اسے خلاف طبیعت و فطرت فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتا اور بعد میں وہ ان فیصلوں سے نظریں چرانے لگتی۔

اب بھی ایسی ہی صورت حال تھی وہ ایک بار پھر فرار کے لیے رستہ تلاش رہی تھی مگر باہر نکل کر اپنے لیے سب سے پہلے کوئی سر چھپانے کا مرحلہ اسے سب سے کٹھن لگتا اور آزمائے ہوئے دوستوں کو وہ آزمانا نہیں چاہتی تھی۔

''مامی! دیکھیں میں نے صحیح لکھا ہے؟'' جگنو اس کے پاس بیٹھا اپنے اسکول کا کام کر رہا تھا اس کے آگے اپنی کاپی کرتا ہوا بولا اس نے بے خیالی میں ایک نظر اس کی کاپی پر ڈالی اور اس کی سرسری نظر کئی پل اس صفحے پر ہی رہ گئی۔

موتیوں جیسی شفاف انداز تحریر اور ایک ردھم میں لکھی ہوئی ترتیب وار خوبصورت لکھائی۔

''بہت خوبصورت لکھائی ہے جگنو تمہاری؟'' وہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''جی سارے اسکول میں سب سے اچھی میری لکھائی ہوتی ہے، سب استاد میری کاپی منگوا کر اپنی کلاس کے لڑکوں کو دکھاتے ہیں۔'' وہ جواباً خوش ہو کر فخریہ انداز میں بولا۔

کوکو باہر چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی، شام کو چولہے کا پائپ کھینچ کر چولہا باہر لے جاتے تھے کہ آگ کی گرمی سے دونوں کمرے کم گرم ہوں اور ایمن تو اس پر بھی شکر کرتی تھی کہ یہاں گیس تھی، اگر لکڑیاں یا کوئلہ ہوتا...... وہ یونہی آگے بڑھ کر کوکو کی بکھری کاپیاں اور کتابیں کھول کر دیکھنے لگی۔

اس کی لکھائی جگنو جیسی خوبصورت تو نہیں تھی مگر اچھی تھی اور ہر ٹیسٹ میں اس کے مارکس اور ٹیچرز کے کمنٹس......

''میں ہر سال اپنی کلاس میں فرسٹ آتا ہوں اس بار بھی ماسٹر جی کہہ رہے تھے میں ہی اوّل آؤں گا۔'' جگنو کہہ رہا تھا۔

''کیا ان دو ذہین دماغوں کا حق نہیں کہ انہیں تعلیم ملے اور اس کے لیے بنیادی ضروریات بھی۔'' تھوڑی دیر بعد اس کا دماغ پھر اس تصور میں چکر کھا رہا تھا۔

اور ایمن اس کے چہرے پر نظریں گاڑے سوچتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اف اتنا خوف ناک منظر...... اس نے کب دیکھا تھا اس نے منہ پر ہاتھ رکھا مگر اس کے باوجود اس کی بے اختیار چیخیں نکلتی چلی گئیں۔

وہی ہنستا مسکراتا پڑھائی سے محبت کرنے والا معصوم چہرے والے جگنو کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی...... بالکل جیسے کٹ چکی ہو صرف اٹھانے والے کے بازو کے سہارے سے جڑی ہو...... ایک دھاگے کے برابر جڑی ہو ورنہ کٹ چکی ہو۔

اور سرخ سرخ گرم لہو کی دھاریں یوں بہہ رہی تھیں جیسے کوئی فوارہ اچھل رہا ہو خون میں لت پت، اس کی آنکھیں کھلی ہوئیں اور پتلیاں ایک ہی نکتے پر ساکت...... اس کی دل دوز چیخوں اور ان کے واویلے سے سارا علاقہ گونج اٹھا۔

ساتھ والا پپو اور ناصر منڈیریں پھلانگ کر آئے اور پتا نہیں کیسے وہ قاتل دھاگہ جو شاید اس کی گردن تن سے جدا کر ہی چکا تھا۔ الگ کر کے اسے بازوؤں میں اٹھائے نیچے بھاگے۔

اور وہ وہیں کوکو کے ساتھ چمٹی منہ کے آگے ہاتھ رکھے، آنکھیں میچے چیختی چلی گئی۔ کوکو بس چند لمحے ہی اسے سہارا دے سکی، پھر خود بھی روتی ہوئی وہیں گر گئی۔

اچھا بھلا جگنو نے ہوم ورک ختم کیا اور زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر کے اپنے ساتھ چار منزلہ

اوپر چھت پر لے آیا اندھیری سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس کی ٹانگوں کے بیچ ہل گئے، اوپر چھوٹی سی چھت تھی سیمنٹ کی منڈیر تھی جن پر بیٹھ کر اسے بہت اچھا لگا نیچے جیسے قدموں تلے وہ گنجان ترین علاقہ بچھا ہوا تھا۔ چیونٹیوں کی طرح بالکل ننھے منے سے وجود باریک باریک گلیوں میں رینگتے پھر رہے تھے اسے اوپر آنے سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ یہ چھت اتنی اونچائی پر ہوگی۔ ہوا اگرچہ سبک رفتار نہیں تھی مگر کبھی کبھار تیز ہو جاتی اور کبھی بالکل غائب نیلگون آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی سیاہیاں تھیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبوتروں کی ڈاریں لمبی اڑانیں بھرتیں اور پھر واپس اپنی چھت پر جاتیں کئی چھتوں پر کبوتروں کے اونچے اونچے جال سے بنے تھے، وہ ارد گرد کے نظاروں میں مگن تھی اور باقی سب آسمان پر اڑتی رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھنے اور کوئی کٹی پتنگ لوٹنے کی فکر میں تھے۔ جگنو اور مینا پیش پیش تھے جبکہ کوکو اس کے ساتھ تھی۔

اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے مہینے بعد اسے اتنی وافر آکسیجن ملی ہے۔

وہ ساری ٹینشنز بھلا کر محفوظ ہو رہی تھی کہ لمحہ بھر میں منظر ہی بدل گیا۔

اس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے آہستگی سے آنکھیں کھولیں، ساری چھت خالی تھی فرش اور منڈیر پر جگہ جگہ خون پڑا تھا وہ کتنی دیر ادھر کھڑی اس بھاگ دوڑ کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

کمرے کے باہر چھوٹے سے برآمدے میں زاہدہ باجی اپنے پیڑھے سے نیچے گری تھیں اور کوکو ساتھ بیٹھی تھی دونوں رو رہی تھیں۔

وہ ڈرتے کانپتے ان تک پہنچی اور چپ چاپ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی، اس کا حوصلہ ہی نہیں ہوا کہ پوچھے جگنو کہاں ہے یا اس کا کیا حال ہے؟

کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہوگئیں تو وہ دیوار کے ساتھ لگی لگی اندر چلی گئی اور چار پائی کے کنارے ٹک گئی۔

مٹیالی روشنی میں جگنو کا مسکراتا معصوم سا چہرہ ابھرا اور ایک دم سے اس کی گردن کٹ کر ایک طرف گر گئی اور خون کی دھاریں...... اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اس نے زور سے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

زاہدہ باجی کی گھٹی گھٹی چیخیں واویلا اور بین کبھی ہلکے ہو جاتے کبھی تیز ہوا کے ارتعاش کے ساتھ سفر کرتے ساری کٹڑی میں گونج رہے تھے، نیچے اوپر ہر طرف موت کے گہرے سناٹے چھائے ہوئے تھے اسے ایک دم سے بہت خوف محسوس ہونے لگا۔

''اے میرے اللہ! اور کیسی میری آزمائش کرے گا ایسی تکلیف وہ زندگی قابل نفرت قابل رحم پھر بھی تجھ سے گلہ نہیں کیا لب سی لیے...... یہ یہ چوٹ...... یہ چوٹ نہ لگاؤ میرے دل پہ......

میرے بچے کو میری بھی عمر لگ جائے...... مجھ گناہ گار کی بھی جسے پیدا کرنے والے کو ڈھنگ سے پکارنا بھی نہیں آتا تو میرے آنسوؤں کی زبان تو سمجھتا ہے میری ممتا کے گلشن میں جو آگ لگی ہے اس کی آنچ تو تیرے آسمان تک آرہی ہے بخش دے، معاف کردے میرا کلیجہ ٹھنڈا رکھیو......'' زاہدہ باجی کی درد بھری آہیں سارے میں چکراتی پھر رہی تھیں۔

رات ساری انہیں دہائیوں، آنسوؤں اور واویلے میں گزر گئی۔

''اماں! بچ گیا ہے جگنو خطرے سے باہر ہے وہ اب ڈاکٹر کہتے ہیں۔''

سلو کی آواز تھی یا جلتے صحرا میں دور تک برستی ٹھنڈی بارش کی بوچھاڑ۔

زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہا اٹھ کر رقص کرے اور وہ بھی ایسا دیوانہ وار کہ اپنی سدھ بدھ نہ رہے۔

اسے اور کچھ نہ سوجھا تو جا کر زاہدہ باجی کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

☆☆☆

اس نے دوسری جاب ایک ڈاکٹر کے کلینک میں بطور ریسپشنسٹ کی تھی۔ جاب بھی اچھی تھی اور پے بھی مناسب تھی۔ شام کے چھ گھنٹے کی جاب اسے امید ہو چکی تھی، وہ اب جلد سٹیل ہو جائے گی اور کہیں مناسب علاقے میں معقول کرائے کا گھر دیکھ لے گی۔ ابھی تیسرا مہینہ بھی اسٹارٹ نہیں ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی دوسرے شہر چلے گئے، اور اس کے نصیب میں پھر خواری آگئی۔

پھر تو خجل خواری کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا اس کے پرس سے آخری نوٹ بھی جانے کب نکل کر خرچ ہو چکا تھا حتیٰ کہ اس کے گلے کی چین بھی بک گئی۔ تیسری جاب سے ایک دن پہلے اس نے ٹاپس بھی بیچ دیے، بطور سیل گرل ایک اچھے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملنے والی جاب اسے قطعاً پسند نہیں تھی مگر پہلے کون سا کام اس نے اپنی پسند سے کیا تھا۔

جگنو کے واقعے نے سب کے دلوں کو سہما دیا تھا، سلو نے پرائیویٹ ٹیوشن پر پانچویں کے امتحان کی تیاری شروع کر دی تھی۔ شام کو کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کر لیتا اکثر ناکام ہی لوٹتا گھر کی تمام تر ذمہ داری ایمن کے کندھوں پر آگئی تھی۔

جگنو اور کوکو تو اس کے دیوانے ہو چکے تھے، اسے ذرا دیر ہو جاتی۔ وہ اسے پھاٹک کے پاس یا سیڑھیوں میں اپنا منتظر پاتی۔ منیا کی طبیعت میں تھوڑی سرکشی، تھوڑا اچھی چیزوں کا لالچ ابھی بھی تھا، پھر اوپر چھت پر جا کر ساتھ والے ناصر کے ساتھ نظر بازی یا رقعوں کا تبادلہ کرنا اس کا من پسند مشغلہ تھا زاہدہ باجی کی ڈانٹ، سوٹی کی مار اس پر کم ہی اثر کرتی تھی۔

جوں جوں اچھی جاب کا حصول مشکل ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس کے اندر کا اضطراب

اور بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔

ڈپارٹمنٹل کی جاب اس نے تیسرے مہینے چھوڑ دی ان کی ٹائمنگ اٹھارہ گھنٹوں تک چلی گئی تھی اور اس کے کسٹمر سے معمولی سے جھگڑے پر انہوں نے اس کی ہاف سیلری بھی کاٹ لی تھی، وہ غصے میں تین چار چیزوں کو ہاتھ مار گر آئی، بولتی بکتی جاب پر لات مار آئی۔

اب اس کے ہاتھ میں صرف شہریار کی پہنائی ہوئی انگوٹھی رہ گئی تھی وہ نہ جانے کیوں اس کو کسی حال میں بیچنا نہیں چاہتی تھی۔

سو ہمت کر کے ایک بار پھر جاب کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ تینوں چاروں جس لگن اور شوق سے اسکول جانے لگے تھے، پڑھائی میں دلچسپی لے رہے تھے اگر وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے تو پھر...... پھر ان کا ذوق وشوق اپنی موت آپ مر سکتا ہے، اور اس کی ذمہ داری یقیناً ایمن پر ہوتی۔

☆☆☆

اس نے تیز چمکتی دھوپ میں آنکھیں چندھیا کر دیکھا اس کے سن گلاسز کب کے ٹوٹ چکے تھے اور نئے لینے کا اب کبھی خیال نہیں آتا تھا۔

''ایما...... ! ایما ڈارلنگ ہاؤ آر یو؟'' کیسی مانوس شناسا سی آواز تھی اس کے قدم بے اختیار ٹھٹکے اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو پل بھر کو ساکت سی رہ گئی۔

''یہ کیا تم نے اپنی حالت بنالی ہے تم ایما ہی ہو نا؟'' گولڈی نے اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد حیرت سے پوچھا۔

وہ سر ہلا کر تائید بھی نہ کر سکی کہ وہ واقعی ایما، ہے وہ تو مامی، بن چکی تھی۔

''کیا بات ہے اتنی کمزور ایسی بے ڈھنگی ڈریسنگ میں ایمان سے، مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو، تمہارا وہ شہری صاحب، کہاں گیا کیا وہ کوئی چیٹ (دھوکے باز) نکلا یا تمہارے ساتھ کوئی ہاتھ کر گیا آج کل ہو کہاں تم؟''

وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارے سوال پر سوال کیے جا رہا تھا اور اسے گاڑی کی ایئرکنڈیشنڈ خوشبو دار فضا بے چین کیے دے رہی تھی۔ بہت کچھ بھولا بسرا دل انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ احساس زیاں...... وہ جنت گم گشتہ کے چھن جانے کا احساس...... کہیں پھر جاگ اٹھا تو...... اس دل بے قرار کو کون سنبھالے گا؟

''تم سناؤ کیسے رہے؟'' اس نے پریشان سوچوں کو جھٹکا۔

''تمہارے سامنے ہوں فائن ایک دم فرسٹ کلاس۔'' لفظوں کی گرچہ ضرورت نہیں تھی وہ دیکھنے میں بھی فرسٹ کلاس تھا۔

''ہم لوگ مڈل ایسٹ ہی شفٹ ہو گئے ہیں سب، ادھر گھر فی الحال رینٹ پر دے دیا۔ پاپا کا خیال تو سیل کرنے کا تھا ماما نے روک دیا عینی شادی کے بعد ادھر رہنے پر راضی نہیں تھی۔ بنٹی بھی حارث کے ساتھ ادھر ہی تھی تو پھر ماما پاپا نے کہا کہ ہم دونوں اکیلے ادھر کیا کریں گے۔ پچھلے ماہ سب چلے گئے میں ضروری کاموں کی وجہ سے پچھلے ہفتے آیا تھا اور آج واپسی ہے دو گھنٹے بعد فلائٹ ہے میری، تم ملیں بھی تو کس وقت۔'' وہ افسوس بھرے انداز میں بولا۔

''کچھ تو بتاؤ۔ کچھ تو کہو؟'' وہ اس کی مسلسل چپ پر بے چین ہو کر بولا۔

''کیا کہوں؟ میرے پاس کہنے کو کچھ ہی نہیں۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''تم نے تو شہریار سے اپنی پسند کی شادی کی تھی سب کچھ جانچ پرکھ کر پھر کیا مسئلہ ہوا؟''

وہ بے چینی سے گلے میں پڑی موٹی سوٹی چیز کو گھماتا ہوا بولا۔

''چھوڑو اس قصے کو تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے دو گھنٹے بعد فلائٹ ہے ظاہر ہے آدھے گھنٹے میں تمہیں ایئرپورٹ نکلنا ہوگا تمہیں دیر نہ ہو جائے میں چلتی ہوں۔'' وہ دروازے کے لاک پر ہاتھ رکھتی نیچے اترنے لگی کہ گولڈی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیسی بے مروت ہو گئی ہو اچھا کچھ نہیں بتانا چاہتی تو نہ سہی کچھ دیر رکو تو سہی، چلو سامنے کیفے میں چل کر کچھ کھاتے ہیں۔'' وہ پہلے سی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا تو اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''اس سے کیا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں مجھے جانے دو۔''

''پلیز ایما! ہم بہت اچھے دوست رہے ہیں۔'' وہ شکایت بھرے لہجے میں بولا۔

''دوست وہی جو مشکل میں کام آئے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیسے اس کے منہ سے پھسل گیا۔

''تم بولو تو سہی۔'' گولڈی گہرا سانس لے کر بولا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''پلیز ایما! اتنا نہیں سوچو اتنا وہاں سوچتے ہیں جہاں محبت، دوستی سے بالکل ہی ایمان اٹھ چکا ہو۔ راکھ تلے ابھی کوئی چنگاری جلتی ہے کرید کر دیکھو۔''

وہ گردن سیٹ سے لگا کر ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا تو اس نے نظریں چرا لیں۔

''ایک فیور کرو گے؟'' وہ لمحہ بھر بعد بولی۔

''ہوں۔''

''مجھے کس...... اگرچہ اس بات کے کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تم جا رہے ہو اور'' وہ

اٹک کر رہ گئی۔

''تم کہہ کر دیکھو۔ میں اگلی فلائٹ سے بھی جا سکتا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''مجھے جاب چاہیے اچھی افورڈ ایبل۔'' اس نے کہہ ہی ڈالا گولڈی سوچ میں پڑ گیا۔

''دیکھو ابھی فوری طور پر تو یہ مشکل ہے کوئی ریزن ایبل جاب اتنی ارجنٹ......''

''میں پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ فضول بات گنوانے کا فائدہ...... اوکے بائے۔'' وہ یکدم دروازہ کھول کر جانے لگی۔

''اچھا سنو تو عارضی طور پر اگر...... چلو میرے ساتھ۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر فیصلہ کن انداز میں کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ شہر کا مشہور ترین اور مہنگا ترین فاسٹ فوڈ کارنر تھا جہاں پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔

''پھر وہی فضولیات تم سے کہا نا مجھے کچھ نہیں کھانا پینا چلو یہاں سے۔'' وہ خفگی سے بولی تو وہ فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔

''تم ذرا ادھر بیٹھو۔ میں بات کر کے آتا ہوں اور معلوم نہیں جاوید صاحب ہیں بھی یا نہیں، اور ہم یہاں کچھ کھانے پینے نہیں آئے۔ سمجھیں۔'' وہ کہہ کر دوسری طرف مڑ گیا۔

''ونڈر فل آؤ کام بن گیا تھینک گاڈ! جاوید صاحب آفس میں موجود تھے آؤ تمہیں ان سے ملوا دوں۔'' وہ پرجوش سا تھوڑی دیر میں واپس آ گیا اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر بولا۔

''اگر یہ انگلش بول سکتی ہیں تو زبردست۔ ہمیں آج کل ایسی ہی ریسپشنٹ کی ضرورت تھی۔ پیکج بھی ہم زبردست دیں گے، پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی، پھر مس ایمن، گوہر صاحب کے توسط سے آئی ہیں تو ہمارے لیے اور بھی ریسپیکٹ ایبل ہیں، آپ کل سے ہمیں جوائن کر سکتی ہیں، ٹائمنگ آپ کو گولڈی نے بتائی ہوگی۔ شام چھ بجے سے لے کر رات کے ایک دو یا کبھی کبھار کسی موقع کی وجہ سے تین چار بھی بج سکتے ہیں۔''

وہ ابتدائی تعارف کے بعد ایک ہی سانس میں بتاتے چلے گئے وہ آرام دہ کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئی، ایک ترچھی نظر گولڈی کے مطمئن مسکراہٹ سے سجے چہرے پر ڈالی۔

''کیوں ایما آر یو ایگری؟'' وہ ذرا سا اس کی طرف رخ کرتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ ذرا دھیمی آواز میں بولا۔

''ویسے جاوید صاحب! ایمن حفیظ میری بیسٹ فرینڈ ہیں بلکہ فیملی ٹرمز پر ہمارے تعلقات ہیں، اس لیے پلیز جو بھی جب بھی کسی قسم کی یہ فیور چاہیں آپ ان کو دیں گے۔ اسپیشلی سیلری زبردست ہونی چاہیے، آپ کے آفر کردہ پیکج سے بھی تھوڑی زیادہ۔''

وہ باہر نکلی تو گولڈی ایک سیکنڈ کہہ کر واپس مڑ گیا، وہ گاڑی کے پاس پہنچی تھی کہ وہ آ گیا۔

''چلو تمہیں جہاں کہو گی، ڈراپ کر دوں گا۔ اپنا سیل نمبر تو دے جاؤ تمہارے سیل پر فون ملا ملا کر میری انگلیاں گھس گئیں۔ معلوم نہیں تم نے اسے غصے میں کدھر پھینکا تھا؟'' وہ بولتا ہوا گاڑی کے لاک کھولنے لگا وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''فی الحال تو میرے پاس کوئی سیل نہیں ہے جیسے ہی لوں گی میں خود تم سے کانٹیکٹ کروں گی۔ تمہارا نمبر وہی ہے نہ پہلے والا۔''

''نمبر تو وہی ہے بلکہ دو تین اور نمبرز بھی۔ ایک بات کہوں اگر تم مائنڈ نہ کرو تو۔'' وہ گاڑی ریورس کرتے ہوئے بولا۔

''ہوں کہو۔ اب برا ماننے والی میری حس ہی مر گئی ہے۔'' وہ لبوں میں بڑبڑائی۔

''یہ میرا اسیل رکھ لو تحفتاً۔'' اس نے اپنا قیمتی موبائل سیٹ کوٹ کی جیب سے نکال کر اس کے سامنے پیش کر دیا۔

ایمن نے ایک لمحے کے لیے اس قیمتی تحفے کی طرف دیکھا اور رخ پھیر لیا۔

''میں لے تو لوں مگر ابھی اسے سنبھال نہیں پاؤں گی تم مائنڈ نہ کرنا سوری۔''

اس نے کچھ ایسے بے لچک انداز میں کہا تو گولڈی نے اپنا ہاتھ واپس کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

''اچھا یہ جاوید صاحب نے ایڈوانس کے طور پر دیے ہیں اور کل کوشش کر کے چھ بجے سے پہلے ہی پہنچ جانا۔'' اس نے ہزار ہزار کے تین نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

''جاوید صاحب نے ایڈوانس تمہیں کیوں دیا مجھے دیتے۔'' اس نے نوٹوں کو ایک سرسری نظر سے دیکھا اور بولی۔

''یار! بھول گئے تھے۔ میں ان کا کارڈ لینے دوبارہ اندر گیا تو انہیں یاد آیا تو مجھے دے دیے۔ کہو تو واپس چلتے ہیں۔ تم خود ان سے تصدیق کر کے لے لینا نہ جانے کن لوگوں کی کمپنی میں رہ رہی ہو کس قدر شکی ہو گئی ہو۔''

وہ آخر میں چڑے ہوئے انداز میں بولا۔ اس نے پھر بھی نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''لے بھی لو۔ اب کیا اکٹھے دنیا سے روانہ ہونے کا پروگرام ہے۔ کل جا کر خود جاوید صاحب سے پوچھ لینا۔ انہوں نے انکار کر دیا تو یہ نوٹ کسی مسجد کے چندے میں ڈال دینا یا کسی فقیر کو دے دینا۔ اب تو پکڑ لو۔'' اس نے جھنجلا کر کہتے ہوئے نوٹ اس کی گود میں گرا دیے۔

"ایما! مجھے نہیں پتا۔ تم یہ جاب کیوں کر رہی ہو؟ بہر حال تم اس دوران اور میں بھی تمہارے لیے کوئی بہترین آپشن ذہن میں رکھوں گا، تم خود بھی ٹرائی کرتی رہنا اور میں تمہارے لیے یہاں سے کچھ زیادہ خوشگوار فیلنگو لے کر نہیں جا رہا اپنا خیال رکھنا اور پلیز جس بھی گھڑی تمہیں میری ضرورت ہو۔ بلا جھجک رابطہ کر لینا۔ میں اپنے دونوں پرانے نمبرز چوبیس گھنٹے آن رکھا کروں گا، نہیں معلوم کس لمحے میری اچھی ایمان کو مجھے پکارنا پڑ جائے۔ اوکے ٹیک کیئر بائے۔"

اس نے ایمن کا نرمی سے پکڑا ہاتھ آہستگی سے چھوڑ دیا تو وہ نم آنکھیں لیے تیزی سے مڑ گئی۔

گولڈی اسے لوگوں کے بے ہنگم رش میں گم ہو جانے تک دیکھتا رہا۔

☆☆☆

گولڈی اسے جاتے جاتے بہت بیش قیمت تحفہ دے گیا تھا ان حالات میں اس سے اچھا تحفہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اگرچہ ریسپشن پر کھڑے ہونے کی جاب اس کی خود دار، غیرت مندانہ طبیعت پر بڑی گراں گزرتی مگر ایک تو اس فوڈ کارنر کی ریپوٹیشن بہت زبردست تھی۔

مگر اس کے باوجود وہ فی الحال کوئی اور جاب نہیں کرنا چاہتی تھی کہ یہاں سیلری پیکیج بہت اچھا تھا، صرف دو تین مہینوں میں ان کنوئیں نما تاریک کمروں کی قسمت بدل گئی تھی۔ اس منحوس مسہری کی جگہ اس نے سیکنڈ ہینڈ اچھا بیڈ خرید لیا تھا کہ آدھی رات کے بعد گھر پہنچنے پر اسے آرام دہ بستر کی شدید طلب ہوتی تھی اور ایک اسمال سائز کا فرج نیا پنکھا بلکہ اس نے بیرونی کمرے میں بھی پنکھا لگوا دیا تھا، چاروں بچے اب کافی خوش تھے۔

تھوڑے ماں کے فرمانبردار بھی ہو گئے تھے یا شاید صرف پڑھنے کے سبب ان کی مزدوری اور لفافے بنانے کی مشقت سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔

آج پھر اس کی جاب کا ٹف ڈے تھا۔ تقریباً تیرہ لڑکیاں اس کو شامل کر کے اس برانچ میں کام کرتی تھیں اور ان میں سے چار لڑکیاں بالکل اچانک بغیر اطلاع کے چھٹی پر تھیں، جو جاوید صاحب کے نزدیک سب سے سنگین جرم تھا، اور نتیجے کے طور پر اسے آج ہال میں رہ کر بھی کام کرنا تھا اور ریسپشن کو بھی دیکھنا تھا۔

شمالی دیوار کے ساتھ والا ٹیبل اس کی ساری شگفتگی کو مات کیے دے رہا تھا اور وہ اب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان چاروں غیر حاضر لڑکیوں کو کوس رہی تھی۔

وہ کوئی ٹھیک ٹھاک آسامی تھا اس کا اندازہ تو اس نے ریسپشن کے سامنے کھلے دروازے سے نظر آتی۔ اس کی جہازی سائز کی گاڑی اور اس کی قیمتی پوشاک بیش قیمت برانڈڈ جوتے موبائل اور گھڑی سے بھی لگا لیا تھا مگر پھر جس طرح اسے ویلکم کہنے جاوید صاحب خود اپنے آفس سے اٹھ کر آئے تھے اور کیسے اس کے قدموں میں بچھے جا رہے تھے جیسے بچھ ہی جائیں گے۔

وہ ان کے اتنے چاپلوسانہ انداز کو دیکھ کر وہیں جل بھن سی گئی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا ......اس نے بیٹھتے ہی کافی کا آرڈر دیا تھا۔

یہاں اس ریسٹورنٹ میں جو "شرفاء" بھی آتے تھے وہ اپنے گھریا ماحول میں جیسے بھی ہوتے تھے ادھر بہر حال "شریف" ہی شو کرتے تھے اور یہ شخص کھلم کھلا "پی" رہا تھا۔

"بھلا کیا جاوید صاحب نے دیکھا نہیں ہوگا، اسے یہ شغل فرماتے۔" وہ دل میں کڑھی۔

"ہوں ونڈر فل! نیو انٹری لگتی ہے۔" وہ گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے نیم مخمور لہجے میں ایمن پر نگاہیں جمائے کہہ رہا تھا۔

"آپ نے کس لیے بلایا ہے سر؟" اس کے چہرے کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہوئی تھی اور اس کی جگہ ایک سرد پتھریلے سے رویے نے لے لی تھی۔

"مینیو کارڈ ابھی تک آپ کی نااہل ویٹرس دے کر نہیں گئی۔" وہ ذرا غصے سے بولا۔

"کارڈ تو آپ کے سامنے پڑے ہیں سر!" اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر کارڈ اس کی طرف سرکایا۔

اس نے کارڈ لینے کے لیے اس کے ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی تھی ایمن نے سرعت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے اب اس مشق میں خاصی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔

"اوکے۔ آرڈر لکھیں۔" اس نے کارڈ نظروں کے سامنے لہرایا۔

پھر مینیو کارڈ سے کوئی ایک آئٹم بھی نہیں چھوڑا کھڑے کھڑے لکھتے اس کے ہاتھ اور ٹانگیں تھک گئیں۔

"آپ نے یونہی زحمت کی سر! آپ فرما دیتے کہ پورا مینیو کارڈ ہی اٹھا لائیں۔ آپ کا بھی وقت بچتا اور ہمارا بھی۔" وہ طنزیہ انداز میں دھیرے سے کہہ کر آرڈر لے کر چلی آئی۔

"اف! یہ پاگل آج پھر آ گیا ہے۔" ہیڈ شیف سردار مجیب اپنا سر پکڑ کر رہ گئے۔

"کیا یہ پہلے بھی آتا رہا ہے ادھر؟" اس نے تھوڑا متجسس ہو کر پوچھا۔

"آرڈر کس نے لکھا ہے؟" وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے بولے۔

"میں نے۔ وہ دکھتے ہاتھ کو دباتے ہوئے بولی تو سردار صاحب اسے عجیب سی نظروں

سے دیکھتے ہوئے چپ کر گئے۔

"کون ہے، سردار صاحب یہ؟" اسے یونہی کریدسی ہوئی یا وہ ہال میں جانے سے بچنے کے لیے کچھ ٹائم ادھر صرف کرنے کے خیال سے بولی۔

"ہے کسی وزیر کا لاڈلا چہیتا۔ سرپھرا بھائی۔"

وہ اب دوسرے ہیلپر شوفر کو بلا رہے تھے۔

وہ کچھ دیر یونہی ادھر کھڑی رہی پھر کندھے اچکا کر باہر آ گئی۔

باہر رش بڑھتا جا رہا تھا۔

پر اسے لگ رہا تھا اس کی ڈیوٹی مستقل اسی ٹیبل پر لگ گئی ہے۔

جاوید صاحب نے اپنے آفس میں بلوا کر کہا۔

"ایمن! یہ ہمارے سب سے خاص کسٹمر ہیں ایک شام میں اتنا ہمیں دے جاتے ہیں۔ جتنا ہم مہینہ بھر میں ارن کرتے ہیں پلیز ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں ہونی چاہیے اور ہماری مجبوری۔ پلیز چند گھنٹے برداشت کر لیں بلکہ آپ کا اگر کل دل چاہے تو بغیر اطلاع کے چھٹی مار لیں۔ میں آپ کو خود اجازت دیتا ہوں۔"

اور اسے ان کی اس فراخدلانہ آفر پر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی نہ جانے کیوں اس کا دل عجیب بھاری انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے جیسے کچھ بہت انہونا ہونے جا رہا ہے۔

"کیا بات ہے ڈیئر! ہم سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے یا کوئی نادانی جو آپ ایسے ہم سے خفا روٹھی سی پھر رہی ہیں، جیسے کوئی چہیتی محبوبہ اپنے عاشق سے منہ پھلا کر سینہ......"

وہ کیسی بے ہودہ زبان استعمال کر رہا تھا۔

"لگتا ہے آج اس جاب کا بھی سمجھو اینڈ ہو گیا، ہاں اتنے ماہ اچھے جو گزر گئے۔"

"شام کدھر گزارتی ہو جانِ من؟" اس نے پاس سے گزرتے بے تکلفی سے اس کی کلائی پکڑ ہی لی۔

"پلیز کنٹرول یور سیلف۔" اس نے صبر کی آخری حد کو چھوتے ہوئے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑائی۔

"بلے بھئی بلے اتنا غصہ۔ ہم نے برا نہیں مانا ہو تو خفا اس وقت یہ "ٹیم" تمہارا ہے، ابھی ہمارا "ٹیم" بھی آنے والا ہے میری جان پھر ہمارا غضب بھی دیکھو گی۔ ہولو ناراض۔" وہ سر اِدھر سے اُدھر ہلاتے جھلاتے "بوتل" کو ہی منہ لگا کر پینے لگا، اس کے دونوں ساتھی کھی کھی کر کے ہنستے ہوئے اسے غلیظ نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ غصے میں پیر پٹختی وہاں سے چلی آئی۔ "آج کچھ ہو کر رہے گا۔" اسے یقین ہو گیا۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کی نظریں انٹرس ڈور پر پڑیں اور جیسے پتھرا کر رہ گئیں۔ وقت ایک لمحے میں ڈھل کر ساکت رہ گیا۔

☆☆☆

شہریار ایک الٹرا ماڈرن اسمارٹ لڑکی ایسی کہ جس کے وجود سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی کہ کندھے کے گرد بازو حمائل کیے بڑی ترنگ میں اندر داخل ہوا تھا۔

ان دونوں کی نظریں خالی ٹیبل تلاش کر رہی تھیں۔

وہ ان سے چند قدموں کے فاصلے پر ساکت کھڑی تھی۔ وہ دونوں ایک خالی ٹیبل سنبھال چکے تھے اور اب باتوں میں مگن تھے۔

"تمہیں لطافت صاحب بلا رہے۔ تین بار کال کر چکے ہیں۔" پاس سے گزرتی صائمہ نے اسے ہولے سے ہلا کر کہا۔

ہما ان دونوں کا آرڈر نوٹ کر رہی تھی اور بابر ٹیبل سیٹ کر رہا تھا اس نے دھندلائی نگاہوں سے اس منظر میں لوٹ آنے کی کوشش کی۔

"ہائے!" وہ قدم اٹھانے کی سعی کر رہی تھی، جب شہریار کے ساتھ بیٹھی اس کی رفیقہ کسی لہر کی اٹھی تھی اس عیاش طبع لطافت سے باقاعدہ معانقہ کرتے ہوئے گلے بھی ملی تھی۔ دونوں میں جانے کیا باتیں ہونے لگیں جیسے دونوں مدتوں کے جاننے والے ہوں۔ اس لڑکی نے پلٹ کر شہریار کو بلایا اور وہ جو اِدھر اُدھر نظریں دوڑا! کر شاید ٹائم پاس کر رہا تھا۔ اٹھا اور اٹھتے اٹھتے آدھے قدے بیٹھا رہ گیا۔

اس کی نظریں ایمن کے چہرے سے ٹکرائی تھیں، جو کسی پتھر کے بت کی مانند کھڑی اسی پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔

"کم آن شہری ڈیئر!" اس کی دوست نے پھر پکارا تو وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اس کی طرف بڑھ گیا۔

ایک دو منٹ بعد وہ دونوں واپس اپنی ٹیبل پر آ چکے تھے۔

"مس! ہمارا آرڈر کب آئے گا۔ ہم کیا یہاں بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو جائیں گے۔ کچھ ارادہ ہے بھی یا ہمیں بھوکا مارنے کا پروگرام ہے؟" وہ یوں بے تکلفی سے ایمن سے گویا ہوا، جیسے دونوں میں بڑی دوستی رہ چکی ہے اور "بھوک" جیسی اس کی نظروں سے چھلک رہی تھی، پیٹ کی بھوک اس کے مقابلے میں شاید تھی بھی نہیں۔

"میں پتا کرتی ہوں۔" کہہ کر وہ پلٹ آئی۔

ان دونوں میں کوئی بحث زور وشور سے جاری تھی، وہ کچن کی طرف جانے کے بجائے وہیں چند قدموں پر کھڑی ہوگئی۔ اس کا ارادہ ان کی گفتگو سننے یا ان کے تعلق کی نوعیت جاننے کا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے اندر اس ہمت کو جمع کر رہی تھی، جس سے وہ اس بے وفا کا گریبان پکڑ کر اپنا جرم پوچھ سکے۔

"نوکری بھی جاسکتی تھی اور شہریار اگر بپھر گیا تو شاید یہ کچے دھاگے کا رشتہ بھی۔"

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔

ادھر سے وہ منحوس لطافت لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر اس کی طرف آ رہا تھا۔

"شہریار......شہریار......!" وہ دونوں مین انٹرنس ڈور کھول کر باہر نکل چکے تھے، جب اسے ہوش آیا وہ دیوانہ وار باہر کی طرف لپکی تھی۔

"شہریار......!" وہ تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتی اتری اور آخری قدم پر اس کا پاؤں اتنی زور سے دوہرا ہوا کہ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی گر گئی اور جب تک خود کو سنبھال کر اٹھی ان کی دور جاتی گاڑی کی ٹیل لائٹس جلتی ہوئی دور جا چکی تھیں۔

"شہریار......! آئی ہیٹ یو......" وہ بے بسی سے وہیں کھڑے ہو کر چلائی۔

رات کے شاید بارہ بج چکے تھے لوگوں کی واپسی شروع ہو چکی تھی۔

اس کے اردگرد پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں کے دروازے کھل اور بند ہو رہے تھے، بے فکرے لوگوں کی ہنسی دبے دبے قہقہے سرگوشیاں باتیں اسے راستے کے بیچ کھڑے ہونے کا احساس دلا دیتے تھے۔

وہ تھکی نڈھال سی واپس مڑ گئی۔

جاوید صاحب اپنی نگرانی میں لطافت صاحب کے ٹیبل پر سرونگ لگوا رہے تھے، وہ نڈھال سی اپنے ڈائس کے پیچھے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ایمن! تمہیں لطافت صاحب اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔" جاوید صاحب کا پی اے اس سے آ کر کہنے لگا۔

"واٹ!" اسے کرنٹ لگا تھا۔

"وہ انتظار کر رہے ہیں۔" وہ اس کے شاک سے بے نیاز ہو کر دوبارہ بولا۔

"شٹ اَپ ان سے کہو جہنم میں جاؤ میں کیوں ان کے ساتھ کھانا کھانے لگی اور پلیز۔ تم جاوید صاحب سے پرمیشن لے دو، میں گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے کہتے ہوئے اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ نوید کندھے اچکا کر چلا گیا۔

اگلے ہی لمحے جاوید صاحب اس کے سر پر موجود تھے۔

"یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ وہ ناراض ہو جائیں گے، وہ منتظر بیٹھے ہیں یونہی ان کا دل رکھنے کو تھوڑا بہت لے لو پلیز۔" وہ حواس باختہ سے کہہ رہے تھے۔

"سر! مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے اور شاید آپ بھول رہے ہیں۔ آپ مجھے بہرحال مجبور نہیں کر سکتے۔"

اس نے بدستور چیزیں موبائل ہیر برش لپ اسٹک اٹھا اٹھا کر پرس میں ڈالتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"یقیناً میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا مگر تم سے ریکویسٹ تو کر سکتا ہوں۔ پلیز پلیز ہماری ریپوٹیشن کا مسئلہ ہے۔" وہ التجاؤں پر اتر آئے ایمن کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"واٹ یو مین ریپوٹیشن؟" وہ بغیر لحاظ کے چلائی "آپ کو اپنی اس دکان کی ریپوٹیشن کا اتنا خیال ہے اور میری عزت کا آپ کو ذرا بھی خیال نہیں۔ جائیے کہہ دیجیے اپنے ان عزت مآب کسٹمرز سے کہ میں ان کے باپ کی زرخرید ملازمہ نہیں کہ ان کے حکم پر سر کے بل چلی آؤں۔ انیف از انیف۔ میں جا رہی ہوں۔"

اس کے منہ سے مارے غصے کے کف نکلنے لگا تھا۔

"او کے ناراض مت ہو تم رکو۔ ابھی میں ان سے جا کر معذرت کر لیتا ہوں، ابھی ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا اور ہما ابھی فارغ ہوتی ہیں تو تم ان کے ساتھ ہی چلی جانا۔ اتنی رات کو کوئی بھی کنوینس مشکل سے ملے گی۔" یہ شاید ان کی بزنس مینجمنٹ کا حصہ تھا کہ انہوں نے ایک دم سے پینترا بدلا تھا اور چلے گئے تھے۔

ان کی بات بھی درست تھی۔ اتنی رات کو کنوینس ملنا واقعی مشکل تھا اور اسے یوں بھڑکنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ چند گھنٹے تھے عذاب کے سو گزر گئے۔

وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بیٹھ گئی۔

دل اندر سے ڈر رہا تھا۔ وہ عیاش انسان اس کا انکار سن کر بپھر جائے گا اور ابھی ہنگامہ کر ڈالے گا، مگر کافی دیر خاموشی سے گزر گئی کچھ بھی نہیں ہوا۔

وہ تینوں بڑی رغبت اور مگن انداز سے کھانا کھانے میں جتے ہوئے تھے گویا اس کے انکار سے ان کی مردانگی، قطعاً ہرٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

سارے ہال اور کیبنز آہستہ آہستہ خالی ہوتے چلے گئے۔

وہ تینوں کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب یاسر اور نوید ہی برتنوں کا انبار اٹھا رہے تھے۔

"ہیں یہ ندا اور ہما کہاں گئیں؟" کافی دیر بعد اسے ان کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

"ڈیڑھ بج گیا۔" دوسرا جھٹکا اس سے بھی شدید تھا۔

"او مائی گاڈ!" وہ بے چین ہو کر باہر نکل آئی۔

"خاں صاحب تو ہما اور ندا کو چھوڑنے گئے ہیں باہر تو کوئی بھی نہیں۔ تمہیں ان کا ویٹ کرنا ہوگا۔" یہ اطلاع تھی یا تازیانہ خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

لطافت صاحب بیل پر ہاتھ رکھ کر شاید بھول گئے اور ہال میں اس کے سوا کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

یاسر اور نوید بھی یک دم ہی غائب ہو گئے تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سوچی سمجھی کوئی پلاننگ؟" وہ دھڑکتے دل پر قابو پاتی بظاہر بہادر بنتی بلی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

"یس سر!" اس نے کمپوز لہجے میں ان سے جا کر کہا تو وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا، اسی وقت جاوید صاحب آ گئے۔

لطافت صاحب نے ہزار ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر خالی ٹیبل کے بیچ رکھ دیں۔

"چلیں پھر......؟" وہ اپنے یاروں کی طرف دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا اور وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔

"جاوید صاحب اپنی اس نئی تتلی سے کہیے چل کر خود ہی شرافت سے ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائے، ورنہ اس کا وزن اتنا زیادہ نہیں کہ میرے دونوں شیر مل کر بھی نہ اٹھا سکیں۔" وہ کیا کہہ رہا تھا ایمن بھونچکی سی رہ گئی۔

"سر پلیز اصل میں یہ ابھی نئی ہیں پھر یہ ذرا اور طرح کی۔ میرا مطلب ہے۔" جاوید صاحب اس کا لٹھے کی طرح سفید پڑتا رنگ دیکھ کر ہکلا کر بولے۔

"اور طرح کی کیا مطلب...... آپ مزید مال بنانے کے چکر میں ہیں۔ او کے یہ لیجیے ہم اسے فراخ دل آپ کی اس دکان پر [illegible] تے ہوں گے کیا یاد کریں گے۔"

اس نے ایک اور گڈی نکال کر میز پر ڈال دی۔ جاوید صاحب نے پھٹی پھٹی نظروں سے ان نوٹوں کی طرف دیکھا اور خشک لبوں پر زبان پھیرا کر انہیں تر کرنے کی کوشش کی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اصل میں یہ میرے بہت اچھے جاننے والے ہیں ان کے توسط سے۔ پلیز آپ کسی اور کو جسے آپ کہیں مگر ایمن نہیں۔"

جاوید صاحب نے مزاحمتی انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ لطافت صاحب کے چہرے پر خوف ناک تیور نمودار ہو گئے تھے۔

"لگتا ہے آپ کا اب اس ڈھابے کو ٹھپ کرنے کا ارادہ ہے۔" اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ جاوید صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور دوسرا گیا۔

اس نے ایک آخری امید بھری نظر جاوید صاحب کے کانپتے لرزتے وجود پر ڈالی اور فیصلہ کن انداز میں اپنے پیروں کو جوتوں میں مضبوطی سے جمائے۔

پھر اس نے سوچنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا اور دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے تک گئی وہ جو دھمکیوں اور گالی گلوچ میں مگن تھے اور ان کو ایمن سے اس "جرأت" کی توقع بھی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کو کچھ سمجھ ہی نہیں سکے اور جب تک سمجھے، وہ ریسٹورنٹ کی پارکنگ سے بھی باہر نکل چکی تھی۔

"پکڑو اسے جانے نہ پائے آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لطافت کے پنجوں سے شکار اڑان بھر جائے نکلو۔" وہ تینوں آگے پیچھے بھاگے تھے۔

"تم جلدی سے لائٹیں آف کر کے کلوزنگ کرو۔ ہری اپ۔" جاوید صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے پچھلے دروازوں سے نکلتے نوید، یاسر اور دوسرے ملازمین سے کہا۔

ذرا سی دیر میں روشنیوں سے جگر جگر کرتا وہ شاندار ہوٹل عمیق اندھیروں میں ڈوب چکا تھا۔

وہ تینوں اپنی پراڈو میں اس کی تلاش میں نکلے تھے، اور اس کے قدموں کو کون سے پہیے لگے تھے جو منٹوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔

وہ ابھی ٹیکسی میں بیٹھی ہی تھی کہ اسے دور سے ان کی دیوہیکل گاڑی کسی موت کے فرشتے کی طرح آتی دکھائی دی۔

"بابا تیز چلایئے پلیز...... جلدی۔" اس نے ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور سے آگے کو جھکتے پیچھے مڑ کر دیکھتے بے چینی و بے قراری سے کہا۔

گھاگ ڈرائیور پل بھر میں سچوئیشن سمجھ چکا تھا۔

اس نے ایک گہری نظر ایمن کے چہرے اور لباس پر ڈالی اور گہرا سانس لیتے ہوئے ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

مگر اس کی ٹیکسی بہرحال اس شاندار برق رفتار گاڑی سے کسی بھی طور آگے نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کا اندازہ اسے اگلے ہی پل ہو گیا۔

"بیٹی انہیں میں کسی بھی طرح ہرا نہیں سکتا۔ ان کے پاس مجھ سے بہتر گاڑی ہے۔ تم یوں کرو......" فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے ایک دم سے اندھیری سڑک پر گاڑی موڑ لی۔

''یہاں کسی بھی گیٹ کو پھلانگ کر کسی گھر میں گھس جاؤ نکل جاؤ۔'' اس نے تیز رفتاری گاڑی ذرا ہلکی کی اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔

ایمن نے بھی سوچنے میں ایک پل نہیں لگایا، جس گھر کے آگے وہ اتری۔ اس کی باؤنڈری وال بھی تو کافی اونچی تھی مگر امید تھی، وہ اسے پھلانگ سکتی ہے۔

دوسرے جمپ میں وہ بمشکل دیوار کو ایک ہاتھ سے تھام سکی تھی اور جب ان کی گاڑی موڑ کاٹ کر ادھر پہنچی۔ اس نے دیوار کے دوسری طرف بنا دیکھے چھلانگ لگا دی، اور اپنے منہ سے نکلتی بے اختیار چیخوں کو اس نے دونوں ہاتھوں سے دبایا تھا۔

وہ کانٹوں بھری پھولوں کی باڑ میں گری تھی اور ان گنت کانٹے اس کی نرم و نازک جلد میں اندر تک کھب گئے تھے اور پیٹھ کے نیچے لگنے والے پتھر کی ضرب اسے لمحہ بھر کر تو ہوش سے غافل کر گئی تھی۔

اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

ان کی گاڑی کے دروازے عین اسی باؤنڈری وال کے آگے تڑاخ تڑاخ کھلے تھے۔

''پکڑو اس کو۔ ہم سے متھا لگاتا ہے بول کدھر نکلا اپنی ماں کی سگی کو بولو۔'' وہ ٹیکسی ڈرائیور شاید ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

اس کا جواب سنے بغیر وہ اندھا دھند اسے پیٹنے لگا تھا۔

''دیکھو تو مفت میں مارا جائے گا، اسے تو ہم ابھی یہاں سے دو چار دیواریں گرا کر ڈھونڈ نکالیں گے، چاہے کسی بھی پاتال میں چھپی ہو اپنی پسند کو ہم یونہی نہیں جانے دیا کرتے۔ تیری جان بے کار میں جائے گی تو ہمیں بتا دے گا تو زندہ رہے گا۔''

''بول زندگی چاہیے کہ موت ...... بول صرف تین گنوں گا میں۔ اس سے آگے تو مجھے گنتی بھی نہیں آتی ایک ......دو......تین......'' اس نے شاید پستول تان لی تھی۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' اس نے جس طرح کہا ایمن کو لگا اب اس کا بچنا ناممکن ہے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔

دور دور تک کھلا میدان تھا، رہائشی عمارت تو گھپ اندھیرے میں کسی تاریک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی اردگرد دو تین درختوں کے سوا اور کوئی آڑ بھی نہیں تھی۔

''ارے، یہ تو وحید الزماں کی کوٹھی ہے۔ گڈ...... دیواریں گرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اوے الیاس گھنٹی بجا وہ چوزی ادھر ہی ہے ابھی بل سے نکلے گی دیکھنا۔'' تو ڈرائیور نے

اشارہ کر دیا تھا۔

اسی وقت تیز ڈور بیل کی آواز تاریک سناٹے میں دور تک گونجتی چلی گئی اور اس کا دل...... جیسے بند ہونے لگا۔

''اوہ سر جی رات کے دو بجے کون نامراد دروازہ کھولنے آئے گا۔ حکم کرو۔ چھلانگ مار کر ابھی شکار بغل میں داب کے لے آتا ہوں۔'' الیاس کی کھردری آواز میں اس کے چہرے جیسی سختی اور سفاکی تھی۔

''ٹھیک ہے یہی کرو۔ گھنٹیاں بجانے کا وقت نہیں ہے۔''

اس کے منہ سے نکلا اور ایمن نے زور سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے لبوں سے پوری شدت سے نکلا۔ ''اللہ مدد......اللہ مدد......''

☆☆☆

''آخر وہاں کیا تکلیف تھی، تمہیں معلوم ہے وہ ہارٹ فیورٹ فوڈ کارنر ہے پھر بھی تم مجھے زبردستی وہاں سے اٹھا لائے۔ اب بالکل موڈ نہیں ہے میرا کچھ بھی کھانے کا، بس چلو اب واپس۔''

رباب کا موڈ سخت آف تھا ریسٹورنٹ سے بلاوجہ اٹھ آنے سے۔

''اوکے سوری بابا! آئندہ ایسی جرأت نہیں کروں گا، اب بولو کدھر جانا ہے۔'' وہ فوراً معذرت کرتے ہوئے بولا تو اس نے غصے میں منہ پھیر لیا۔

''بولو بھی یار! اب ایسی بھی کیا خفگی۔ اصل میں آفس کے دو تین کولیگز وہاں تھے خوامخواہ اٹھ کر آ جاتے۔ کرید میں الٹے الٹے سوال کرتے اور پھر آفس میں الٹی سیدھی افواہیں آئی ہیٹ آل دس۔'' اس نے رباب کو منانے کی خاطر جھوٹ گھڑا۔

''اتنا شرمندہ ہو تم مجھ سے تعلق رکھنے پر کہ آفس کے لوگوں کے سامنے مجھے متعارف نہیں کرا سکتے۔'' اس نے جھگڑے کا نیا نکتہ نکال لیا۔

''افوہ یہ کب کہا میں نے۔'' وہ جھلا کر بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ یہ گھٹیا لوگ مجھ سے میری اتنی شان دار دوست سے جیلس ہوں۔ سوری یار! میں اس معاملے یعنی تمہارے معاملے میں تھوڑا پوزیسو ہو گیا ہوں۔ ڈرتا رہتا ہوں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔'' اس نے ذرا محبت سے رباب کی ٹھوڑی چھو کر ذرا خوشامدی انداز میں کہا۔

''اتنی تنگ نظری مجھے تو پسند نہیں۔ محض لوگوں کی نظر لگ جانے کے ڈر سے تم میرے ساتھ کسی کے سامنے نہ آؤ۔ آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ یور سائیکی۔'' وہ فوراً بے لحاظ لہجے میں بولی۔

''ڈارلنگ! کیا آج کی شام ان ہی جلی کٹی باتوں میں ضائع کرنی ہے اب گاڑی کہیں

روک بھی لو کچھ کھائیں زبردست بھوک لگی ہے۔'' شہریار نے اس کا دھیان دوسری طرف لگانا چاہا۔

''اب میرا موڈ نہیں کھانے کا۔ تمہیں بھوک لگی ہے تو جہاں کہو ڈراپ کر جاتی ہوں، یقیناً تم کسی تھرڈ ٹائپ بی کلاس ریسٹورنٹ کے آگے اترنا پسند کرو گے۔ بولو کہاں ڈراپ کروں؟'' وہ طنز بھرے لہجے میں بولی تو شہریار چپ ہو گیا۔

اصل میں تو اس کے دھیان کی سوئی ایمن کی طرف اٹکی تھی اسے اتنے دنوں بعد اپنے سامنے دیکھ کر دل نہ جانے کیسے بے چین سا ہوا تھا۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر رباب سے نوک جھونک کے دوران بھی اسی کا تصور اس کے دماغ کی اسکرین پر بار بار ابھرے جا رہا تھا۔

اور اب اس کے چپ ہوتے ہی وہ چھم سے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کی نفی کرتے ہوئے اسے جھٹلانے کی کوشش میں اور بھی سوچے جا رہا تھا۔ کچھ کھو گیا۔ کچھ پیچھے رہ گیا۔

''اب چپ کیوں لگ گئی؟ کہو کہاں اتار دوں؟'' اس کی چپ کو خفگی پر محمول کرتے ہوئے بولی۔

''کہیں بھی اتار دو جہاں تمہارا دل کرے۔'' وہ پژمردہ سے لہجے میں بولا۔

''اب خواہ مخواہ منہ پھلا لیا ہے۔ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے چلو یہ سامنے ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ صرف تمہاری خاطر جا رہی ہوں تم نے جانے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے، بے بس سی ہو جاتی ہوں۔'' اس نے کہتے ہوئے گاڑی ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کی۔

''جادو تو تم نے مجھ پر کر دیا ہے کہ دن رات صبح و شام تمہارے خیال کے علاوہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔'' ٹیبل پر بیٹھتے ہی شہریار نے ہولے سے کہا اور ایمن کی پریشان کرتی شبیہ کو سر جھٹک کر نظروں سے ہٹایا۔

''آگ ہے دونوں طرف برابر لگی ہوئی۔'' رباب مینیو کارڈ دیکھتے ہوئے گنگنائی۔

''آخر ہم کب تک یوں ملتے رہیں گے۔ کبھی ہوٹلوں میں کبھی گیسٹ رومز میں اور کبھی تمہارے چاچو کے فارم ہاؤس میں، آخر تم کیوں اپنے پیرنٹس کو نہیں بلوا رہی ہو، جبکہ پچھلی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے مل کر دونوں کے تعلق کو اپروو بھی کر دیا ہے انگیج منٹ کی رنگ میری بے چینی کو اور بڑھا رہی ہے پلیز اب ان سے فائنل بات کرو نا!'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

اس شام جب رباب نے اس سے انگیجڈ یا میرڈ ہونے کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس لمحے کی شبیہ نے اسے کتنا بری طرح سے ڈسٹرب کیا تھا مگر وہ پھر بھی مکر گیا تھا کہ ایسے کسی بھی رشتے سے وہ منسلک نہیں، یوں دو ہفتے بعد رباب کے پیرنٹس آئے تھے پاکستان اور ان سے مل کر اسے اپنے سارے ٹوٹے خواب جڑتے نظر آئے تھے۔ انہوں نے بھی اسے دل سے پسند کر لیا تھا اور

صرف گھر کے لوگوں کی موجودگی میں دونوں نے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنا دی تھیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں آئے تھے۔ صرف رباب ہر مہینے اس مہینے کے اختتام پر ان کے آنے کا ''لارا'' دیے جا رہی تھی۔

آفس میں اس کا ٹریننگ کورس اسٹارٹ ہونے کی افواہیں گردش کر رہی تھیں، جس کے لیے چھ ایمپلائز کا گروپ ماسکو بھیجا جا رہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ اگر وہ ٹریننگ پر چلا گیا تو رباب اسے یا تو بھلا دے گی یا......

وہ جاب سے ریزائن دینا چاہتا تھا، کیونکہ رباب نے اور اس کے والدین نے اشارتاً اسے پہلی ملاقات میں سمجھا دیا تھا کہ ان کا سارا بزنس رباب اور اس کے ہونے والے لائف پارٹنر نے سنبھالنا ہے تو وہ کیوں فضول میں ماسکو جانے کا کھڑاگ سر پر لے۔ مگر رباب کا رویہ اس معاملے میں ابھی تک بے نیازانہ سا تھا، وہ ہر بار اس کے کہنے پر ہنس کر ٹال جاتی۔

اور آج ایمن کو دیکھنے کے بعد یہ بے چینی اس کے اندر نئے سرے سے جاگ اٹھی تھی۔

''اگر ایمن کسی بھی طرح اسے تلاشتی آ جائے یا ان کا دوبارہ کہیں آمنا سامنا ہو جائے اور وہ سارا کچھ اگل دے تو رباب جس قدر بگڑی ہوئی امیر زادی ہے اس کے جھوٹ کا پول کھلنے پر اس کا جو بھی حشر کرتی کم تھا، اس سے کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا اور اب یہ دھڑکا اس کو لگا تھا۔

ایمن کا یوں سر راہ ٹکرانا خطرے کی گھنٹی تھا اگر وہ اس کے سامنے آ کر کچھ بول پڑتی تو وہ کیسے معاملے کو سنبھالتا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا اب اس معاملے میں اور دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کھانا ختم کرتے ہی اس نے رباب سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''روبی ڈارلنگ! آج اس معاملے پر مجھے فائنلی بتا دو کہ تم اس انگیج منٹ کو اور کتنا عرصہ یونہی خلا میں لٹکائے رکھنا چاہتی ہو؟'' اس نے سنجیدہ لہجے میں اس کے خوب صورت چہرے اور نیم عریاں سراپے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا خیال ہے، میں اسے لٹکا رہی ہوں۔'' وہ الٹا پوچھنے لگی۔

''پلیز بحث نہیں۔ جو تمہارا ارادہ، خیال ہے۔ آج مجھے کلیئر بتا دو۔'' اس نے قدرے عاجزی سے کہا۔

''بے اعتبارے ہو رہے ہو۔'' وہ اس کے انداز سے محفوظ ہوتے ہوئے بولی۔ شہریار کو تھوڑا ناگوار گزرا۔

''ہرگز نہیں۔''

''پھر جلدی کس بات کی ہے یار! یہ انگیج منٹ پیریڈ تو زبردست انجوائے منٹ کا ہوتا ہے

ہر لمحہ مشرقی لڑکیوں کی طرح جن کی ''عزت'' کو ہر لمحہ کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہے، ان کی طرح تم بی ہیو کرتے ہو، ہر وقت شادی شادی شادی...... میرے تو کان پک گئے ہیں تمہاری ایک ہی گردان سن کر۔'' وہ بیزار سے لہجے میں بولی۔

''مجھے آفس کی طرف سے شاید چند ہفتوں تک ماسکو بھیجا جائے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور میں...... شادی کے بعد تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔'' اس کے دماغ میں ''فوری وجہ'' آ ہی گئی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کم آن۔ بچوں کی طرح تمہارے ساتھ لٹکوں گی اگر تمہیں آفیشل ٹریننگ پر بھیجا جا رہا ہے تو تمہیں خود جانا چاہیے اور پوری توجہ سے کورس مکمل کر کے آنا چاہیے۔ اب میرے ساتھ تم خاک ٹریننگ کر سکو گے ویسے میں تمہیں پتے کی بات بتاؤں؟'' وہ اس کی طرف جھکی۔

''وہ کیا؟'' اب وہ بیزار ہو چکا تھا۔

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے ہی تمہاری زندگی میں ایک ایسی زبردست تبدیلی آ چکی ہوگی کہ شاید ہی تم یہ ٹریننگ لینا پسند کرو۔''

''کیسی تبدیلی؟'' وہ کچھ متجسس ہوا۔

''چلو تم خوش ہو جاؤ گے اگر کہوں وہ تبدیلی تمہاری من پسند ٹرم ''شادی'' سے قریب تر ہے تو کیسا؟'' وہ اس کو شاید بہلانے کو بولی تھی۔

''قریب تر سے کیا مراد ہے؟'' وہ الجھا۔

''خود ہی جان جاؤ گے دو چار دنوں میں۔ چلو اب تھک گئے اور ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے۔ تمہیں پرسوں شام ہونے والی پارٹی یاد ہے نا شیلا اور اس کی فرینڈ بھی ہوگی۔ اف کیا ایکسائٹنگ پروگرام ہے۔ تم پہلی بار ایسی کسی پارٹی میں شامل ہو گے۔ دیکھنا سب کچھ بھول بھال جاؤ گے اب چلو کل تو نہیں پرسوں ادھر ہی ملیں گے۔''

وہ اسے ساتھ لیے ہوٹل سے نکل آئی اور پرسوں شام کی پارٹی کی باتیں کرتی ہوئی گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔

☆☆☆

''معلوم نہیں آج کی پارٹی میں کیا خاص بات ہے جو رباب، شیلا اور ان کے فرینڈز اتنی مشتاق ہیں۔'' یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ بڑے دل سے تیار ہو رہا تھا۔

اور ایک گھنٹہ قبل جو رباب کا فون آیا کہ اس کے ماما، پاپا اسی ہفتے بدھ کی شام کو آ رہے

ہیں۔ اس خبر نے اس کے اندر نیا جوش بھر دیا تھا۔ منزل اسے قریب نظر آنے لگی تھی مگر اس سارے ولولے اور جوش کے بیچ بار بار اسے ایمن کا چہرہ کسی بھوت کی طرح نظر آ رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں سہما جا رہا تھا۔

اب جبکہ منزل صرف ایک ہاتھ پر تھی۔ ایمن کے خیال کا بار بار آنا قطعاً نیک شگون نہیں تھا۔ وہ اس کے خیال اور اپنے وہم کو جھٹکتے ہوئے تیار ہو کر نکل آیا۔ کبھی کبھی باس مہربانی کر کے آفس میں موجود کوئی نہ کوئی گاڑی اس کے مانگنے پر دے دیا کرتے تھے ورنہ تو اکثر اسے رباب ہی پک کر لیا کرتی تھی۔ آج بھی اسی نے شہریار کو پک کرنے آنا تھا کہ عین ٹائم پر اس نے معذرت کر لی کہ کسی ضروری کام کی وجہ سے اسے دیر ہو جائے گی، اس لیے شہریار گیسٹ ہاؤس میں خود ہی پہنچ جائے۔

ایمن کی نظروں میں کیا تھا؟ کیسا شکوہ، حیرت، دکھ اور بے چارگی نا معلوم وہ کہاں رہ رہی ہے؟ اور جس جگہ وہ جاب کر رہی ہے اس کے یونیفارم سے پتا چل رہا تھا۔ ایمن اور ہوٹل میں ویٹرس کی جاب۔ امیزنگ وہ نک چڑھی نخریلی امیر زادی وہ ایسی گھٹیا نوکری کیسے کر سکتی ہے؟

اس کا ذہن اس انوکھی بات کو تسلیم نہیں کر سکا تھا۔ ان دونوں میں پہلی بار اس کے دل نے بڑے ہمدردانہ اور تھوڑے دکھی سے انداز میں اسے سوچا تھا۔

''میں اسے اس وقت ڈائیورس دے آتا تو آج یوں خوامخواہ میرا ضمیر ملامت نہ کرتا۔''

وہ ان حالوں میں میری وجہ سے تو نہیں پہنچی۔ وہ تو پہلے ہی کنگال ہو چکی تھی۔ میں اس سے شادی نہ بھی کرتا تو بھی اس نے اسی طرح کی کوئی نہ کوئی گھٹیا جاب ہی کرنی تھی۔ اس میں میرا کیا قصور؟ ساری غلطی اس کی ہے جس نے مجھے دھوکا دیا۔

اس رات وہ میرے پیچھے بھی آئی تھی۔ شاید اس نے مجھے پکارا بھی تھا۔ میں نے پارکنگ سے گاڑی نکالتے ہوئے دوبارہ مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ پیچھے تک آئی تھی۔ کیوں؟ اب کیا چاہتی ہے؟ کیا اسے یقین نہیں آیا ابھی تک کہ میں اسے چھوڑ چکا ہوں اور وہاں اس کٹڑی میں تو وہ یقیناً ایک گھنٹہ بھی نہیں رہی ہوگی۔ کاش میں رک کر اس کا کانٹیکٹ نمبر یا ایڈریس...... اسے پیپرز بھجوا دیتا۔ میرے ضمیر کو تسلی ہو جاتی پھر بھلے وہ ویٹرس کی جاب کرتی یا ایئر ہوسٹس کی میری بلا سے۔ یہ ضمیر کے کچوکے نہ تو میرا جی جلاتے۔

گیسٹ ہاؤس کے گیٹ پر پہنچنے تک اسے یہی خیالات آتے رہے۔ پارکنگ میں رباب اور شیلا کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

اگرچہ راستہ بھر وہ ایمن کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا مگر گیسٹ ہاؤس سے اندر داخل ہوتے

ہی ایمن اس کے دل و دماغ سے یوں محو ہوئی جیسے اس کا وجود تھا ہی نہیں۔ اب اسے رباب کی صورت میں اپنا تابناک مستقبل قریب آتا نظر آ رہا تھا۔

''میں بھی کبھی کبھار کنجوسی کی انتہا کر دیتا ہوں۔ کوئی ٹیکسی ہی لے لیتا۔'' لباس پر پڑی شکنوں سے اسے کوفت ہوئی تو خود اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔

''رباب، شیلا اور ان کی دوست فیری نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ تینوں اسپیشل تیاری کے ساتھ نظر آ رہی تھیں شہریار کے دل میں کھد بدی ہونے لگی۔

''کیا بات ہے۔ آج کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے تیسری بار پوچھا تو تینوں ہنس دیں۔

''خاص الخاص جناب عالی! چلو نیچے کامن روم میں تمہیں اپنے کچھ اور دوستوں سے ملوائیں۔'' رباب نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے چلنے لگی۔

ان کے اور دوستوں میں چار ہینڈسم وجیہہ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان سب کا تعلق رباب اور شیلا کی کلاس سے ہی لگ رہا تھا۔

وہ سب بیرون ملک کسی نہ کسی کمپنی یا بزنس میں تھے بلکہ شاید سب ہی رباب کے چچاؤں اور باپ کی کمپنیوں اور کاروبار سے وابستہ تھے۔ ان کی رباب اور شیلا کے ساتھ ٹھیک ٹھاک انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ باربار بے تکلفی سے ہاتھ پر ہاتھ، کندھے سے کندھا ٹکرا کر اس انڈراسٹینڈنگ کے مظاہرے کیے جا رہے تھے۔

شہریار ان کی موجودگی میں خود کو بہت کمتر سا محسوس کر رہا تھا۔ رباب کی بھی ساری توجہ ان کی طرف تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے خفا ہو کر آخر میں خود ہی من بھی گیا مگر رباب کو اس کا پتا نہیں چل سکا۔

سب نے مل کر اسی جگہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد سب ہی نے سگریٹ اور کافی سے دل بہلانا شروع کر دیا۔

معلوم نہیں کیوں بار بار شہریار کو احساس ہو رہا تھا ان کے کچھ جملے، کچھ باتیں کوڈورڈز جیسی ہوتی ہیں جو سمجھنے کے باوجود اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔

رباب، شیلا اور فیری ایک بار پھر اس کو سیکنڈ فلور میں بنے اس روم میں لے آئی تھیں۔

اب کے کمرے میں سینٹرل ٹیبل پر اسپیشل مشروبات گلاس اور دوسرے لوازمات سجے ہوئے تھے۔ شہریار کے قدم سست پڑ گئے۔ اگرچہ اب وہ رباب کی دل جوئی کی وجہ سے کبھی کبھار ایک آدھ جام لینے لگا تھا مگر پھر بھی اس کے اندر کوئی خبردار نامی الارم بجتا ہی رہتا جو اسے ''ام الخبائث'' سے دور رہنے کے لیے مسلسل کہے جاتا اور حیرت انگیز طور پر وہ اس پر عمل کرنے کی کوشش

بھی کرتا تھا۔

''اب کہو، کیسے لگے ہمارے دوست؟'' رباب بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولی۔

''اچھے تھے۔'' وہ صوفے کے کنارے پر یوں ٹکا کہ ابھی بھاگ لے گا۔

''کچھ اندازہ کر سکتے ہو۔ ان کا تعلق کس کلاس سے ہے۔''

وہ بڑے اسٹائل سے سگریٹ لبوں میں دبائے انگلیوں کا سہارا دیے بغیر کش بھی لے رہی تھی اور بول بھی رہی تھی۔

''ظاہر ہے تمہاری کلاس کے ہی تھے وہ سب ہی۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔ تو رباب کے ساتھ شیلا بھی ہنس پڑی۔

''بھئی، تمہارے سجن تو رج کے بدھو ہیں۔'' شیلا ہنسی۔

''ان سب کا تعلق لوئر لوئر لوئر ترین کلاس، یوں سمجھو گٹر کے کنارے سے اٹھا کر ہم نے انہیں کیسے چمکتے دمکتے ستاروں کی طرح پالش کیا ہے کہ تم جیسے لوگ بآسانی دھوکہ کھا سکتے ہیں۔'' وہ ابھی بھی اسی طرح سگریٹ دابے ہوئے تھی۔

''ریئلی!'' شہریار کو حیرت سی ہوئی۔

''اور تم ان کے اکاؤنٹس بینک بیلنس کا حساب لگانا چاہو تو اچھے بھلے چکرا جاؤ گے۔ ان کی صبح پیرس میں ہوتی ہے تو شام لندن میں۔ ایک دن سڈنی میں ہوتا ہے تو دوسرا دن مڈل ایسٹ میں۔ پوچھو کیسے؟'' وہ اب ذرا سا سیدھا ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیسے؟'' شہریار کو تجسس ہوا۔ ان کے قیمتی لباس، ٹپ ٹاپ، بیش قیمت ڈائمنڈز سٹون والی گھڑیاں، لاکھوں کے موبائل سیٹ، گلے میں پڑی گولڈ کی موٹی موٹی چینز بریسلٹ کہیں سے بھی ان کا تعلق گٹر کنارے بستیوں سے ہے، چغلی کھا رہے تھے۔

''یہ راز ہے مائی ڈیئر جو آج رات تم پر آشکار ہو جائے گا۔'' اس نے سگریٹ مسل کر ایش ٹرے میں ڈال دیا اور اپنے بال جھٹکے سے سیدھے کیے۔

''یہ سارا بندوبست اسی راز کو کھولنے کے لیے کیا گیا ہے۔'' اس نے ''مشروبات'' سے سجی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ تھوڑا سا پریشان ہوا تھا۔ اس کے اندر گھنٹی سی بجی تھی کسی انہونی کی۔

''دیکھو یہ دنیا اس کے حالات اس کی ڈیمانڈز بڑی تیزی سے چینج ہو رہی ہیں۔ آج ایک چیز مارکیٹ میں ان ہے، تو کل لوگ اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ پل پل بدلتی اس دنیا کا ہم بھی حصہ ہیں۔ سوخود کو ویلیو ایبل بنانے کے لیے ہر وہ جتن کرتے ہیں کہ دنیا کتنی بھی بدل

جائے۔ ہمیں سب سے آگے ہی پائے۔ ہماری تمام ترکمپنیز اور بزنس کا سب سے پہلا ہی موٹو ہے۔''

کمپنی، بزنس ڈیمانڈ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''چلو میں تمہیں اور نہیں چکراتی۔ آسان اور سادہ لفظوں میں بتاتی ہوں۔ تمہیں پیسہ، دولت، آسائشیں حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ کی تلاش ہوگی اور ہے۔ ہے نا ایم آئی رائٹ۔''

اس کے کہنے پر شہریار بے اختیار چونکا تھا۔

''آج یہ سب دولت، پیسہ، آسائشیں تمہارے قدموں میں ہوں گی۔ ایک بہت ہی ضرر سی چیز کے عوض۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' اس کے اندر گھنٹی کا والیوم بڑھتا جارہا تھا۔

''یہ سارے لڑکے لڑکیاں ہماری کمپنی میں کام کرتی ہیں۔ بڑی بڑی ڈیل ہم انہیں دلواتے ہیں۔ ففٹی ففٹی پرسنٹ دونوں کے حصے میں آتا ہے آج سے انیس بیس سال پہلے انسانی تجارت میں عورت بہت قیمتی سب سے ضروری آئٹم سمجھی جاتی تھی مگر آج ویلیوز ٹوٹلی چینج ہوگئی ہیں۔ ڈیمانڈ بڑھی جارہی ہے تو ان جیسے خوب صورت نوجوانوں کی۔''

وہ رکی اور بوتل سے مشروب جام میں انڈیلنے لگی۔

شہریار کی سماعتیں ہی نہیں اس کا سارا بدن عجیب سی سائیں سائیں کے حصار میں آچکا تھا۔

''ہمارا ایک مکمل مربوط نیٹ ورک ہے اور ہم جہاں جہاں ڈیمانڈ ہو، تم جیسے خوب صورت وجیہہ نوجوان ''سپلائی'' کرتے ہیں تمہیں اور تم جیسے نوجوانوں کو صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ ہم جیسی لڑکیوں کے ساتھ دس منٹ کی ایک انٹروڈکٹری موی بنوانی پڑتی ہے۔ پھر ہم اس وڈیو فائل کو ڈیمانڈ اسپائس پر بھیجتے ہیں۔ پھر ڈیمانڈ پر سمجھو، اس لڑکے کے ہاتھ قارون کے خزانے کی کنجی لگ جاتی ہے اور جو ایک بار ہمارے نیٹ ورک کا حصہ بن جاتا ہے، پھر ہم سے صرف موت کی صورت میں جدا ہوسکتا ہے، ورنہ ہم نہ خود بے وفا ہیں نہ بے وفائی کو پسند کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ساری باتیں تمہاری سمجھ میں آگئی ہیں اگر جو نہیں سمجھ آئیں وہ ان وڈیوز کو دیکھ کر آجائیں گی۔ شیلا ٹی وی آن کرو۔''

شہریار کو لگا اس کی آنکھیں کانوں تک چڑھ جائیں گی اور حواس حواس تو جیسے معطل ہوچکے تھے۔

رباب یہ وہ رباب تو نہیں تھی۔ یہ تو کسی وحشی بربر قبیلے سے تعلق رکھنے والی کاٹنے چیرنے پھاڑنے والی وحشی قصاب عورت تھی۔ اس کی آنکھوں، اس کے انداز سے چھلکتا کاروباری پن اسے تمام کا تمام ایک پتھر دل، بے حس کارخانہ دار ظاہر کررہا تھا۔

اور ٹی وی میں چلتی وڈیو۔ وہ نیک تھا نہ پاک باز نہ حیا والا مگر ایسا...... ایسا تو وہ خود کو کیا کسی بدتر سے بدتر انسان کو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی نگاہیں اسکرین پر چند لمحوں سے زیادہ ٹھہر نہیں سکیں اور وہ تینوں سپاٹ نظروں سے اسکرین کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی فیملی ڈرامہ لگا ہو۔

''مگر یہ تو ایک لمبا پروسس ہے۔ ڈیل ہونے ڈیمانڈ اینڈ سپلائی میں لمبا وقفہ اور تمہیں معلوم ہے مجھ میں Passions (صبر) ذرا کم ہے مجھے تو دولت چاہیے اور وہ بھی ڈھیر ساری اور فوراً۔ اس منحوس ٹی وی کو بند کرانے کا اس کے ذہن میں فوری طور پر یہی طریقہ آیا۔

''نہیں، اتنا عرصہ نہیں لگتا۔ تم آج وڈیو بنوالو کل صفدر اس فائل کو لے کر مڈل ایسٹ چلا جائے گا تو ایک ہفتے کے اندر سب معاملات طے ہوجاتے ہیں۔ اس دوران تمہارا ویزا، پاسپورٹ اور جو ضروری ڈاکومینٹس ہوں گے وہ بنوالیے جائیں گے۔''

وہ مطمئن لہجے میں بتانے لگی۔ اسے شہریار کے انداز نے تھوڑا حیران کیا تھا مگر پھر اس کی حریص فطرت کا سوچ کر مطمئن ہوگئی۔

''اور اس میں میرا شیئر مطلب، کیا ہر ڈیل کا الگ الگ ہوگا یا......'' وہ کاروباری انداز میں بولا۔

''تمہیں بتایا نا ففٹی پرسنٹ ہمارا، ففٹی پرسنٹ تمہارا۔ ہفتہ بھر میں کمالو گے اور کیا چاہیے؟'' وہ ازسرنو سگریٹ سلگا کر بولی۔

''میں سوچنے کے لیے کچھ وقت لینا چاہتا ہوں۔'' اس نے ذرا توقف سے کہا۔

''اس کمرے سے باہر اب تم صرف ہمارے پارٹنر بن کر جاسکتے ہو چونکہ تم ہمارے رازوں سے واقف ہوچکے ہو اس میں تمہیں ''ہاں'' کے سوا اور کچھ نہیں سوچنا ہوگا۔'' وہ سفاک لہجے میں بولی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اوکے میں ایگری ہوں مگر فریش ہونا چاہتا ہوں اگر صرف دس منٹ مل جائیں۔'' وہ اجازت طلب انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

رباب نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔ ٹھیک ہے دیر نہ لگانا یوں بھی کیمرے آن ہیں جلدی آجاؤ......''۔

اور اس نے واش روم کی طرف جانے میں ایک منٹ نہ لگایا۔

دروازہ لاک کرتے ہی اسے لگا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے ہی مگر کسی سایہ عاطفت میں آگیا ہو۔

''او میرے اللہ! میرے خدا! یہ ذلیل لڑکیاں گینگ سٹر ہیں اور میں ان کا حصہ بن

جاؤں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔" وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر باتھ روم کی آخری دیوار کے ساتھ ٹکرانے لگا۔

"یہ ہے وہ شارٹ کٹ، دولت حاصل کرنے کا شارٹ کٹ شہریار صاحب، دیکھیے اس شان دار شارٹ کٹ کو...... جو لوگ اللہ کے بنائے ہوئے جائز رستوں کو چھوڑ کر حق داروں کو ان کا حق ادا کرنے سے بھاگتے ہیں جب تقدیر کے چنگل میں پھنستے ہیں تو پھر اس طرح انہیں اپنے گناہ اپنی لغزشیں، اپنی سرکشی یاد آتی ہے۔ تم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہ بنا کر ایک معصوم لڑکی کی زندگی کو کھیل بنایا تو دیکھو شہریار! آج کیسے تمہاری زندگی تمہارا جسم کھلونا بننے جا رہا ہے۔ تمہیں پیسہ چاہیے تھا۔ لو دیکھو کیسا گولڈن چانس ملا ہے پیسہ کمانے کا۔ اب خود کو بیچو اور نوٹ کماؤ۔ یوں بھی بیچ تو تم پہلے بھی خود کو رہے تھے اب ذرا بکنے کا ڈھنگ اور ہے اور مال زیادہ بھی اور یقینی بھی...... تم لازمی فائدہ اٹھانا چاہو گے...... آج آئے ہو اپنی ہی ہوس حرص کے چوہے دان میں۔ اب کہاں بھاگو گے، کیسے بھاگو گے۔ باہر وہ حسین چہرے والی بدشکل ڈریکولا صفت خون چوسنے والی بلائیں بیٹھی ہیں جو دولت کے ریپر میں لپٹی تمہیں دنیا کی سب سے حسین، سب سے پیاری صورتیں لگ رہی تھیں اب جاؤ ان کے ساتھ مل کر اپنی "فائل" بنواؤ اور نوٹ کماؤ۔"

"میرے اللہ! مدد...... میرے خدا...... میں مر جاؤں گا...... مر جاؤں گا مگر یہ نہیں کروں گا۔ معافی معافی دے دو مجھے۔"

وہ اونچا، لمبا وجیہہ مرد زمین پر دوزانو بیٹھا اپنا سر وحشت کے عالم میں جکڑے آنسوؤں کے ساتھ رو رہا تھا۔

"نکلو باہر۔ کیا اندر جا کر مر گئے ہو؟" یہ رباب کی آواز تھی یا کسی جلاد کی۔ اسے ایسے ہی لگا۔
اس نے وحشت زدہ انداز میں سر اٹھایا اور اس شان دار باتھ روم کی الماریاں کھول کر دیکھنے لگا۔

بلیڈ صرف ایک ہی کام کی چیز اسے اتنے سجے سجائے باتھ روم میں مل سکی تو ایک گہرا سکون اس پر طاری ہو گیا۔

"میں یہاں سے اب مر کر ہی نکلوں گا۔ تم سے جو ہو سکتا ہے تم کر گزرو۔ حرافہ، مکار عورت میں تمہارے بنائے ہوئے اس خوب صورت شیطانی جال میں آنے سے بہتر اپنی جان لینا سمجھوں گا جو ہو سکتا ہے۔ کر لو۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور بلیڈ ہاتھ میں لیے پہلے والی جگہ پر آ گیا۔

وہ تینوں باہر بپھر گئیں۔ انہوں نے اسے دھمکانا شروع کر دیا۔

"رہنے دو۔ اس کو کچھ نہ کہو، دو چار گھنٹے میں پاک بازی کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔ اتنے نیک پاک تھے تو دولت کی خاطر بیوی کو لات مار کر کیوں آئے۔ لالچی حریص انسان! تجھے دولت چاہیے تھی۔ مل رہی ہے۔ اب کیوں ناشکری کر رہا ہے۔ نکل باہر۔ اب تیرے پاس ہمارا حصہ بننے یا مر جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ جلدی سوچ کس رستے کو اپنانا ہے؟"

رباب کی آواز تھی یا موت کی للکار...... اسے شہریار کی شادی کا بھی علم تھا۔

"وہ کہتے ہیں، ہم چال چل رہے ہیں انہیں نہیں علم کہ اللہ ان کے ساتھ چال چل رہا ہے۔" وہ پھر سے زمین پر گر کر بے آواز آنسوؤں کے ساتھ رونے لگا۔

وہ تو اپنے گمان میں سب کے ساتھ چال چل رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا اس کی مکاری اس کے لیے کیسا گڑھا تیار کر رہی ہے کہ جس سے باہر آنے کا کوئی رستہ ہی نہیں۔ بے بسی، بے چارگی کس شے کا نام ہے، اسے اب سمجھ میں آ رہا تھا جس عالم میں وہ ایمن کو چھوڑ آیا تھا بے یار و مدد گار......

وہی بے بسی، بے چارگی آج اس کے سامنے کھڑی تالیاں پیٹ پیٹ کر ہنس رہی تھی اور وہ رو رہا تھا۔

ایک مرد اپنی بے بسی، اپنی بے چارگی پر رو رہا تھا۔

اور وہ تینوں باہر شیرنیوں کی طرح اس کا شکار کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھی تھیں۔

رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی طرح۔

☆☆☆

"او سر جی! ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے، وہ بڈھا ہمارے ساتھ ہاتھ کر گیا۔ ادھر تو دور دور تک ویرانہ اور اندھیرا ہے، خدا جانے ادھر کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔"

وہ کیاری میں گرتے ہی چلایا تھا۔ کانٹے اس کے بھی گوشت کو چیرتے ہوئے اندر تک کھبے تھے۔

"اب کیا حکم ہے سر جی! آ جاؤں یا اندر جاؤں۔" وہ وہیں سے بولا، اِدھر اُدھر ٹارچ کی مدد سے مسلسل تلاش کر رہا تھا۔

"آ جاؤ۔ اب اس جیدے کی خیر نہیں۔ اب خود اس کو لے کر ہمارے قدموں میں ڈالے گا۔ تم دیکھنا۔" اس کی غراہٹ نما آواز میں واضح عزم تھا مگر ایمن کا سکڑتا پھیلتا دل ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔

اس نے بھاری گیٹ اندر سے کھولا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد اُن کی گاڑی اسٹارٹ ہونے اور جانے کی آواز سناٹے میں گونجی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

مگر اس میں اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت پیدا نہیں ہو سکی۔ وہ اس بدبودار کیچڑ اور گند سے بھرے ڈاگ گھر میں اپنے گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے روئے جا رہی تھی۔

''اللہ! میرے اللہ! تو نے مجھے بچا لیا۔ اس گندے غلیظ بدبودار...... گھر کو میرے لیے اندھی ڈھال بنا دیا۔ تو جسے میں نے اپنی اٹھارہ انیس سال کی زندگی میں ایک بار بھی نہیں پکارا۔ ایک بار بھی نہیں بلایا جب بھی پکارا، جب بھی مدد مانگی، انسانوں سے مانگی۔ آسائشوں اور روپے پیسے سے مدد مانگی۔

میں بے وقوف نادان سمجھتی رہی کہ مجھے کسی مضبوط انسانی سہارے کی ضرورت ہے اور شہر یار جیسے کمزور ترین سہارے کو اپنے لیے محفوظ ترین سائبان سمجھ کر بھکارن بن گئی۔ وہ جھوٹا، بودا، کمزور سہارا ایک پل کو بھی میری مدد نہیں کر سکا۔ اس لاچاری، بے بسی کے عالم میں پہلی بار دل سے سچے دل سے میں نے اپنے رب کو پکارا تو اس نے آنکھیں رکھتے ہوئے اس شخص کو اندھا بنا دیا کہ اندھیرے میں درختوں کے پاس بنے اس گھر کو وہ دیکھ نہ سکا، میں تجھ سے غافل تھی۔ تیرے ہونے سے بے خبر...... تو تو مجھ سے غافل نہیں تھا۔ بے خبر نہیں تھا۔ کیسے کیسے میری خبر گیری کی۔ کیسے میری حفاظت، میری رکھوالی کی، اور میں دیوانوں کی طرح ان کمزور سہاروں کو پکارتی رہی ان پر تکیہ کرتی رہی۔ ایک بار بھی دل سے تجھے پکارا ہوتا۔ تیرا سہارا مانگا ہوتا تو آج یوں بے مقصد زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔

مجھے معاف کر دے۔ میرا سہارا بن جا، ایسا سہارا جس کے بعد مجھے کسی اور سہارے کی حاجت نہ رہے۔ آج اس تاریک رات کے سنسان لمحوں میں تجھ سے اپنا وہ تعلق جوڑتی ہوں جو تو نے میری پیدائش کے ساتھ مجھ سے جوڑ لیا تھا اور میں اس تعلق سے غافل تھی۔ بندے اور مالک کا تعلق غلام اور آقا کا تعلق......

آج سے میں نے اپنی ساری گٹھڑیاں، سارے بوجھ، ساری فکریں، سارے اندیشے تیرے حوالے کیے۔ جب ایسے نازک مشکل ترین ناممکن مرحلے پر ایک بار...... ایک بار دل سے پکارنے پر تو میری مدد کو آ سکتا ہے تو باقی زندگی کے تمام معمولی معاملات میں تو مجھ سے کیسے غافل رہ سکتا ہے؟

''اب سب کچھ تیرے حوالے۔'' ان سیاہ لمحات میں کیسا اجالا تھا کیسی روشنی کہ اس کی آنکھوں کے آگے پڑا ایک ایک پردہ سرکتا چلا گیا۔ وہ تاریک اندھیروں سے چندھیا دینے والی روشنی

میں آ گئی تھی۔ اسے تو یہ تک بھول گیا تھا وہ کس جگہ کس مقام پر ہے۔ وہ تو عجیب ذہنی کیفیت میں بڑے سکون، بڑے آرام سے پہلی بار اپنے اللہ سے محو گفتگو تھی اسے نہ اردگرد کا ہوش تھا نہ جسم سے رستے لہو اور زخموں سے اٹھتی ٹیسوں کا احساس۔ وہ تو کسی اور ہی دھن میں کسی اور ہی خیال کے سیل رواں میں بہے جا رہی تھی۔

☆☆☆

دن چڑھے جب ہلکی ہلکی صبح صادق کی روشنی ساری طرف پھیل چکی تھی۔ وہ تھکی تھکی سی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی اور پہلے ہی قدم پر ٹھٹک کر رہ گئی۔

اب اسے پتا چلا۔ وہ کیسے درندوں کے منہ سے بچ کر نکل آئی تھی۔

زاہدہ باجی، سلو، جگنو، کوکو، منیا پاگلوں کی طرح روتے ہوئے اس کی سلامتی، اس کے لیے خیر کی دعائیں کر رہے تھے۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر ان کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا پھر چاروں اس کے گلے لگ کر رونے لگ گئے۔

''مامی! مامی! آپ کہاں رہ گئی تھیں؟ رات بھر۔ ساری رات...... ہم پاگلوں کی طرح جاگتے رہے۔ آپ کا انتظار کرتے رہے، آپ کا موبائل کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ مامی! آپ ٹھیک ہیں؟'' کوکو تو اس کی دیوانی تھی۔ منیا تک اس سے لپٹی جا رہی تھی۔ جگنو وہ تو بس روئے جا رہا تھا۔ کچھ بھی بول نہیں رہا تھا اور سلو کی سسکتی آنکھیں، رویا رویا چہرہ رات کی کہانی سنا رہا تھا۔ زاہدہ باجی اسی پیڑھے پر بیٹھی قبلہ کی طرف منہ کیے سجدہ ریز تھیں۔

اور اس سے ان کی محبتوں کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ اتنا تو وہ اپنے ماں باپ کی موت پر بھی نہیں روئی تھی جتنا ان کو گلے لگا کر روئی۔

اب سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ غیبی مدد کس طرح اس تک پہنچی تھی۔ ان ننھے معصوم دلوں سے نکلنے والی دعاؤں کی بدولت۔ اس کا محض یونہی، ایسے ہی ان کی مدد کو اٹھا لینے والا ''معمولی سا قدم'' اللہ کو پسند آ گیا تھا وہ واقعی بے پروا ہے۔ نہیں معلوم ہمارا کون سا معمولی بیکار سا عمل اس کی درگاہ میں بیش قیمت موتیوں میں بدل جائے۔

وہ ان کو اپنے ساتھ لگائے لگائے اندر کمرے میں گئی اور بیڈ پر گر گئی۔

''اوہ مامی تو زخمی بھی ہیں۔ سلو بھاگ کر جا۔ دکانیں کھل گئی ہوں گی۔ کوئی دوائی وغیرہ لے آ......''

کوکو فکر مندی سے کہے جا رہی تھی اور وہ زخموں اور ان کے درد سے بے نیاز آنکھیں بند

کیے غنودگی میں اتر رہی تھی۔ اب اسے کا ہے کی فکر۔ اس نے ساری فکریں سنبھالنے والا سب سے مضبوط سہارا جو پالیا تھا۔ اب آنکھیں جاگیں یا سوئیں۔ کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا اندر اس کی ''روح'' گہری غفلت بھری نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''شمائلہ طاہر حفیظ'' وہ بری طرح سے چونکی تھی۔

وہ آج کل پھر جاب کی تلاش میں سرگرداں تھی کہ وین نے اسے مطلوبہ اسٹاپ سے کافی پیچھے اتار دیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ کے ساتھ بنی دکانوں کو سرسری نظر سے دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی کہ اس شاندار کتابوں کے شوروم کی گلاس ونڈو میں لگی کتاب اور اس کے ٹائٹل پیج پر لکھے نام نے اسے چونکا یا تھا۔ وہ تیزی سے دکان کے اندر داخل ہوگئی۔

اس کی ماما کے چاروں سفرنامے کتابی شکل میں ایک ساتھ سجے ہوئے تھے اور وہ بے قرار وملول سی بار بار اس نام پر ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے اس کے ہاتھ کے نیچے ماما کا چہرہ ہو۔ کتنی دیر وہ اسی محویت کے عالم میں کھڑی کبھی نام کو ٹٹولتی، کبھی کتاب کھولتی، بند کرتی بے دھیان سی کھڑی رہی۔

''انٹرویو سے فارغ ہو کر مجھے ان پبلشر صاحب سے جا کر فوراً ملنا ہے اور کچھ نہیں تو یہ کتابیں تو لے کر آؤں۔ میری ماما کی کتابیں بک شاپ میں ہر بک شاپ میں۔ کس قدر ایکسائٹنگ بات ہے۔''

وہ اپنی دھن میں سوچتی چلی جا رہی تھی کہ کسی سے ٹکرا گئی۔

''اوہ سوری!'' وہ جلدی سے پیچھے ہٹی اور اپنی چادر درست کرنے لگی۔

''ایمن۔ ایمن ہو نا تم؟ طاہر حفیظ کی بیٹی!''

انہیں اسے پہچاننے میں مشکل ہو رہی تھی مگر وہ انہیں پہلی نظر میں پہچان چکی تھی۔ اس کے پاپا کے لیگل ایڈوائزر ممتاز انکل تھے۔

''ایمن...... ایمن! بے وقوف بچی! کتنا تمہیں ڈھونڈا، تلاشا۔ تمہارے پاپا کے دوستوں، نیبرز کہاں کہاں میں نے رابطہ نہیں کیا مگر تمہارا کچھ پتا نہیں تھا۔'' وہ اسے اپنے چیمبر میں لے آئے تھے۔ کولڈ ڈرنک اسے تھما کر شروع ہو گئے۔

''کس لیے انکل؟ اب میرے آپ سے رابطے کی کیا وجہ باقی رہ گئی تھی۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''او نادان بیٹی! میں تمہارا، پاپا کا لیگل ایڈوائزر، تمہاری امانتوں کا امین تھا، اگرچہ تمہارے پاپا نے پراپرٹی اور پیسے کے نام پر تمہارے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا مگر انہوں نے تمہارے

لیے سیونگ سرٹیفکیٹ تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی خرید کر بینک میں ڈال رکھے تھے اور آخری بار جانے سے پہلے انہوں نے مجھے بطور خاص یہ تاکید کی تھی کہ جیسے ہی تم شادی کرلو یا اگر تمہارا ہائیر ایجوکیشن کے لیے ابروڈ جانے کا ارادہ ہو میں تمہیں ان کے بارے میں بتادوں۔ حاصل میں یہ سرٹیفکیٹ اسی سال کے شروع میں میچور ہونے تھے اور اگر دونوں باتیں نہ ہوتیں تو بھی اسی سال ان کے میچور ہوتے ہی تمہیں ان کو تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا تھا اور دوسرے......''

وہ رکے۔

''ان کی مالیت اتنی بنتی تھی کہ تم دس بیس سال ان کے محض پرافٹ ہی سے اپنی اچھی گزر بسر کر سکتی تھیں۔ میں آخری بار تمہارے گھر سے آنے سے پہلے تمہاری اس آنٹی کو تاکید کر کے آیا تھا کہ ایمن جہاں کہیں بھی جائے۔ اپنا ایڈریس رابطہ نمبر مجھے ضرور دے کر جائے۔ معلوم نہیں انہوں نے تمہیں کیوں نہیں بتایا۔''

وہ چپ بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔

''اور دوسری اہم ترین وجہ یہ پیپرز تھے۔'' انہوں نے پیچھے ریک میں رکھی فائلز میں سے ایک نکالی اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر اس کے آگے کیا۔

''یہ تمہارے گھر کے کاغذات ہیں۔ تمہارے نام۔'' اس انکشاف پر وہ اچھل ہی تو پڑی۔

''کیا مطلب؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''یہ دنیا مکافات عمل کا نام ہے۔ یقیناً طاہر حفیظ نے اپنے سارے اکاؤنٹس، روپیہ پیسہ تمہاری والدہ کے علاج معالجے کی خاطر ختم کر ڈالا مگر وہ دونوں بہرحال اتنے زیادہ لاپروا نہیں تھے کہ تمہارے لیے یہ گھر بھی نہ چھوڑتے۔'' وہ رکے۔ ایمن یک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تو راشد انکل نے وہ سب فراڈ......'' وہ اٹک کر رہ گئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''دراصل تمہارے پاپا سے راشد نے...... سادہ پیپرز پہ سائن کروالیے تھے کہ کسی نہ کسی کاروباری مسئلے میں ان کے دستخط کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور انہیں نہ جانے کتنے دن لگ جائیں تو وہ دو تین پیپرز پر انہیں یونہی سائن کر جائیں۔ حفیظ صاحب نے ان پر اعتبار کیا اور نہ جانے کیسے ان کی نیت میں فتور آیا، اور انہوں نے ایک کاغذ کے دستخط استعمال کر کے گھر اپنے نام کروالیا۔''

''پھر...... پھر یہ دوبارہ کیسے؟ میں نے تو کوئی کیس نہیں کیا۔''

''ایک عدالت اوپر والے کی بھی تو ہے میری بچی! راشد کو کینسر کی مہلک ترین شکل نے اپنے گھیرے میں لے لیا اور بستر مرگ پر تو انسان کو اس تاریک گھر کا دروازہ اپنی جانب کھلتا ہوا نظر

آتا ہے جو سانپوں، کیڑوں اور اژدھوں کا گھر ہے یا راحتوں بھرا بستر۔ صرف انسان کے اعمال کے بل پر...... اور مرنے سے تین دن پہلے انہوں نے مجھے بلا کر اس گھر کی ملکیت کے کاغذ تمہارے نام کرتے ہوئے تم سے معافی بھی مانگی اور ہر جانے کے طور پر ایک بھاری رقم تمہارے نام بھی کر گئے......"

"کیا......؟" وہ بھونچکی رہ گئی۔ "راشد انکل......"

"ہاں ایمن! وہ پچھلے مہینے ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ تم سے بہت معافی چاہ رہے تھے۔ ان دنوں میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا، مگر شاید اللہ کو منظور نہیں تھا۔ ہو سکے تو انہیں معاف کر دینا۔"

"انکل! میں نے ان کا کیا کسی کا بھی برا نہیں چاہا بلکہ جو کچھ ہوا، اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کیا اور جو نہیں قبول کیا۔ اسے تقدیر اپنی زور زبردستی سے مجھ سے منواتی چلی گئی کہ انسان کے مقدر سے زیادہ زور آور تو کچھ بھی نہیں اور یہ میرے دل کی سب سے بڑی خواہش تھی اگرچہ میں نے عرصہ ہوا خواہشوں کے دیس سے نقل مکانی کر لی ہے پھر بھی اپنی ماما، پاپا کے گھر کی یاد جب بھی میرے دل میں آئی تو اپنی بدنصیبی کے پختہ یقین کے ساتھ دل سے ہوک اٹھتی تھی۔ تھینک گاڈ اور میں شکر ادا کرنے کے قابل بھی نہیں۔" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

اور ممتاز صاحب کے سامنے ایک بدلی بدلی سی ایمن بیٹھی تھی جو ابھی بھی ان سے ٹھیک طرح سے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

☆☆☆

"بی بی! حد کی آپ نے نہ کوئی ایڈریس نہ فون نمبر نہ سیل نمبر۔ آخر آپ سے ہم رابطہ کرتے تو کہاں جو پتا ہمارے پاس تھا، بار بار ادھر ہمارا آدمی گیا اور ہر بار ایک ہی جواب کہ آپ یہ گھر، علاقہ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اور میں...... مجھے آپ کی امانت نے بے چین کر رکھا تھا۔ خدانخواستہ آپ مجھے نہ ملتیں خود سے نہ آتیں تو میں اپنے ضمیر، اپنے اللہ کو کیا منہ دکھاتا......" پبلشر کہہ رہا تھا اور وہ ایک ہی لفظ کی سرشاری میں گم تھی۔

"اللہ، کتنا پیارا، کتنا میٹھا، کتنا چھپر چھاؤں سا لفظ ہے۔" اس کے لاشعور سے شعور تک بار بار، کروڑ ہا بار اس کے کانوں۔ اس کی سماعتوں نے یہ لفظ سنا اور وہ اس کی شیرینی سے ناآشنا رہی لوگ کیسے frequently (بار بار) یہ نام اپنے لبوں سے لیتے تھے۔ اس کے نام کا ذکر کرتے تھے اور صد حیرت اس کا دل اس پیارے نام کے اثر سے کیسے بے اثر رہا اور کوئی نہیں تو خالہ بی جن کی ہر دوسری پہلی بات میں اس نام کی گردان ہوتی تھی ایک وہی غافل تھی......

"وہ آپ کی امانت......"

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی، جب کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کے آگے سرکایا گیا اور اس پر لکھی رقم دیکھ کر اسے اس مضبوط سہارے کے ساتھ ہونے کا کیسے کامل یقین ہوا تھا۔ صرف ایک "ماننے" نے اس کے لیے اَن گنت بند دروازے کھول دیے تھے۔ دولت کے عزت کے فراوانی کے سکون کے خوشی اور محبت کے...... محبت......"

اس کے دل سے ہوک سی اٹھی۔

وہ جب اس شوروم سے ماما کی کتابوں کی کچھ کاپیاں اور چھ لاکھ مالیت کا چیک لیے نکلی تو مالی طور پر کیسی مضبوط ہو چکی تھی مگر محبت کے معاملے میں ابھی بھی کنگال تھی، اور نہ جانے کیوں اس رات کے بعد اس کے دل نے ایک بار بھی شہریار کو نہیں پکارا تھا۔ عجیب سی بے فکری بے دھیانی اس کے خیال کی طرف سے ہو گئی تھی۔

"ایک دو دن میں ہم اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔" یہ خیال ہی کتنا خوب صورت، کتنا خوش گوار تھا۔

وہ ممتاز انکل کے ساتھ جا کر سارا گھر دوبارہ دیکھ کر آئی تھی۔ سب سامان ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ اَن چھوا صرف گرد و غبار میں اٹا۔ وہ کل وہاں جا کر صفائی کروانا چاہتی تھی۔

زاہدہ باجی اور بچوں کو سرپرائز دینا چاہتی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا۔ اس کے پیارے اللہ نے اس کے لیے ایک اور سرپرائز تیار کر رکھا ہے۔

وہ تھکی ہاری اندر جا کر اپنے بستر پر لیٹنا چاہ رہی تھی کہ پہلے سے وہاں کسی کو موجود دیکھ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

"زاہدہ باجی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے ساری زندگی آپ کو وہ مقام، وہ درجہ نہیں دیا جو آپ کا حق تھا اور میرا فرض۔ مجھ جیسا خود غرض، بے حس، لالچی بھائی اس دنیا میں شاید ہی کسی بہن کا ہو۔ بہن بھی جو آپ جیسی۔ بہت سزا پالی ہے، اپنی ہوس اور تکبر کی۔ اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا تو شاید میرا اللہ بھی مجھے معاف نہ کرے۔ میں آپ کا، ان معصوم بچوں کا گناہگار ہوں اور سب سے بڑھ کر......"

وہ رک گیا۔ گلوگیر آواز آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے وہ تو کوئی اور ہی شہریار لگ رہا تھا۔ زاہدہ باجی حق دق سی اسے لب سیئے تکے جا رہی تھیں اور وہ چاروں یوں حیران کھڑے تھے جیسے

دنیا کا آٹھواں عجوبہ ان کے گھر میں آ گیا ہو۔

''زاہدہ باجی! معاف کر دیں مجھے۔'' وہ ان کے زانو پر سر رکھ کر رو دیا تو وہ تڑپ اٹھیں اور بے قراری سے اسے پیار کرنے لگیں۔

''لے بے وقوف! پگلا دیوانہ! کبھی بہنیں بھی بھائیوں سے ناراض ہوئی ہیں۔ وہ بھی تیرے جیسا شہزادہ بھائی......'' اس نے ایک دم سر اٹھا کر اپنا ہاتھ ان کے منہ کے آگے رکھ دیا۔

''خدا کے لیے مجھے شہزادہ کہہ کر خود سے اور گھن کھانے پر مجبور نہ کیجیے۔ مت پوچھیے اس شہزادگی اور مردانہ وجاہت کی کیا قیمت چکاتے چکاتے بچا ہوں۔ مت پوچھیں۔'' اس کی آنکھوں سے پھر آنسو نکلنے لگے۔

وہ کیسی قیامت سی رات تھی جب وہ پوری رات اس باتھ روم میں سجدے میں گرا اپنے رب سے اپنے اللہ سے گڑگڑا کر معافیاں مانگتا رہا، اپنی نجات اپنی معافی اور توبہ کے لیے روتا رہا۔ پوری رات ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل، اس کا ذہن نیند کی غفلت میں نہ کھویا تھا۔

اس نے کبھی زندگی میں ایک بار بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ باتھ روم میں ایک گندگی کی جگہ پر اپنا سر رکھ کر اپنے پیدا کرنے والے کے آگے اپنی حرص، اپنے لالچ، اپنے گناہوں، اپنے تکبر کی معافی مانگے گا اور وہ مانگتا رہا تھا وہ جو کٹڑی کی گندگی کی کیڑوں جیسی زندگی اور اپنے ماں باپ کی غربت سے شدید نفرت کرتا تھا۔ آج اسے علم ہوا تھا وہ غلط تھے یا صحیح مگر ناجائز نہیں تھے اس کی طرح گناہ کی دلدل میں دھنسے ہوئے نہیں تھے۔ وہ تو اپنے ہی نفس کی ذلت بھری دلدل میں سینے تک دھنسا ہوا تھا اور اس دلدل سے نکالنے کے لیے اس کے پیدا کرنے والے نے اسے باتھ روم میں گڑگڑانے اور توبہ کرنے پر مجبور کیا تھا کہ اسے اپنی ''اوقات'' اپنا ''مقام'' اور اپنی ذات کی تحقیر کا ایسا درست اندازہ ہوا تھا کہ کیا کسی پیمانے میں تلنے کے بعد ہوتا۔

رات بھر کے انتظار یا شاید آدھی رات کے بعد ہی وہ تینوں اس کمرے سے دفع ہو گئی تھیں۔ وہ تو کمرے کی طرف متوجہ ہی دن چڑھنے کے بعد ہوا تھا۔ اس کے پاس دو ہی راستے تھے۔ خودکشی یا باہر نکلنے کا رسک لینا۔

اس نے بے حد غور و خوض کرنے اور دروازے سے گھنٹہ بھر کان لگانے کے بعد رسک لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

شاید رب کو اس کی توبہ پسند آ گئی تھی یا واقعی اسے ایک موقع اور دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ کمرہ بالکل خالی تھا مگر دروازہ لاکڈ تھا۔ اس نے ریسپشن کو فون کر کے کسی شخص کو اوپر بھیجنے کو کہا۔

''غلطی سے جانے کیسے دروازہ لاک ہو گیا۔'' وہ دروازہ کھولنے والے شخص سے کہہ کر اس کے اگلے سوال کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آیا۔

اور پھر اس کٹڑی کا پھاٹک عبور کرنے تک اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہ گندی، غلیظ، قابل نفرت کٹڑی اس وقت اس کے لیے دنیا کی سب سے محفوظ پناہ گاہ تھی۔ اس منحوس گینگ کو یقیناً اس کی اس رہائش کا علم نہیں ہو سکتا تھا جہاں وہ بے فکری سے رہ سکتا تھا۔

رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سو اندر پڑے آرام دہ بستر پر لیٹا تو اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں لیٹا ہے۔

☆☆☆

''تم پارس تھیں اور میں خام لوہا۔ تم مجھے ملیں اور مجھے بھی قیمتی بنا دیا۔ انمول بیش قیمت پر میں نادان بے وقوف جان ہی نہ سکا کہ میں جس دولت کی طلب میں دیوانہ ہو رہا ہوں، وہ تو مجھے مل چکی ہے۔ میری آنکھیں تھیں ان میں بصارت بھی تھی مگر بصیرت تھی نہ وہ دیکھنے والی نظر جو قدرت مجھے تم سے ملانے کے بعد بنا چکی تھی میں دیوانوں کی طرح خود کو بے مول کرنے کے لیے اس دنیاوی دولت کے تعاقب میں بھاگتا رہا جو کسی کے ساتھ بھی وفا نہیں کرتی۔''

اس نے بیڈ کی پشت سے سر لگایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''میں سوچا کرتا تھا اس معاشرے کا سب سے مضبوط سہارا دولت ہے، جس کے سہارے آپ زندگی کے مشکل سے مشکل زینے کو باآسانی پھلانگ سکتے ہیں اور اس سہارے کو حاصل کرنے کے بے شمار شارٹ کٹ ہیں اور میں بڑے فخر سے دوستوں کے بیچ کسی دانش ور کی طرح کہا کرتا تھا اگر تم خود سونا نہیں ہو تو کوئی پارس ڈھونڈ لو۔ وہ تمہیں خود بخود سونے کا بنا دے گا اور سونا کیا ہے ایک پتھر ایک دھات...... میں پتھر بنا چاہتا تھا۔ یہ یقیناً حیرت کی بات ہو گی کہ ایک پتھر مزید پتھر بننے کے لیے بھٹک رہا تھا۔

ہمارے معاشرے میں مرد رویا نہیں کرتے مگر ایمن جب اس پتھر کی، اس سونے کی، زندگی میں دولت کو پانے کے ''شارٹ کٹ'' کی حقیقت مجھ پر کھلی تو میں بہت رویا۔ اتنا رویا۔ اتنا رویا کہ شاید آج تک کوئی عورت بھی نہ روئی ہو گی۔ ایک تو آنسو وہ تھے جو میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور دوسرا آنسوؤں کا چشمہ جو میرے دل سے پھوٹ رہا تھا، اور میرا دل ان آنسوؤں کے ساتھ سیال بن کر بہا جا رہا تھا اور مجھے حیرت ہے۔ اتنی عظیم کیفیت ایسے منکشف لمحات سے گزر کر میں زندہ کیسے بچ آیا۔ شاید اس ضروری مقصد کے لیے جسے آج سے دو دن پہلے کوئی مجھ سے کہتا تو

میں جی بھر اس کی ہنسی اڑاتا۔

وہ مقصد تھا تم سے معافی مانگنا۔ آج سے پہلے اپنے دوسرے خیالات کی طرح یہ خیال بھی کسی پتھر کی طرح میرے دل و دماغ میں نصب تھا کہ مرد معافی نہیں مانگا کرتے۔

مگر آج میں تم سے معافی مانگتا ہوں تمہارے حقوق جو مجھ پر تھے۔ ان کو پامال کرنے کے جرم میں۔ تمہاری حرمت، تمہاری عزت کو نفرت اور تضحیک کی ٹھوکروں پر رکھنے اور تمہیں اس جرم پر مطعون کرنے پر جو تم سے سرزد ہوا ہی نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی تھی یا نہیں مگر تم جیسی قیمتی دولت میرے نصیب میں لکھ دی گئی اور میں بے خبر رہا۔ کیا میری اس بے خبری، اس نادانی کو معاف نہ کروگی۔"

وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔ وہ ملگجی روشنی میں شہریار کے چہرے سے پھوٹتی سچ کی کرنوں کو باآسانی دیکھ سکتی تھی۔

اس نے آہستگی سے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ دیا شہریار نے بے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں ...... میں بھی تو خام تھی۔ بے کار، ناکام، بے مقصد زندگی کے ساتھ کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتی جس کی زندگی میں کوئی نیوکلیس نہیں تھا نہ کوئی مقصد، تمہاری بے اعتنائی بے وفائی نے میری زندگی کو بامقصد بنا دیا مجھے خام لوہے سے مشکلات کی بھٹی میں جھونک کر کندن بنا دیا شکر گزار تو مجھے تمہارا ہونا چاہیے کہ تمہاری ذرا سی کج ادائی نے مجھے کتنا خاص کتنا انمول بنا دیا کہ شاید میں پہلی سی آسائشوں بھری مخملی زندگی میں رہتی تو ریشم کے کپڑے کی طرح نازک ہی رہتی ان مشکلات اور اس ماحول اور یہاں کی طرز زندگی نے مجھ پر زندگی کی حقیقت کھول دی کیا مجھے تمہارا شکر گزار نہیں ہونا چاہیے جو تم مجھے یہاں چھوڑ گئے اور میں ایک عام سی بے لاپرواہ بے کار و بے خبر ایمن سے ایک باشعور باخبر ایمن میں بدل گئی۔"

وہ بے خودی کے عالم میں آنکھیں بند کیے اس کے ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے مطمئن انداز میں کہہ رہی تھی۔

"اور وہ شام جب تم نے مجھے شاید پکارا تھا اور میری آنکھوں پر غرض کی لالچ کی پٹی بندھی تھی اور کانوں میں حرص کا سیسہ تھا کچھ سن ......" ایمن نے بے اختیار اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اس شام کا ذکر مت کرو وہ شام وہ سیاہ رات تو میری زندگی کی ایسی قیمتی رات ہے کہ میری پوری زندگی ایک طرف اور وہ کالی رات ایک طرف جس کے دامن میں چمکتے خزانے چھپے تھے

جو میں نے اس سیاہ رات میں ٹوٹ لیے اگر اس شام تم میری پکار پر پلٹ آتے تو تم نہیں جانتے۔ مجھ سے بڑا محروم اس عالم میں اور کوئی نہیں ہوتا جو دولت اس رات میرے کنگال دل کو ملی اس کا اندازہ نہ میں کر سکتی ہوں نہ تم۔" وہ ایک وجد کے عالم میں اس رات کی سرشاری میں کہہ رہی تھی۔

"اس رات میں نے اپنی زندگی کا سب سے مضبوط سہارا پالیا۔"

"تم نے بن کہے ان کو اپنا بنایا تو کیا تمہیں انمول خزانے نہ ملتے کہ اللہ تک جانے والا راستہ اللہ کے بندوں سے ہو کر جاتا ہے میں خود پر اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے کہ مجھے میرے اللہ نے میرے گناہوں کے باوجود تمہیں بخش دیا آئی لو یو ایمن آئی لو یو۔" اور میں تم سے کیسے کہوں اور کیونکر بتاؤں کہ ایسی ہی ایک رات میری زندگی میں بھی آئی اور مجھے ...... مجھ سے میری ذات سے ملوا گئی شاید میں تمہیں کبھی نہ بتا سکوں۔"

وہ اس کے خوشبودار بالوں پر سر رکھے نم آنکھوں کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

"مجھے دو سال کی ٹریننگ پر ماسکو بھیجا جا رہا ہے۔ چلو گی میرے ساتھ وہ تھوڑی دیر بعد اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے اپنائیت سے بولا۔

"شاید پہلے پوچھتے تو ہاں کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگاتی مگر اب ...... زاہدہ باجی، سلو، جگنو ان کو کیسے اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔"

"تم پھر بھول رہی ہو ایما! میں وہ پہلے والا خود غرض بے حس شہریار نہیں۔ مجھے میرے فرائض یاد کرا کے مزید شرمندہ نہیں کرو۔"

"ماما پاپا والا گھر مجھے مل گیا ہے۔ ہم سب دو چار دنوں میں ادھر شفٹ ہو جائیں گے تو پھر میں تمہارے ساتھ جانے کے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔" وہ اسے سرپرائز دینے والے انداز میں بولی۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

"وہ گھر تمہارا ہے تمہاری چیز ...... اس پر نہ میرا میرے بہن بھانجوں کا کوئی حق ہے ان شاء اللہ میں خود ان کا بندوبست کر کے جاؤں گا۔"

وہ مسکرا کر بولا تو ایمن بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی وہ واقعی بدل چکا تھا۔

"کیا میری اور تمہاری چیزوں کی ملکیت میں فرق ہے اور تم یہ بھی بھول رہے ہو۔ تمہاری بہن اور بھانجے، بھانجیاں تم سے زیادہ مجھ پر ٹرسٹ کرتی ہیں۔" وہ شریر لہجے میں بولیں۔

"یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے اس کا علم مجھے تم سے زیادہ ہے کہ تم جتنا ان کے قریب ہو۔ اتنا شاید میں برسوں ساتھ رہ کر بھی نہ ہو سکوں۔"

''تو پھر سب کے اس گھر میں جانے میں کیا اعتراض......''

''اس پر اور دوسرے حساب کتاب پر ہم بعد میں کسی اور وقت بات نہیں کر سکتے یا تم پہلے کی طرح آج بھی مجھے غچہ دینے کے چکر میں ہو۔''

اس نے یکدم اس کی کلائی پکڑی تو ایمن کی بے اختیار ہنسی نکل گئی اور وہ سر ہلاتی ہوئی اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنی لگی اور اس کوشش میں اور بھی اس کے نزدیک ہوتی چلی گئی۔

اور اس کے خیال میں اب اس طرح نزدیک، ہونے میں کچھ حرج بھی نہیں تھا۔

